

سچی اور آپ بیتی تحریروں کا انتخاب

# خون کا کہانیاں

کراچی

ماہنامہ

May 2018



پراسرار دہشت سے بھرپور کہانیوں کا انتخاب

# خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 5 مئی 2018ء

بچنگ ایڈیٹر خالد علی

ایڈیٹر محمد ذیشان

نگران شاہد علی

قیمت - 70/- روپے

سالانہ قیمت - 1500/- روپے

ای میل ایڈریس: Khofnakkahaniya@gmail.com

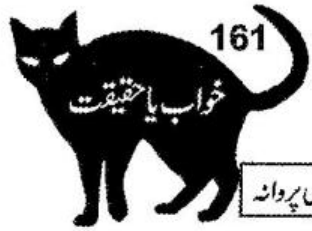
خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ خوفناک کہانیاں  
پرائی آریڈ میڈیا ٹائن فلور  
رقن تلاء نمبر 3، کراچی

32744

ادارہ کا ہیڈ کوارٹر کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں کہ کہانیاں میں چھپنے والی تمام کہانیاں کرمی ہوں یہ کہیں ذات یا شخصیت سے مماثلت لفظیہ ہو سکتی ہے

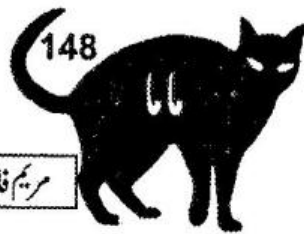




161

خواب یا حقیقت

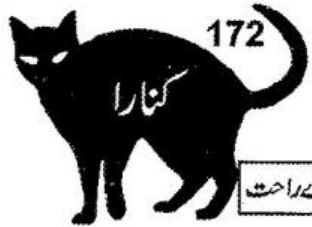
قصر جمیل پروانہ



148

ماما

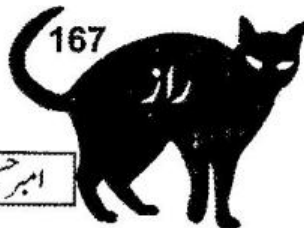
مریم فاطمہ



172

کنارا

ایم۔ اے۔ راحت



167

راز

امیر حسین



208

رنگ دھنک

ادارہ



193

ادا کار

ساحرہ بیگ



229

نیم پاگل

رانی خان



212

کالا علم

طوبی عدنان



احسان بکر



238



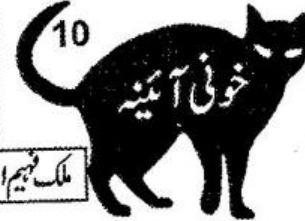
خط و کتابت کا پتہ: ڈابہ مارہ خٹناک کہانیاں اور دلی آکریمہ رٹائن فلور مشن جلاؤ بنگلہ کراچی: 32744391



43

حسد

ایس۔ حبیب خان



10

خونی آئینہ

ملک فہیم ارشاد



54

پراسرار ہمزاد

ایم۔ الیاس



49

بھیانک انجام

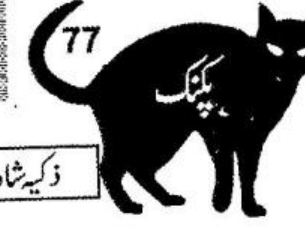
آصفہ پروین



84

اپرادی

سکندر حبیب بکمر



77

پلنگ

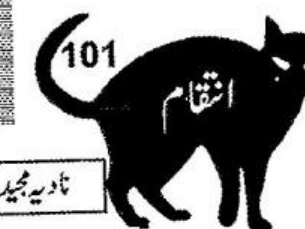
ذکیہ شاہ



110

جل پری

ساحل دعا بخاری



101

انتقام

نادیہ مجید



روشن آراء



141

چپاس ہزاروں



آصف حسن نے خالد پرنٹرز اردو بازار کراچی سے چھپوا کر شائع کیا



قارئین کرام السلام علیکم!

مئی 2018ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے، ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہر شمارے میں قارئین کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے، اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ہر رسالے کی کامیابی کی پیمائش اس رسالے کے قارئین کا ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اس میں کیا شائع ہونا چاہیے یا اس میں کیا تبدیلیاں لانی چاہئے اسی لئے آپ سب اپنی رائے کا مکمل کراٹھا کر کریں، تاکہ ہم اس کو مزید بہتر سے بہتر بنا کر آپ لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔

ایڈیٹر  
محمد ذیشان

**ثناء احمد**، حیدرآباد سے، السلام علیکم! قوی امید ہے کہ خوفناک کا سارا اسٹاف بہ خیر وعافیت ہوگا۔ میری کہنی کوشش شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، اسی طرح حوصلہ افزائی کرتے رہیں انشاء اللہ آگے بھی مایوس نہیں کروں گی۔ خوفناک نے بہت جلد قارئین میں اپنا مقام بنالیا ہے جس کی سبب سے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی منازل طے کر رہا ہے انشاء اللہ پوری امید ہے کہ خوفناک پاکستان میں ٹاپ نمبر پر آ جائے گا۔ اس میں لکھنے والے رائٹرز اور پڑھنے والے قارئین بہت دلجمعی سے اپنے اپنے شعبے کو سرانجام دے رہے ہیں۔ ماہ اپریل میں ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی اب اگر سب تحریریں کی تعریف کرنے کی بجائے تو بہت وقت ضائع ہو جائے گا اور مجھے امید ہے کہ آپ اسے پورا بھی شائع نہیں کریں گے۔ اس لئے مختصر اتنا دیتی ہوں، سوسال، چھلاوا، کال گرل، دوپٹہ قلم عروسی ٹاپ پر رہیں۔ سزا، سونامی پراسرار ہستی، دوسرے نمبر پر، باقی قسط وار کہانیاں اچھی جارہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ خوفناک کو دن و رات چوٹی کی ترقی عطا کرے۔ آمین

ثناء صاحبہ: پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اپنی نئی کاوشیں جلد سے جلد ارسال کریں۔ تاکہ ان کو خوفناک میں شائع کر کے آپ کو شکریہ کا موقع دیا جائے۔ اور آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا نہ بھولے گا۔ شکریہ

**منزہ محسن**، کراچی سے، میں بہت سے رسالوں میں کٹھی چلی آ رہی ہوں۔ مگر خوفناک میں ابھی 2، 4 ماہ ہی ہوئے ہیں مگر میرے خوفناک کے ادارے والوں نے جس طرح میں حوصلہ افزائی کی ہے اس طرح کسی بھی ادارے نے نہیں کی۔ میری کہانی ”برقانی طوفان“ شائع کرنے کا بے حد شکریہ، انشاء اللہ بہت جلد اپنی نئی کاوش ارسال کر رہی ہوں۔ اپریل کے شمارے میں جس کہانی نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہے کال گرل ”گلاب خان سولنگی“ صاحب کی سر! آپ بہت اچھا لکھتے ہیں اور میں آپ کی ہر تحریر بہت وثوق کے ساتھ پڑھتی ہوں پلیز ایسے ہی لکھتے رہئے گا۔ قسط وار کہانیاں بہت زبردست جارہی ہیں۔ خصوصاً جل پری اور ایم اے راحت کی نئے شروع ہونے والی قسط ”کمنارہ“ بہت اچھی جارہی ہے امید ہے آگے بھی یونہی بہترین تحریریں پڑھنے کو ملتی رہیں گی۔

منزہ صاحبہ: پرچے پر تعریف و تحقید کے لئے شکریہ، آپ کی رائے ہم نے نوٹ کر لی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے۔ جب تک آپ دیگر نوآوازشات ارسال کریں تاکہ آپ کا نام ماہنامہ خوفناک کہانیاں میں ہر ماہ شائع ہوتے رہے۔ شکریہ

**سنبل ماہین**، راولپنڈی سے، اپریل 2018ء کا پرچہ ہاتھوں میں ہے، زبردست سرورق کے ساتھ ایک با پھر خوفناک بازی لے گیا۔ سب سے پہلے آپ کے مسائل کا مکمل پڑھا بہت سے سوالات تھے جن کے بارے

میں جواب مل گیا۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے پلیز! اس کو بند نہ کیجئے گا۔ اس کے علاوہ رنگ دھنک میں میر غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلی کہانی سوسال، چڑھی بہت ہی اچھی تھی اس کے بعد چھلاوا بھی بہترین رہی، قلم عروسی (عامر ملک) صاحب نے تو بہت ہی زبردست تحریر لکھ ڈالی یقین جانتے جیسے جیسے کہانی پڑھتی جا رہی تھی ویسے ویسے اس منظر میں کھوتی جا رہی تھی۔ Great عامر صاحب اس طرح کی شاہکار کہانی پیش کرنے پر ہم آپ کے بہت شکر گزار ہیں۔ تقریباً سب ہی تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اب اگر کسی ایک کہانی کی تعریف نہ کی جائے تو زیادتی ہوگی قسط وار کہانیوں میں پراسرار ہمنوا (ایم ایلاس) صاحب ایک پھر نظر آئے۔ Well Come back sir امید ہے اب آپ کی طبیعت بہتر ہوگی۔ ایک اور غزل بھیج رہی ہوں امید ہے جلد شائع کر دیں گے۔

سنبل صاحبہ: آپ کا خط بہت زیادہ صفحات پر مشتمل تھا اس لئے کانٹ چھانٹ کر کے شائع کیا گیا ہے۔ آپ کی تحریریں موصول ہوئی ہے انشاء اللہ بہت جلد جلوہ گر ہوگیں۔

**صدام حسین**، روڈ جھل سے، السلام علیکم! میری دعا ہے کہ اللہ سب قارئین اور رائٹرز کو سدا خوش اور سلامت رکھے۔ خوفناک کی محفل میں میرا یہ پہلا خط ہے۔ امید ہے جگہ دے کر خوش آمدید کہیں گے اور حوصلہ افزائی کریں گے میں نے پہلی بار خوفناک پڑھا پہلی بار ہی اچھا لگا اور پہلی بار ہی خط لکھ رہا ہوں۔ میرے دوست خضر حیات نے مجھے متعارف کرایا ہے۔ یہ بہت اچھا ڈائجسٹ ہے۔ اب میں ہر ماہ خوفناک ڈائجسٹ پڑھوں گا۔

صدام صاحب: خوفناک میں موسٹ ویلکم، چلے جی حوصلہ افزائی ہوگئی، اور اب امید ہے کہ آپ ہر ماہ نوآوازش نامہ ضرور بھیجتے رہیں گے۔ thanks۔

**گلاب خان سولنگی**، راولپنڈی سے، السلام علیکم! ایک رائٹر کی خواہش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ قارئین اس کی تحریریں پڑھیں۔ ہر ایک رائٹر کو قارئین کی مثبت رائے کے ساتھ تنقید برائے اصلاح کے لئے بھی ہر وقت تیار رہنا چاہئے اور اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ شکوہ شکایت نہیں کروں گا۔ ماہنامہ خوفناک کے لئے ایک نئے موضوع پر کہانی حاضر خدمت ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو یہ موضوع پسند آئے گا۔

گلاب صاحب: معذرت کہ کہانی شامل اشاعت نہ ہو سکی، کہانی کچھ بڑھ چکی ہے، اگلے شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔  
**محمد آصف شہزاد اب آبادی**، قصور سے، امید واثق ہے کہ خوفناک کی پوری ٹیم بخیریت ہوگی، خوفناک کا شمارہ 21 تاریخ کو پوری آب و تاب سے ملا، کہانیوں میں سوسال، ڈر کیولا کی طاقت، چھلاوا، کال گرل، خوفناک ساہ، سزا، شیطان کی عمل پراسرار ہستی، برقانی طوفان، اور شاعری میں محمد اسحاق انجم، عبدالعلیم، محسن عزیز، عبدالکریم عزیز، مہم بلوچ، صدام حسین، پروفیسر ڈاکٹر واجد گیلانی، پربدی قمر علی، ذیشان گلگی، شرف الدین جیلانی، شائستہ سحر، ربان حسین، قمر وغیرہ کے اشعار اچھے لگے۔ ایک عدد غزل اور قوس قزح کے لئے اشعار خدمت عالیہ میں پیش ہیں۔ شائع کر کے بندہ کو بخور فرمائیں۔ شکریہ۔

آصف صاحب: خوش ہو جائیں، شاعر غزل شائع ہوگئی، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوآوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔ شکریہ۔

**ایس امتیاز احمد**، کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج کرای بخیر ہوگا ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دفتر بہ ناضل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ آرٹیکل لگانے کا شکریہ۔ میگزین آپ کے پاس ہیں پلیز دیکھئے گا۔ مزید میگزین ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور خوفناک ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دوپور کو دعا سلام۔

امتیاز صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور کبھی صحت عطا کرے۔ امید ہے آئندہ ماہ مفصل تجزیہ ارسال کریں گے۔



# آپ کے مسائل اور ان کا حل

مفتی محمد حسام اللہ شریفی

## انا کا مسئلہ

سوال: میں نے اور میرے ایک دوست نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ مریض میں کی بات پر ہمارا جھگڑا ہو گیا اور بولنا بھی چھوڑ دیا۔ جب کہ غلطی سراسر اسی کی تھی صلح کے لئے کون جھکے۔ یہ بات دونوں کے لئے مشکل ہے۔ اب کیا صورت ہو سکتی ہے؟

جواب: عمران صاحب، دو بھائیوں کے درمیان بھی تو کبھی کبھی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ غلطی اگر فریق مخالف کی بھی ہو تب بھی بڑائی اسی میں ہے کہ آدمی جھک جائے اور دوسرے سے صلح کر لے۔ اس میں انا اور غیرت کا کوئی مسئلہ نہیں۔ پھل دار درخت کی شاخیں جھکی رہتی ہیں اور بے ثمر درخت کی شاخیں بلند رہتی ہیں۔ اس کے ذریعے قدرت نے یہ سبق دیا ہے کہ ایسا شخص جو کچھ علم رکھتا ہے۔ اسے اپنے اندر جبر و انکساری پیدا کرنی چاہئے اور آپ تو ایک استاد ہیں، جس کا کام ہی تعلیم و تربیت دینا ہے۔ اس لئے آپ کو پہل کر کے اس پر سبقت لے جانی چاہئے۔

## انگلیاں چٹھنا

سوال: کسی مجلس میں انگلیاں چٹھنا کیا ہے؟  
جواب: عامر صاحب، کسی بھی مجلس میں انگلیاں چٹھانے سے بچنا چاہئے۔

## زیادہ وقت کام میں گزارنا

سوال: میں اپنے دن کا بڑا حصہ اپنی ملازمت میں گزارتا ہوں اور باقی حصہ نماز اور گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ بسر کرتا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ میں مذہب کو زیادہ سے زیادہ وقت دوں۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی ساری تنگ دود دینا اور صرف دنیا کے لئے کر رہا ہوں۔ آپ ہی اس مسئلے میں میری رہنمائی کیجئے؟

جواب: صہیب صاحب، اسلام ایک ایسا دین جس نے انسان کی تمام تر مساعی عبادت کو قرار دیا ہے بشرطیکہ وہ احکام خداوندی کی روشنی میں کی جائیں۔ ایک شخص صبح سے رات گئے تک اکل حلال کے حصول کے لئے مزدوری، ملازمت، کاروبار کا شکار یا اور کوئی فی کام کرتا ہے اور اس کام کے دوران امانت، دیانت، سچائی، عدل و انصاف، خوف خدا، خوف آخرت، پابندی وقت اور مقررہ اوقات میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضری کا اہتمام کرتا ہے تو یہ سب دینداری ہی کے کام کہلاتے گئے۔ یہ بات رکھنی چاہئے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کو مکمل طور پر دین کے تقاضوں اور مطالبات کے تابع بنا کر رکھا جائے تو اس کا ہر کام عبادت بن جائے گا۔ اس کا سونا، چاندی، کاروبار اور ملازمت کرنا، بچوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہنا، شادی بیاہ کرنا، لوگوں سے تعلقات رکھنا، غرض انسانی زندگی کے تمام کاموں کو انجام دینا سراسر عبادت ہے۔ بس یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں کیا جائے۔

## سب سے بڑا گناہ کیا ہے

سوال: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟

جواب: سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔  
سوال: لوگوں کے متعلق طرح طرح کے گمان رکھنا اور دوسرے کے متعلق سوئے ظن سے کام لینا اسلامی تعلیمات کی روش سے کیا ہے؟  
جواب: اسلامی تعلیمات کی رو سے دوسرے لوگوں کے متعلق طرح طرح کے گمان رکھنا اور سوئے ظن سے کام لینے سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے اور اسے گناہ کا کام بتایا گیا ہے۔

## سیر و تفریح اسلامی تعلیمات کی رو سے

سوال: میں گھونٹے پھرنے کا بہت شوقین ہوں، سیر و تفریح کے لئے کہیں آتا جاں اسلامی تعلیمات کی رو سے کیا ہے؟

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم زمین میں چلا پھرا کرو اور سیر و تفریح کے لئے کہیں جانے کو منع نہیں کیا بلکہ آدمی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کرنے کے لئے جائے تو یہ بھی اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔

## عورت کی ذمہ داری

سوال: اسلام نے عورت کی کیا ذمہ داری بتائی ہے؟

جواب: اسلامی تعلیمات کی روش سے گھریلو زندگی، اولاد کی تربیت اور بطور ماں بچوں میں اعلیٰ انسانی اور اسلامی قدروں کی اہمیت اور نشو و نما ہی عورت کی اصل ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے اسلام نے ضروری قرار دیا ہے کہ مسلمان عورت مذہبی اور دینی تعلیم حاصل کرے اور قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھے۔ اور دنیاوی تعلیم سے بھی اپنے آپ کو آراستہ کرے۔ بچوں اور بچیوں کی صحیح تربیت کے

لئے اسلام نے والدین کے کردار کو بہت اہمیت دی ہے اور ان کے لئے مذہب سے وابستگی تعلیم کی فراوانی گندے ماحول اور لڑ بچے سے دور رہنے کو ضروری قرار دیا ہے۔

## اوراق جلانا، جائز ہے؟

سوال: ہم لوگ یہاں جاپان میں کرتے ہیں۔ رہائش کے لئے بہت مختصر سی جگہ ہے اور کفایت اور بچت کی وجہ سے ایک چوٹے سے کمرے میں مختلف مزاج اور طبیعت کے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں نہ تو کنوئیں ہیں نہ سمندر قریب ہے۔ زیادہ تر علاقے پختہ ہیں۔ گڑھا کھودنا بھی ممکن نہیں۔ ایسی صورت میں قابل احترام کتب اور رسائل اور صفحات کا کیا کیا جائے؟ کیا ایسی صورت میں بے ادبی سے بچنے کے لئے ان اوراق کو جلایا جاسکتا ہے؟  
جواب: آخری قدم کے طور پر ایسے اوراق کو جلایا جاسکتا ہے لیکن یہ صرف اس وقت کیا جائے جب اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہ ہو نہ گڑھا کھود کر ان کو دفن کیا جاسکتا ہو نہ سمندر اور دریا میں ڈالنا ممکن ہو۔

## کلمہ پڑھے بغیر کپڑے کی پاک

سوال: کلمہ پڑھے بغیر کپڑے پاک کئے جائیں تو وہ پاک ہو جاتے ہیں یا نہیں؟  
جواب: کپڑوں کو پاک کرنے کے لئے پہلے خود پاک ہونا ضروری ہے یا صرف ہاتھ دھو کر کپڑے پاک کئے جاسکتے ہیں۔

## محنت میں عظمت

سوال: اسلام میں کیا محنت کا کوئی کام ایسا بھی ہے جو پسندیدہ نہیں ہے؟  
جواب: محنت کے جائز کاموں کو اسلام نے قدر کی نگاہ سے دیکھنے کی تعلیم دی ہے اور محنت کی عظمت کو اجاگر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ محنت بخش اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔



# خونی آئینہ

ملک نیمہ ارشد۔ فیصل آباد

تم جانتی تو اپنا انتقام لے کر واپس جاسکتی تھی۔ پر نہیں تم نے کئی بے گناہ خاندانوں کی ہتھیاری کی اور خود بھی اپرا دی بن گئی۔

اس عورت کی حالت کافی خستہ حال اور خوفناک تھی۔ بال بکھرے ہوئے، چہرہ اور کپڑے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ ہاتھوں کی انگلیوں کے ناخن ٹوٹے ہوئے جن سے خون بہہ رہا تھا۔ کپڑے بھی کئی جگہوں سے پھٹے ہوئے، آنکھوں میں اترا ہوا سرخ خون اور ان آنکھوں میں دیکھتے انگارے۔ اس عورت کے ایک ہاتھ میں تیز دھار کلباڑی تھی۔ وہ عورت انہی انگارہ انگلی آنکھوں سے سامنے کی دیوار پر لگے بڑے سے قد آور آئینے کو گھور رہی تھی وہ آئینہ بہت خوب صورت تھا اور خوب صورت لکڑی جو اس کے ارد گرد لگی ہوئی تھی اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میں تمہیں توڑ دوں گی۔“ وہ عورت کلباڑی کے دستے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے نفرت سے دیوار پر لگے اس آئینے کو گھورتے ہوئے بولی۔

”تت۔۔۔۔۔ تت تم نے میرا سب کچھ برباد کر دیا۔ مم۔۔۔۔۔ میری دنیا اجاڑ دی۔۔۔۔۔ میرا پر یار۔۔۔۔۔“

وہ عورت چیختے ہوئے رونے لگی۔ ”میں اب کیا کروں گی! میرا تو اب کوئی بچا ہی نہیں۔“ وہ عورت مسلسل آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے چیختی۔

”مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ میرا بچا۔۔۔۔۔ میرے بچے۔۔۔۔۔ سب کو ختم کر دیا وہ بھی کس سے۔۔۔۔۔ مجھ سے۔۔۔۔۔ تم

نے میرے ہاتھوں سے ہی میرے سارے پر یار کو ختم کر دیا۔“ وہ عورت اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

”پپ۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ برتنو میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔۔ ختم کر دوں گی۔۔۔۔۔ تمہارے گلے گلے کر دوں گی۔“ روتے ہوئے وہ عورت ایک مرتبہ پھر چیختی وہ کلباڑی ہاتھ میں تھا اس آئینے کی طرف بڑھی۔ ”میں تیرا سونا کر دوں گی۔“

اس عورت نے کلباڑی اب دونوں ہاتھوں سے پکڑ لی تھی اس نے کلباڑی ہوا میں اٹھائی اور چیختے ہوئے اس خوب صورت آئینے کی طرف بھاگی کہ اچانک دیوار کے ساتھ ٹیل پر رکھا سفید گلدان اچھلا اور بھاگتی ہوئی

اس عورت کے سر پر جا لگا اس مرتبہ اس عورت کے منہ سے جو چیخ نکلی تھی وہ اس شخص کے گلدان کے سر پر لگنے کے باعث لگی تھی۔ وہ عورت فرش پر جا گری اور کلباڑی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر تھوڑا دور جا گری وہ عورت کراہتے ہوئے اٹھ کر بیٹھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے سر میں کٹنے والی جگہ کو ٹٹولا تو ایک مرتبہ پھر اس کے منہ سے چیخ نکلی گئی اس عورت کا سر پھٹ چکا تھا۔ اس عورت نے ایک مرتبہ پھر نفرت انگیز نگاہوں سے اس آئینے کی طرف دیکھا۔

تت۔۔۔۔۔ تم آج کچھ بھی کر لو۔۔۔۔۔ آج تمہارا انت میرے ہاتھوں سے لکھا ہوا ہے۔ وہ عورت جبرے پھینچنے



ہوئے اس آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ خون  
اب سر سے نکل کر اس عورت کے چہرے پر لکیروں کی  
شکل میں بہنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ خون نکلنے  
کے باعث اس عورت کی آنکھوں کے سامنے بار بار  
اندھیرے کی جھلکیاں سی آرہی تھیں۔ اس عورت نے  
آگے بڑھ کر کلبھائی اٹھائی اور دوبارہ اس آئینے کی  
طرف بڑھی۔ آئینے کے قریب پہنچنے پر اس عورت نے  
کلبھائی ہوا میں بلند کی اور اس کا زوردار وار آئینے کے  
کاغج پر کیا۔

دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔ جس طرح اس عورت  
نے آئینے پر وار کیا تھا اگر وہی وار وہ عورت کی انسان پر  
کرتی تو اس انسان کے جسم کے دو ٹکڑے ہو جاتے لیکن  
کلبھائی جیسے ہی اس آئینے کے کاغج سے ٹکرائی تو  
کلبھائی کا دستہ درمیان سے ٹوٹا اور کلبھائی آدھے  
دستے سمیت فرش پر جا گری۔ اور اس عورت کے ہاتھ  
میں اس کلبھائی کا آدھا ٹوٹا ہوا لکڑی کا دستہ رہ گیا۔  
عورت حیرانگی سے ہاتھ میں پکڑے لکڑی کے  
ٹوٹے ہوئے دستے کو دیکھنے لگی اور پھر اس نے آئینے کی  
طرف دیکھا۔ آئینے کا کاغج بالکل صحت سلامت تھا اور اتنا  
زوردار وار پڑنے پر بھی اس پر ایک بھی خراش نہیں آئی  
تھی۔

اچانک وہاں ایک خوفناک چھوٹا بچہ جنم لیا  
جس نے عورت کو سینے کا موقع نہ دیا۔ اس آئینے میں  
سے آگ سے جھلسا ہوا ایک ہاتھ نکلا جس نے عورت کو  
گردن سے دیوچ لیا۔ عورت ایسے حالات کے لئے  
بالکل بھی تیار نہ تھی اس آگ میں جھلسے ہاتھ نے عورت  
کو تیزی سے آئینے کے اندر کھینچ لیا، عورت کے اندر  
کھینچنے کے باوجود وہ آئینہ نہ ٹوٹا۔ آئینے میں اب صرف  
کمرے کا منظر نظر آرہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”گھر تو بہت اچھا ہے۔ منوج جی۔“ سنیل نے  
تعریفی انداز میں کہا۔ ”جی بالکل سنیل جی۔ جیسا گھر  
آپ چاہتے تھے بالکل دیا ہی ہے۔“ منوج ثابت

میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہوا کہ اس گھر میں فرنیچر بھی  
موجود ہے۔“ اس مرتبہ سنیل کی بیوی سشما بولی۔

”جی ہاں..... سشما جی..... ہم اپنے کمرے کا  
خاص خیال رکھتے ہیں اکثر فیملیز ہر چیز انورڈ نہیں  
کر سکتیں۔ اس کا راز ہم اپنے آئیٹم کے مکانوں میں  
اور نہ ہی پرنٹو فرنیچر کا پرنٹو دیکھتے ہیں۔“ منوج نے  
مسکراتے ہوئے سشما کو بتایا۔

”بہت اچھی بات ہے منوج جی۔“ سشما نے  
بظاہر منوج کی کارکردگی کو سراہا۔

”سنیل جی آپ کی بیٹی میں سشما اور راہول  
کے علاوہ کون کون ہیں۔“ منوج نے سنیل سے مخاطب  
ہوتے ہوئے پوچھا۔

”جی بس بیٹی ہیں..... ماما چاہتے پرنٹو ان کا  
دیہانت ہوئے آج 6 برس ہو گئے ہیں اور بس ہمارے  
پر یوار میں ہم تین لوگ ہی ہیں۔“ سنیل نے بتایا۔  
”ہوں.....“ منوج نے ایک گہری سانس لی۔

آپ کا راہول کہاں چلا گیا؟  
”لگتا ہے وہ اپنا روم دیکھ رہا ہے۔“ سشما نے  
ہنستے ہوئے کہا تو سنیل اور منوج جی بے اختیار ہنس  
پڑے۔ ”ٹھیک ہے سنیل جی..... اب میں چلتا ہوں  
آپ میرے آفس میں آکر ایگریمنٹ پر سائن  
کردیتے گا۔“ منوج نے بظاہر اجازت چاہتے ہوئے  
کہا۔ ساتھ ہی اس نے سنیل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ٹھیک ہے منوج جی۔ آج تو نہیں پرنٹو کل میں  
کسی بھی سے آپ کے آفس میں چکر لگاؤں گا۔“ سنیل  
نے مسکراتے ہوئے منوج سے ہاتھ ملایا اور پھر منوج  
بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ”ہاں تو مائی ڈیئر  
سشما جی.....“ سنیل نے سشما کو اپنی ہانہوں کے  
گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔ ”کیسا گھر؟“

”ارے..... ارے..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں  
سنیل۔“ سشما سنیل کی ہانہوں میں چپلے ہوئے بولی۔  
”راہول دیکھ لے گا۔“

”تم چننا مت کرو..... راہول گھر کے وزٹ میں  
مصروف ہے اسے ہماری پرداہ کہاں۔“ سنیل نے  
سشما کے گرد اپنی ہانہوں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے  
کہا۔

”ارے رکھئے تو سہی۔“ سشما نے اپنے ہونٹوں  
کی طرف بڑھتے ہوئے سنیل کو روکنے کی ناکام کوشش کی  
مگر وہ ناکام رہی اور سنیل اپنے مشن میں کامیاب رہا۔

راہول مختلف کمروں کو چیک کرتا ہوا ایک کمرے  
میں داخل ہوا، کمرے کی دیوار پر ایک بڑا سا قد آور  
لکڑی میں بڑا آئینہ لگا ہوا تھا جو بہت خوب صورت تھا  
اس پورے کمرے میں اور کوئی سامان نہیں تھا سوائے  
اس دیوار پر لگے بڑے سے آئینے کے..... باقی

کمروں میں ٹھوڑا بہت فرنیچر تھا۔ گھر اس کمرے میں  
سوائے اس آئینے کے کچھ نہ تھا۔ جسے راہول عجیب  
نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر وہ اس آئینے کے قریب آیا  
اور اس میں دیکھ کر عجیب عجیب شکلیں بنانے لگا۔  
اچانک اس نے آئینے میں دیکھا اس کے پیچھے لال

رنگ کی ساڑی پہنے ایک خوب صورت عورت کمرے کا  
دروازہ بند کر رہی تھی۔ راہول چونکا اور تیزی سے اپنی  
عقبی جانب گھوما تو وہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ پیچھے والی  
لال ساڑی والی عورت کہیں جی نہیں تھی اور کمرے کا  
دروازہ بھی چوٹ کھلا ہوا تھا۔ راہول دوبارہ آئینے کی  
طرف گھوما تو اس مرتبہ اس نے آئینے میں دیکھا سنیل

اور سشما کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ راہول پھر  
اپنی عقبی جانب گھوما کہ یہ بھی تو اس کی نظروں کا دھوکا تو  
نہیں مگر سشما اور راہول اسی کی طرف آرہے تھے۔  
”ارے واہ.....“ بے اختیار اس آئینے کو دیکھ کر سشما  
کے منہ سے نکلا۔  
”کتنا سندرا آئینہ ہے۔“

”واقعی..... بہت سندرا ہے۔“ سنیل نے سشما  
کی تائید میں سر ہلایا ساتھ ہی وہ آئینے کے ارد گرد لگی  
خوب صورت لکڑی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”یہ تو کافی مہنگا  
لگتا ہے۔“

”چلے ایک مسیحا تو حل ہوئی۔“ سشما نے خوش  
ہوتے ہوئے آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے چٹکی بجا لی۔  
”وہ کیا.....“ سنیل نے سوالیہ نگاہوں سے سشما  
کی طرف دیکھا۔

”ہمارے ڈریسنگ کا آئینہ ٹوٹ گیا تھا اب ہم  
اس کا ٹیبل یہاں لگا دیں گے۔“ سشما نے بتایا۔

”چلو یہ تو بھگوان کی بڑی کرپا ہوئی۔ کیونکہ آئینے  
کے بغیر تو تم بالکل ادھوری تھی۔“ سنیل نے ہنستے ہوئے  
کہا تو سشما سنیل کو مصنوعی غصے سے گھورنے لگی اور  
سنیل ایک قہقہہ مار کر ہنس لگا۔

”مما اس گھر میں کوئی سندرا لڑکی بھی ہے۔“  
راہول نے دونوں کی گفتگو میں خلل ڈالا۔

”انگلورس بیٹا۔ آپ کی ممما بھی سندرا ہیں۔“  
سشما نے شوخ لہجے میں کہتے ہوئے راہول کے گال  
تھپتھپھائے۔

”نو ممما..... میں آپ کی بات نہیں کر رہا۔“  
راہول نے منہ بناتے ہوئے کہا تو سنیل اور سشما بے  
اختیار مسکرا دیے۔

”تو پھر مائی سن؟“ اس مرتبہ سنیل نے پیار سے  
پوچھا۔

”پاپا میں اس سندرا آئی کی بات کر رہا ہوں جو  
ابھی ابھی کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھیں۔“ راہول  
نے دونوں کو بتایا۔

”پرنٹو بیٹا ہم بھی تو ابھی ابھی کمرے میں داخل  
ہوئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی سندرا آئی نظر نہیں آئی۔“  
سنیل نے راہول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پاپا میں نے اس آئینے میں دیکھا۔ وہ ایک  
سندرا آئی تھیں جنہوں نے لال رنگ کی ساڑی پہننے  
رکھی تھی اور اس کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھیں میں نے  
گھوم کر دیکھا تو وہ آئی کہیں بھی نہیں تھیں اور پھر آپ  
دونوں کمرے میں آ گئے۔ راہول نے ساری بات بتائی  
تو سنیل اور سشما حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے  
لگے۔



”نہیں بیٹا وہ آپ کا وہم ہوگا۔“ سنیل نے مکھنوں کے گل راہول کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہم۔۔۔ راہول نے کال پر انگلی رکھتے ہوئے لفظ ”وہم“ کو لمبا کیا۔۔۔ ہو بھی سکتا ہے۔ سنیل اور شمشا بے اختیار مسکرا دیئے۔

مکان وادھی بہت خوب صورت تھا گیٹ کے بعد احاطہ جس کے دونوں طرف ہری ہری گھاس کا قالین بچھا ہوا تھا اور احاطے کے وسط میں اندرونی حصے کی طرف جانے کے لئے اینٹوں کا راستہ بنا ہوا تھا اندر چھوٹا سا ہال جس میں آٹنے سانے چار کمرے جوائنٹ ہاتھ تھے ایک کمرے پر بڑا سا دیسی تالا لگا تھا ایک کچن اور اوپر جانے کے لئے میڑھیاں تھیں، گھر کے پچھواڑے میں بھی ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جو گھر کے چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور کسی ویران اور اجڑے باغ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ گھر کے پیچھے بنے احاطے میں کہیں کہیں خشک گھاس اور کہیں کہیں بوسیدہ مٹی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گھر کے اس حصے کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ حالانکہ گھر کے اگلی طرف بنے احاطے کی گھاس ہری بھری تھی اس خوب صورت آئینے والا کمرہ نیچے پورشن پر تھا جو سنیل اور شمشا کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ بگل والا کمرہ راہول کے حصے میں آیا تھا۔ اس کے سامنے والا کمرہ تالے والا تھا اس وقت شمشا تو گھر کی سجاوٹ میں مصروف تھی جبکہ سنیل آفس کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ راہول کا ایڈمشن کون سے اسکول میں کروانا ہے۔ شمشا نے دیوار کے ساتھ پڑے سنیل پر کپڑا پھیرتے ہوئے سنیل سے پوچھا۔

تم آج کسی سے دو تین اسکول کا وزٹ کر لینا۔ جو اسکول تمہیں اچھا لگے وہاں راہول کا ایڈمشن کروا دینا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے سنیل نے اپنے بوٹ کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

”آپ نہیں چلیں گے؟“ شمشا نے سوالیہ لگا ہوں سے سنیل کی طرف دیکھا۔

”نومائی ڈیڑا بھی نہیں۔ نیا نیا آفس ہے تمہی یہ

کام کرنا۔“ سنیل نے اپنی مجبوری بتاتے ہوئے سارا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈالا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔“ شمشا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ آج شام کو جلدی گھر آ جائیے گا۔ مل جل کر گھر کا سامان سیٹ کریں گے۔

اوکے۔۔۔ میں اب چلتا ہوں میں نے منوج سے بھی ملنا ہے اور آفس بھی جانا ہے۔ سنیل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ منوج کو ایک مرتبہ پھر دھنسنے والا کہنا۔

”گھر واقعی بہت اچھا ہے۔ شمشا نے کہا تو سنیل نے مسکراتے ہوئے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا وہ منوج کے دفتر پہنچا۔ پدھارے سنیل ہی پدھارے۔ منوج مسکراتے ہوئے اس کے استقبال کے لئے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

نستے منوج جی۔ جواب سنیل نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے۔ نستے جواب منوج نے بھی ہاتھ جوڑے اور اپنے سنیل کے سامنے بڑی کرسیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ بیٹھے۔

دھنسنے وا۔۔۔ سنیل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اب بتائیے ٹھنڈا اینٹیں گے یا گرم ہو جائے۔ منوج نے بھی اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”دھنسنے وا۔ منوج جی۔ میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔ جواب سنیل نے کہا۔

آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ آپ انگریمنٹ کے کاغذات نکالنے۔

جی اچھا۔۔۔ منوج نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی ٹیبل کی دروازے سے مکان کے انگریمنٹ کاغذ نکال کر سنیل کی طرف بڑھا دیئے۔ گھر بہت اچھا ہے۔ منوج جی۔ سنیل نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ پکڑتے ہوئے کہا۔

جی دھنسنے وا۔۔۔ ہم اپنے سٹورز کی رائے کا خیال کرتے ہیں۔ منوج بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ شمشا بھی گھر کی بہت تعریف کر رہی تھی۔ وہ ایسا ہی گھر چاہتی تھی۔ سنیل نے انگریمنٹ کے کاغذات پر نظریں جماتے ہوئے کہا پھر اس نے کاغذات سے نظریں ہٹائیں اور منوج کی طرف دیکھا۔ اچھا منوج جی ایک

بات تو بتائیں؟

جی پوچھیے۔ منوج نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس گھر کے ایک کمرے میں تالا لگا ہوا ہے۔ وہ کیوں۔ سنیل نے منوج سے پوچھا۔ اس کمرے میں بس ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا ہوا ہے۔ اگر آپ کہیں تو اس کمرے کے تالے کی چابی آپ کو دے دوں۔ منوج نے بتاتے ہوئے پوچھا۔

نہیں فی الحال تو اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو بس ویسے ہی پوچھا تھا۔ میں شمشا سے پوچھ لوں گا اگر اسے ضرورت محسوس ہوئی تو میں لے لوں گا۔ سنیل نے کہا تو منوج نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ سنیل نے انگریمنٹ کے کاغذات کو پڑھنے کے بعد ان پر سائین کئے اور پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ٹھیک ہے پھر منوج جی میں اب چلتا ہوں۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور سنیل منوج کے آفس سے باہر نکل آیا اس کی کار روک کے کنارے پر کھڑی تھی وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

اچانک سنیل کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے آرہا ہو وہ تیزی سے گھوما تو اس نے دیکھا ایک خوب صورت نوجوان اس کی طرف چلا آرہا تھا۔ جس نے آنکھوں پر بلیک رنگ کے گلاسز لگا رکھے تھے وہ خوب صورت لڑکا سنیل کے قریب آیا اور بڑا اس کی طرف توجہ کئے بغیر اس کے قریب سے نزر گیا۔ لگتا ہے میرا وہم تھا۔ سنیل نے خود سے ہنسنا شروع کرتے ہوئے

کہا۔ اچھا۔۔۔ شمشا نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے شمشا شام کو گھر پر بات ہوگی۔ اب میں آفس جا رہا ہوں۔ سنیل نے کہا تو شمشا نے جوابا اس کے کہا تو سنیل نے جواباً کہیں جیب میں ڈال لیا اور گاڑی اشارت کر کے گریز لگا کر آگے بڑھا دی۔

☆.....☆.....☆

سنیل شام کو گھر پہنچا تو اس نے دیکھا شمشا نے اپنا کام کافی حد تک مکمل کر لیا تھا اس نے گھر کی ہر چیز سلیقے سے سیٹ کر لی تھی۔ ارے واہ۔ تم نے تو بڑی تیزی دکھائی سنیل نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ہاں۔ سنیل کار کے فرنٹ ڈور سے ٹیک لگانے کے لئے گھوما تو سنیل نے دیکھا ڈور کے دوسری طرف وہی بلیک گلاسز والا لڑکا ایک نیلے رنگ کی کار کے پاس کھڑا کمرے سے سنیل کی تصویریں اتار رہا تھا۔ سنیل حیرانگی سے چونکا اور تشویش کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اچھا یاد سے جلدی گھر آ جانا۔ شمشا نے اس کی توجہ اپنی طرف بھیجی۔ آں۔۔۔ ٹھٹھ۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ سنیل ہلکا ہوا۔ شمشا۔۔۔ ”میں تم سے تھوڑی دیر میں بات کرتا ہوں۔“

سنیل نے شمشا کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ رابطہ منقطع کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے سے باز پرس کر سکے کہ وہ اس کی تصویریں کیوں اتار رہا ہے۔ لیکن وہ لڑکا اتنی دیر میں کار میں بیٹھ کر اسے اشارت کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔ سنیل وہاں کھڑا اس کی کار کو جاتے دیکھتا ہوا۔

بڑا عجیب آدمی تھا۔ سنیل بڑبڑایا۔ اور پھر اس نے چابی سے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اسی وقت موبائل کی رنگ ٹون ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھی۔ اس مرتبہ بھی شمشا ہی کی کال تھی۔ میری کال کیوں کاٹی آپ نے۔ شمشا برہمی سے بولی۔ وہ دراصل سنگٹل کھل چکا تھا۔ سنیل نے جان چھڑانے کی خاطر جھوٹ بولا۔ ”آج کسی اسکول کا وزٹ ضرور کر لینا۔“ اوکے۔

جی اچھا۔ شمشا نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے شمشا شام کو گھر پر بات ہوگی۔ اب میں آفس جا رہا ہوں۔ سنیل نے کہا تو شمشا نے جوابا اس کے کہا تو سنیل نے جواباً کہیں جیب میں ڈال لیا اور گاڑی اشارت کر کے گریز لگا کر آگے بڑھا دی۔

☆.....☆.....☆

سنیل شام کو گھر پہنچا تو اس نے دیکھا شمشا نے اپنا کام کافی حد تک مکمل کر لیا تھا اس نے گھر کی ہر چیز سلیقے سے سیٹ کر لی تھی۔ ارے واہ۔ تم نے تو بڑی تیزی دکھائی سنیل نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔



راہول بیڈ پر کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔  
جی ہاں ابھی تو ڈاڑھ بہت سامان رہتا ہے۔ جواب  
آپ کے کارن پورا ہوگا۔ سشما نے مسکراتے ہوئے  
کہا۔

ارے پاپا یہ کیا ہے۔ بیڈ پر بیٹھارہا ہول سشما  
ہاتھوں میں کافی سارے شاہرہ بیکس دیکھ کر چپکا۔ یہ بیٹا  
ہمارے لئے ڈرنے سوچا آج تمہاری مہم صرف ہوں  
گی تو ڈرنی ہی لے چلوں۔ سشما نے پہلے راہول اور  
پھر سشما کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔  
یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ سشما خوش ہوتے  
ہوئے مسکرائی۔ اچھا تم ایسا کرو یہ بھوجن کا سامان  
برتنوں میں ڈالو تب تک میں فریش ہوں۔ بھوجن کے  
بعد میں تمہاری ہیلپ کرتا ہوں۔ سشما نے ہاتھ میں  
پکڑے شاہرہ بیکس اس آئینے کے ساتھ رکھتے کھیل پر  
رکھتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے۔ جو اب سشما نے اثبات میں سر ہلایا۔  
سشما فریش ہوا تو انہوں نے کھانا کھایا۔ سشما اور سشما  
نے باقی کا بچا کھچا سامان سیٹ کیا۔ اس دوران راہول  
بیڈ پر بیٹھا کھلونوں کے ساتھ کھیل رہا۔ فارغ ہونے کے  
بعد سشما نے راہول کو اس کے کمرے میں سلا یا۔ سشما  
ناٹ سوٹ پہن کر بیڈ پر بیٹھ کر اپنے دفتری کاغذات  
دیکھنے لگا اور سشما بھی واش روم میں جا کر اپنا ناٹ  
سوٹ پہن آئی وہ اس آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے  
بالوں میں برش کرنے لگی۔ ”تو کیسا رہا آج آفس کا پہلا  
دن.....“ سشما نے اپنے خوب صورت بالوں میں  
برش کرتے آئینے میں سے سشما کی طرف دیکھتے ہوئے  
اس سے پوچھا۔

آں..... سشما نے کاغذات پر سے نظریں ہٹا کر  
آئینے میں نظر آنے والے سشما کے چہرے کی طرف  
دیکھا۔ بہت مصروف دن تھا بہت کام تھا اس کارن یہ  
کاغذات گھر لے کر آیا ہوں۔

میں کچھ ہیلپ کر سکتی ہوں۔ سشما نے گردن  
اس کی طرف گھمائی۔ میں کوئی بات نہیں۔ سارا کام تو

میں آفس میں نمٹا آیا تھا یہ تو میں دوبارہ چپک کر رہا  
ہوں۔ سشما نے کہا اور دوبارہ کاغذوں پر نظر جمادی اور  
پھر سر اٹھا کر پوچھا۔ تم اسکول بھی تھی؟

نہیں..... میں..... سے ہی نہیں ملا..... سشما  
شرمندگی سے کہی۔ کوئی بات نہیں کل چلی جانا۔ سشما  
نے کہا اور ساتھ ہی وہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں ذرا  
واش روم سے ہو کر آتا ہوں۔ وہ واش روم کا دروازہ  
کھول کر واش روم میں چلا گیا۔ آئینے کے سامنے بیٹھی  
اپنے بالوں میں برش کرتی سشما کے ہاتھوں سے برش  
پھسلتا اور فرش پر جا کر وہ برش اٹھانے کے لئے بھی اس  
لے برش اٹھایا اور سیدی ہوئی تو اس نے آئینے میں  
دیکھا۔ سشما اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ ارے اس نے  
دھڑکنے والے دل کے ساتھ اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور یوں  
اچانک اپنے پیچھے سشما کو کھڑا دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ آپ  
نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔

میرا ارادہ تھی ہی تھا۔ سشما نے کہا۔ آپ ابھی تو  
واش روم میں گئے تھے۔ پھر..... اتنی جلدی کیسے  
آگئے..... سشما نے سوالیہ نگاہوں سے آئینے میں سے  
سشما کی طرف دیکھا۔ چھوڑو ان باتوں کو..... وہ تھوڑا  
ساجھا اور اس نے سشما کی گردن پر سے ہاتھ بٹائے  
اور اس کی گردن پر اپنے گرم گرم ہونٹ رکھ دیئے۔ تو نے  
اختیار سشما کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سشما نے اپنے  
دونوں ہاتھ سشما کے کندھے پر رکھ لئے تھے۔ اسی  
وقت ٹوائلٹ فلش ٹینک کی آواز سشما کے کانوں میں  
پڑی اور اسے اپنے کندھوں پر یکدم سشما کے ہاتھوں کا  
احساس ختم ہو گیا۔ سشما نے آنکھیں کھولیں تو اس نے  
دیکھا سشما اس کے پیچھے کہیں بھی موجود نہیں تھا۔ وہ  
جیراگی سے اپنی عقبی جانب گھومی۔ یہ..... یہ سشما  
کہاں چلے گئے..... سشما تشویش کے عالم میں  
بڑبڑائی۔ اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا اور سشما واش  
روم سے باہر نکل آیا۔

ارے..... آپ واش روم میں دوبارہ چلے گئے  
تھے اور وہ بھی اتنی جلدی۔ سشما تذبذب کے عالم میں

بولی۔

دوبارہ..... سشما نے حیرت سے ہنسا۔ میں ایک دفعہ  
ہی واش روم میں گیا تھا اور ابھی نکلا ہوں۔

سشما نے آپ مذاق کر رہے ہیں۔ آپ ابھی تو  
میں میرے پیچھے کھڑے تھے۔ سشما نے عجیب  
نظروں سے سشما کی طرف دیکھا۔

سشما یہ تم کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہی ہو۔ میں تو  
ابھی واش روم سے باہر نکلا ہوں۔ اگر تمہاری کلینا ہے تو  
میں تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔ سشما نے آخری جملہ  
مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

پلیز سشما لی سیریس آپ ابھی تو میرے پیچھے  
کھڑے تھے۔ پرنو آپ اتنی جلدی دوبارہ واش روم  
میں کیسے چلے گئے۔ سشما کی باتوں سے اس مرتبہ بھی  
حیرت لگ رہی تھی۔

میں سیریس ہوں سشما۔ میں تمہارے سامنے  
ایک دفعہ ہی واش روم میں گیا تھا۔ بھلا مجھے کیا ضرورت  
پڑی ہے دو دو دو دو واش روم میں جانے کی اور وہ بھی اتنی  
جلدی۔ اس مرتبہ سشما حیراگی سے بولا۔

نہیں سشما آپ مذاق کر رہے ہیں۔ مہ..... مجھے  
حیرت اس بات کی ہے کہ آپ اتنی جلدی دوبارہ واش  
روم میں کیسے جاسکتے ہیں۔ سشما ابھن آ کر بیٹھے ہیں  
اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

سشما یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے میں تم سے ایسا مذاق  
کیوں کروں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں ابھی ابھی  
واش روم سے باہر نکلا ہوں اور میں ایک دفعہ ہی واش  
روم میں گیا تھا۔ اس دفعہ سشما کے لہجے میں ہلکا سا غصہ  
بھی شامل تھا۔

میں بھی سچ کہہ رہی ہوں سشما۔ میں اس آئینے  
کے سامنے بیٹھی بالوں میں برش کر رہی تھی میرے ہاتھ  
سے برش گر گیا اور میں برش اٹھانے کے لئے جھکی برش  
اٹھانے کے بعد میں سیدی ہوئی تو آپ میرے پیچھے  
کھڑے تھے اتنا اچانک اور ترنت میرے پیچھے آپ کو  
دیکھ کر میں ڈر گئی۔ میں نے آپ سے کہا بھی کہ آپ اتنی

جلدی واش روم سے باہر کیسے آگئے۔ پرنو آپ نے کہا  
چھوڑو ان باتوں کو اور پھر..... آگئے کی بات سشما کہہ  
نہ سکی۔ تاہم وہ سشما کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ  
لے رہی تھی۔

سشما تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ سشما نے  
آگے بڑھ کر سشما کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔  
مجھے کچھ نہیں ہوا۔ سشما نے سشما کا ہاتھ ہٹایا۔  
مجھے کچھ نہیں آ رہی۔

پریشانی کے باعث سشما نے دونوں ہاتھوں کی  
انگوٹھوں سے اپنی کپٹی کو مسلا۔ ”مجھے تو مجھے تمہاری بھی  
نہیں آ رہی۔ یہ تم کیسی عجیب اور بھکی بھکی باتیں کر رہی  
ہو۔ سشما نے سشما کے سامنے بیڈ پر بیٹھے ہوئے کہا۔  
”اس کا مطلب آپ کو میری باتوں پر دھواں نہیں۔  
سشما کے لہجے میں دکھ کا عنصر شامل تھا۔

”دھواں والی بات نہیں ہے سشما۔ تم بات ہی  
ایسی عجیب کر رہی ہو اب تم خود ہی بتاؤ۔ مجھے اس میں  
جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔

پرنو تم ہو کہ ایک ہی بات پر اڑی ہوئی ہو۔“  
سشما کا لہجہ شکایتی تھا۔

پتہ نہیں سشما۔ دھواں کریں میں بھی جھوٹ نہیں  
بول رہی۔ آپ ہی سوچئے مجھے بھی جھوٹ بولنے کی بھلا  
کیا ضرورت ہے۔ سشما نم زدہ آنکھوں سے بھرائی  
ہوئی آواز میں بولی۔ لوجی اب بھلا اس میں آسو  
کہانے کی کیا ضرورت ہے۔ سشما کے لہجے میں ایک  
مرتبہ پھر غصے اور بے زاری نے راستہ بنایا۔

مہ..... میں تو خود حیران ہوں سشما.....  
کہ آخر یہ سب ہوا کیا..... سشما نے دھکی نظروں سے  
سشما کی طرف دیکھا۔

اچھا تو ایسا کرو۔ اٹھو اور بیڈ پر بیٹھو۔ سشما نے بیڈ  
سے اٹھ کر سشما کو آئینے کے پاس پڑے ٹیبل کے  
ساتھ پڑے اسٹول سے اٹھایا وہ شیش و شیش کے عالم میں  
اٹھ کھڑی ہوئی۔ سشما نے اسے بیڈ پر لٹایا۔ تم دن بھر کی  
تھکن ہوئی ہو آرام کرو۔ میں اپنا کام باہر چیک کر لیتا



ہوں۔ سنیل نے سسما کو خلاف اڑھاتے ہوئے کہا۔  
سسما نے صرف محسوس کیا تھا سنیل کو اس کی بات پر بالکل بھی یقین نہیں تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ سنیل نے بیڈ پر پڑے اپنے دفتری کاغذات اٹھائے اور کمرے کی لائٹ آف کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سسما نے اپنی نم آنکھوں کو ہاتھ کی تھیلیوں سے صاف کیا وہ کافی دیر اندھیرے میں لیٹی سوچتی رہی اور پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔

☆.....☆.....☆

رات والے واقعہ نے سسما کا ذہن کافی حد تک الجھا دیا تھا۔ ہاں اگر وہ خواب ہوتا تو اسے تسلیم کیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس نے وہ سب کچھ جانتی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پرے سنیل کو اس کی بات پر بالکل بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ سنیل ناشتہ کر کے جا چکا تھا اور راہول باہر لان میں ہری ہری گھاس پر کھیل رہا تھا۔ اس نے ناشتے کے برتن سینے اور بچن میں لے آئی۔ انہیں دھونے کے بعد وہ بچن سے باہر نکل آئی۔ سنیل نے اس سے کہا تھا کہ وہ آج آفس سے جلدی آ جائے گا۔ اور پھر راہول کے لئے اسکول دیکھنے چلیں گے۔ وہ ہال میں رکھے صوفوں میں سے ایک پر بیٹھی اور ایک مرتبہ پھر رات والے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگی اس کا دماغ مزید الجھا تو اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور باہر لان میں آگئی۔ باہر خوشگوار ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ راہول گھاس پر بیٹھا کھیل رہا تھا وہ اس کے پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

”مما پاپا کب آئیں گے؟“ راہول نے اس سے پوچھا۔

دو پہر کے سہ۔ سسما نے بتایا تو راہول دوبارہ کھیل میں جو ہو گیا اونچا کچا سسما کے ذہن میں پرسوں دن والے واقعہ نے جھماکا کیا۔ جب راہول نے آئینے میں نظر آنے والی لال ساڑی والی عورت کا ذکر کیا تھا۔ ”راہول بیٹا ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ سسما نے راہول کے کھیل میں خلل ڈالا۔ راہول نے برا سا

منہ بنایا اور اٹھ کر اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”جی ممما.....“ سسما کی طرف دیکھتے ہوئے راہول نے پوچھا۔

راہول بیٹا وہ بتاؤ پرسوں تم نے ایک لال ساڑی والی عورت کا ذکر کیا تھا جو کمرہ بند کر رہی تھی کیا یہ بات سچ ہے۔ سسما نے راہول سے پوچھتے ہوئے تعذیب چاہی۔ ہاں ممما میں بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ پرنتو آپ اور پاپا نے کہا کہ میرا وہم ہو گا تو میں نے سوچا شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ راہول نے دونوں ہاتھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

ہوں..... سسما نے ایک طویل سانس کھینچی۔ وہ کسی عورت تھی؟

مما سندر عورت تھی اس نے لال رنگ کی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے اسے آئینے میں سے دیکھا تھا وہ کمرے کا دروازہ بند کرنے لگی تھی۔ اس کارن میں تیزی سے گھومنا پڑا۔ عورت کی صورت کہیں نہیں تھی۔ ممما پتہ ہے وہ عورت کافی حد تک کمرے کا دروازہ بند کر چکی تھی پرنتو میں جب گھوما تو دروازہ سارا کھلا ہوا تھا۔ راہول نے سسما کے سامنے مزید انکشاف کیا۔ میں نے دوبارہ آئینے کی طرف دیکھا تو وہ عورت کہیں کی نظر نہیں آئی۔ پھر آپ اور پاپا اندر آ گئے تھے۔

یہ کیا چکر ہے..... سسما پریشانی سے بڑبڑاتی۔ ”کیا کہا ممما.....“ راہول کو شاید سنا ہی نہیں دیا تھا۔ کچھ نہیں بیٹا۔ آپ ایسا کر دو دوبارہ کھیل لو۔ سسما نے پچھلی سی ٹہنی ہستے ہوئے کہا۔

”مما چھت پر چلیں.....“ راہول نے آس بھری نظروں سے سسما کی طرف دیکھا۔

”نہیں بیٹا میں کھیلو۔“ سسما نے اسے منع کرتے ہوئے کہا۔

”مما چلیں ناں، میں نے اپنے گھر کی چھت ابھی تک نہیں دیکھی۔“ راہول نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ ”پلیز ممما..... چلیں ناں۔“

نہیں بیٹا آپ یہیں کھیلو شام کو چلیں گے۔ میرا

دل نہیں کر رہا۔ سسما نے راہول کو ٹالنا چاہا..... نہیں ممما میں نے ابھی جانا ہے..... پلیز چلے ناں.....

راہول نے اٹھ کر سسما کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے چلو چلتے ہیں..... سسما نے راہول کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی وہ اندر آئے اور دونوں بیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ راہول بھاگ کر بیڑھیوں چڑھنے لگا۔ ”آہستہ بیٹا چوٹ نہ لگ جائے۔ سسما نے گھبراتے ہوئے آواز لگائی۔ لیکن راہول پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ چھت پر پہنچنے تک مرتبہ پھر خوشگوار ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اس کے لیے لیے ہال ہوا میں اڑنے لگے۔ باہو..... گھوڑا..... راہول نے چھت پر پڑے لکڑی کے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے اچھلتے ہوئے کہا۔ وہ تیزی سے اس گھوڑے کی طرف بڑھا۔ یہ ہال سے آیا۔ سسما نے حیرت سے لکڑی کے گھوڑے کی طرف دیکھا راہول گھوڑے پر بیٹھ کر اسے آگے پیچھے ہلانے لگا تھا وہ گھوڑا زیادہ برانا نہیں لگ رہا تھا۔ شاید ہم سے پہلے جو فیملی یہاں رہ کر گئی ہو ان کا ہو۔ سسما نے خدشہ ظاہر کی سسما چھت کے کنارے پر آئی اور باہر دیکھنے لگی۔ اس نے دیکھا اس کے گھر کے باہر ایک نیلے رنگ کی کار کے پاس ایک خوب صورت نوجوان کھڑا تھا جس نے آنکھوں پر کالے رنگ کے گلاسز لگا رکھے تھے۔ سسما نے دیکھا اس کی نظر جیسے ہی اس لڑکے پر پڑی اس لڑکے نے سسما تیزی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے کمرے سے سسما کی تصویریں لے لیں۔ سسما اس لڑکے کی اس حرکت پر پہلے تو حیران ہوئی اور پھر اسے شدید غصہ آیا ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ نیچے اتر کر اس لڑکے کی اس حرکت پر اسے کھری کھری سنائے مگر وہ لڑکا تیزی سے اپنی کار میں بیٹھا اور کار آگے بڑھ گئی..... پڑا عجیب آدمی تھا..... سسما غصے سے بڑبڑاتی۔ پھر وہ راہول کی طرف گھومی..... راہول بیٹا میں نیچے جا رہی ہوں۔ تم جلدی نیچے آ جانا پاپا کے آنے کے بعد تمہارا

ایڈیشن بھی کروانے جانا ہے۔ سسما نے راہول سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو گھوڑے پر بیٹھے راہول نے اثبات میں سر ہلادیا اور سسما بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

چلو یہ تو اچھا ہوا آج راہول کا ایڈیشن ہو گیا۔ بیڈ پر بیٹھے سنیل نے کہا۔ سسما اس کے پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ سنیل کی طرف گھومی اپنی کہنی بیڈ کے گدے پر ٹکاٹی اور سر ہاتھ کی تھیلی پر رکھا۔ جی ہاں اور یک اینڈ ڈراپ کی سمیاسی جل ہوگئی۔ سسما نے سنیل کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے سنیل کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”سنیل مجھے آپ سے ایک بات کرنی تھی۔“

”ہاں بولو.....“ سنیل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”آج میں اور راہول پر چھت پر گئے تھے وہ چھت پر جانے کی ضد کر رہا تھا۔ ہم چھت پر پہنچے تو میں نے دیکھا ہمارے گھر کے باہر ایک لڑکا نیلے رنگ کی کار کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے آنکھوں پر کالے رنگ کی عینک لگا رکھی تھی جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کمرے سے میری فونوز لیٹی شروع کر دیں میں اس کی اس حرکت پر حیران ہوئی ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیچے اتر کر اس کی خبر لوں کہ وہ ایسی دہشت گرد حرکت کیوں کر رہا ہے پرنتو وہ تیزی سے اپنی کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔“ سسما نے بتایا تو سنیل حیرت سے چوکا۔ ”بلک عینک والا لڑکا اور نیلے رنگ کی کار.....“ سنیل نے کھوئے کھوئے لبھ میں کہا۔

”جی ہاں.....“ جواب سسما نے سر کو اٹھاتی جنبش دی ایک ایسا لڑکا تو میں نے بھی دیکھا تھا اور وہ میری بھی فونوز لے رہا تھا اور اس کی کار بھی نیلے رنگ کی تھی۔ سنیل نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ تو سسما کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھی۔

”واقعی..... کب.....“ اس نے تیز لہجہ میں



خوفنا کہ



سنیل..... کن سوچوں میں ڈوبے ہوئے ہو کھانا کھوں نہیں کھا رہے۔ سنیل کے کوئیگ سریش نے اسے سوچوں کے سمندر سے باہر کھینچا۔ آں وہ چونکا.....  
نن..... نہیں کچھ نہیں۔

تو پھر کھانا کیوں نہیں کھا رہے۔ سریش نے سوالیہ لگا ہوں سے سنیل کی طرف دیکھا..... بس یار..... جھوک نہیں ہے..... سنیل نے کھانے کی پلیٹ کو پرے کرتے ہوئے کہا..... ارے ابھی مسئلہ دہی ہو تو اس میں پیٹ کا کیا قصور..... سریش نے مسکراتے ہوئے کہا..... کیا مطلب..... جوا یا سبیل بمشکل مسکرایا۔ ابھی سیدھی سی بات ہے اگر انسان دہی طور پر پریشان ہو تو پیٹ کو سزا نہیں دینی چاہئے۔ سریش نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

پرتو اگر ذہن سمیسا میں الجھا ہوا ہو تو پھر شریر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ایسے میں پیٹ کی بھلا کیسے سوچتی ہے۔ سنیل نے پشیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کا مطلب کوئی سمیسا ضرور ہے۔ سریش نے ہنستے ہوئے کہا اسے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ملی تھی۔ ہاں یار..... سنیل نے بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”کہتے ہیں غم بٹانے سے کم ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی سمیسا کسی دوسرے کے سامنے رکھنے سے اس کا کوئی نہ کوئی اپائے ضرور نکل آتا ہے۔ سریش نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ سریش بات کرنے کا گربخوئی جانتا تھا۔ بس یار سریش کیا بتاؤں۔ سمیسا ایسی ہے کہ تم بھی دھواں نہیں کرو گے۔ سنیل نے سریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تم بتاؤ سمیسا کیا ہے۔ سمیسا کوئی بھی ہو بے معنی نہیں ہونی چاہے وہ دماغ میں ہو یا پھر جیون میں..... سریش نے عجیبہ لہجے میں کہا تو سنیل نے اسے ساری بات بتادی۔

”بس یار اسی کارن میں کئی دفعہ سشما سے بے رخی سے بات کر چکا ہوں اور لاسٹ نائٹ تو میں نے بے رخی کی انتہائی کر دی..... سنیل نے ساری بات بتاتے

ہوئے دیکھی لہجے میں کہا وہ اپنے رویے پر واقعی بہت شرمندہ تھا وہ اب سریش کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا کہ وہ ساری بات جان کر سشما کی باتوں پر ہنسنے لگا مگر سریش بالکل خجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ تو تمہاری طرف سے زیادتی ہے۔ سریش نے سنیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زیادتی..... اور وہ بھی میری طرف سے سنیل نے حیرانگی سے اپنے ہاتھوں کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

ہاں تمہاری طرف سے۔ سریش نے زور دیتے ہوئے پختہ لہجے میں کہا۔ سشما اب باتیں ہی ایسی کر رہی ہے جو انسانی سمجھ سے پرے ہے۔ سنیل طنز پر لہجے میں ہنسا۔

ناگن تو نہیں۔ سریش نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ کیا مطلب۔ سنیل نے حیرانگی سے سریش کی طرف دیکھا۔ تمہیں سشما کی بات سنی چاہئے ہو سکتا ہے وہ سچ کہہ رہی ہو۔ سریش نے کہا تو سنیل اسے بے یقینی کے عالم میں دیکھنے لگا۔ سریش تم بھی یہ ایڈوائس دور ہے سریش اس دور میں یہ باتیں بے معنی ہیں۔ سنیل کسی پروفیسر کی طرح لیکچر دیتے ہوئے بولا۔ دور کا سمبندھ ان چیزوں سے نہیں ہے سنیل۔ ان چیزوں کا ذکر ہر دور میں رہا ہے اور ویسے بھی تمہاری جتنی آج کل کی پریمی باتیں ناری ہے۔ اس کا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ آخر کار اس کے ساتھ کوئی سمیسا ہے تو وہ تمہیں بتا رہی ہے۔ سریش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

تمہیں ان چیزوں پر دھواں ہے سریش۔ سنیل عجیب نظر سے سریش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بات دھواں کی ہی ہے سنیل“ سریش نے لفظ ”دھواں“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ سنیل سریش کی بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ مطلب یہی کہ تمہاری جتنی کو دھواں ہے کہ تم اس کی سمیسا کو سمجھو گے اسی کارن وہ تم سے یہ باتیں شیئر کر رہی ہے اور تم ہو کہ اس کے دھواں کی دھجیاں اڑانے پر تلے ہوئے ہو۔ سریش نے کہا تو سنیل نے

ٹھوری کھجائے ہوئے کہا۔ میں اب بھی نہیں سمجھا۔ دنیا میں آتما کیں بھوت پریت ہیں، نہیں یہ ایک الگ سمیسا ہے۔ پرتو جیون سا بھی ہوتے ہی اس لئے ہیں کہ مشکل سے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں۔ تمہاری جتنی اس سے ابھی ہوئی ہے پریشان ہے اب اس کے ساتھ کیا سمیسا ہے یہ تو بھگوان جانتا ہے یا وہ جانتی ہے۔ پرتو ایک جیون سا بھی ہونے کے ناطے تمہارا جو کرتو (فرض) ہے تمہیں وہ نبھانا چاہئے۔ اس کا ساتھ دینا چاہئے اس کا حوصلہ بٹنا چاہئے تم اس کا ساتھ دینے کے بجائے الٹا اس سے بحث رہے ہو اس پر غصہ ہوا ہے اس طرح تو وہ اندر سے بالکل ٹوٹ جائے گی۔ تم اطمینان سے اس کی بات سنو باقی جہاں تک ان انہونی باتوں کی سمیسا ہے اس کا بھی کوئی نہ کوئی اپائے ضرور نکل آئے گا۔ تم بس اپنی جتنی سے ٹھیک طریقے سے بات کرو اس کی بات اطمینان سے سنو۔ تمہاری جتنی کی آدھی سمیسا تمہارے نرم برتاؤ سے حل ہو جائے گی۔ سریش نے کہا۔ اور شرمندگی کے باعث سنیل کے منہ سے نکلا پھر وہ مجھے والے انداز میں بولا۔ واقعی مجھے سشما کے ساتھ ایسے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔

چلو دربار آئے درست آئے۔ سریش نے مسکراتے ہوئے کہا تو سنیل بھی مسکرا دیا۔ اپنے گھرہ ایڈریس تو وہ مجھے۔ سریش نے توقف کے بعد پوچھا۔ کیوں۔ سنیل نے پوچھا۔ ارے ابھی کسی روز بھابھی کے ہاتھوں کی جائے ہی بی بی لیں گے۔ سریش نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو سنیل بھی کھٹکلا کر ہنس پڑا۔

☆.....☆.....☆

سشما اس قدر آدھ آئینے کے سامنے آئی۔ اس نے دیکھا اس کے ساتھ کسے نہیں پر ایک تہہ شدہ کاغذ اور گلاب کا پھول رکھا ہوا تھا۔ سشما نے وہ کاغذ اٹھا کر کھولا تو اس پر یہ تحریر درج تھی۔

I am sorry  
your love snil

اس تحریر کو پڑھ کر سشما بے اختیار مسکرا دی۔

اچانک اسے اپنی کمر پر ہاتھ کے رینگنے کا احساس ہوا۔ اس نے آئینے میں دیکھا تو سنیل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس نے اس کے پیٹ کے گرد ہاتھوں کا گھیرا ڈالا۔ آئی ایم رینگلی سوری مائی ڈیزر، سنیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سشما نے گھوم کر اسے گلے سے لگا لیا۔ چلے۔ آپ کو اپنی غلطی کا احساس تو ہوا۔ سشما اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اب تم یہ طوفان روک لو تو اچھا ہے ورنہ ان آنسوؤں کے طوفان میں، میں کہیں بہہ نہ جاؤں۔ سنیل نے سشما کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا تو سشما بے اختیار ہنس پڑی۔ ”چلے، اب چھوڑیے مجھے، سشما نے سنیل کے بازوؤں کی گرفت سے نکلتا چاہا مگر سنیل نے یکدم اپنے بازوؤں کی گرفت مضبوط کر لی۔ اب تو اس قید سے نکلتا امپا بل ہے۔ سنیل نے مسکراتے ہوئے اپنے ہونٹ سشما کے ہونٹوں کی طرف بڑھائے۔ سشما اس کے بازوؤں میں پھلتی رہی جبکہ سنیل ہر باریک طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

رات میں سنیل کی آنکھ کھلی تو اسے پیاس کی شدت محسوس ہو رہی تھی اور وہ جاگ بھی اسی وجہ سے تھا کمرے میں زیر و کالباب آن تھا۔ سنیل نے سشما کی طرف دیکھا تو وہ گہری نیند کے سمندر میں غوطے لگا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھا اور اپنا سر کھجائے لگا۔ پھر اس نے اوپر اٹھا ڈھالچاں اتار اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ گیا اور وہاں پر ایک دیکھا تو وہ خالی تھا۔ ہیں یہ اتنا سارا پانی سشما کی جتنی اس نے حیرانگی سے سشما کی طرف دیکھا پھر وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے ہال کی لائٹ آن کی اور جتن میں جانے کے بعد پانی کا گلاس پینے کے بعد باہر نکل آیا۔ سنیل کے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے قدم ٹھک کر رہے وہ گھوم اس نے دیکھا۔ راہوں کے کمرے کا دروازہ چو پٹ کھلا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ وہ



راہول کے کمرے کے دروازے کے قریب آیا تو اس نے ہال سے اندر آنے والی مدھم روشنی میں دیکھا راہول کے بیڈ کے پاس کوئی کھڑا تھا وہ واضح تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے ایک عورت ہے۔ سسما اس نے آواز دی۔ ”شش“ دھیرے بولنے۔ راہول جاگ جائے گا۔ سسما نے کہا۔ سنیل نے لائٹ آن کرنے کے لئے سوچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سسما تیز لہجے میں بولی۔ لائٹ مت آن کیجئے گا۔ راہول جاگ جائے گا۔

تم بڑی جلدی یہاں چلی آئی۔ تم تو سو رہی تھی۔ سنیل نے آہستگی سے پوچھا۔ مجھے پیاس لگی تھی میں بھی آپ کے پیچھے ہی آ رہی تھی تو میں نے راہول کی آواز سنی اور یہاں آئی تو راہول جاگ رہا تھا میں اسے سلائے کے لئے یہاں ٹھہر گئی۔ سسما نے دھیرے سے بتایا۔ سنیل کو ہال سے اندر آنے والی مدھم روشنی میں سسما کا چہرہ واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ آپ کمرے میں چلیں۔ یہ بس سو ہی گیا ہے۔ میں آتی ہوں۔ سسما نے کہا تو سنیل اثبات میں سر ہلاتا ہوا راہول کے کمرے سے باہر نکل آیا وہ اپنے کمرے میں آیا کمرے میں ابھی بھی زیر کا بلب آن تھا۔ سنیل نے بیڈ پر لیٹ کر خلاف اوڑھا اور کروٹ لی تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹا کیونکہ سسما بیڈ پر سو رہی تھی!!!

وہ اٹھ کر بیٹھا سسما ابھی بھی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”سس“ سسما یہاں ہے تو راہول کے کمرے میں کون ہے۔ سنیل پریشان کن لہجے میں بڑبڑایا وہ تیزی سے بیڈ سے نیچے اتر اور ننگے پاؤں ہی راہول کے کمرے کی طرف بھاگا اس مرتبہ راہول کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ سنیل نے دروازہ کھولا اور دیوار پر لگے سوچ بورڈ سے لائٹ آن کی تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کمرے میں بیڈ پر گہری نیند میں ڈوبے راہول اور اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا!!!

یہ..... کلک..... کیا پکڑ ہے؟ وہ پریشانی سے بڑبڑایا۔ اگر سسما کمرے میں سو رہی ہے تو وہ کون تھی

جو یہاں مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ سنیل کا دل زردوں دھڑکنے لگا اور اس کے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ کلک..... کہیں سسما ج تو نہیں کہہ رہی تھی۔ اس نے سوچا پھر اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اپنے اس خیال کو وہم کا نام دینے کی ناکام کوشش کی۔ ناکام اس لئے کہ اس کی طبیعت اس بات کو ماننے کو تیار ہی نہیں تھی مگر یہ سب کچھ اس کے ساتھ جاگتی آکھوں سے ہوا تھا اس نے راہول کے کمرے کی لائٹ آن کر کے کے بعد دروازہ بند کیا اور گھوما تو اگلا لمحہ بھی اس کے لئے بے پناہ حیرت لئے کھڑا تھا۔ اس تالے والے کمرے کا نالا کھلا ہوا تھا اور دروازے کی کنڈی کے سوراخ میں جھول رہا تھا۔

یہ..... نالا تو لاک تھا۔ وہ ہکھلایا اس نے اپنے ماتھے سے ٹپکنے والے پسینے کو صاف کیا اور اس تالے والے کمرے کے دروازے کے قریب آیا اس نے تالے کو سوراخ سے باہر نکالا اسی وقت اندر سے دروازے پر دستک ہوئی۔ سنیل جھٹکا اور ڈر کر پیچھے ہٹا اسے اپنی ٹانگیں کا پتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ہے..... جھک..... وال..... یہ کیا پکڑ ہے۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ دروازے پر اندر سے ایک مرتبہ پھر دستک ہوئی وہ کا پتی ہوئی ٹانگوں سے کمرے کے دروازے کے قریب آیا اس نے کا پتیے ہوئے ہاتھوں سے دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازہ اندر کی جانب دھکیل دیا کمرہ مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ہال میں چلنے والی لائٹ سے بھی کمرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک کمرے سے کلک کلک کی آوازیں آنے لگیں۔ سنیل یہ آواز پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ آواز اس لکڑی کے گھوڑے کے چلنے کی تھی جو کل ہال میں پڑا ہل رہا تھا۔ مگر جیران کی دانی بات یہ تھی کہ وہ گھوڑا اس بند تالے والے کمرے میں کیسے آیا۔ سنیل نے ہال میں ارد گرد نظریں دورائیں تو لکڑی کا وہ گھوڑا ہال میں کہیں بھی نظر نہ آیا اس کمرے (تالے

والے) میں پھیلے اندھیرے سے کلک کلک کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ وہ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہونے پر کلک کلک کی آوازیں مزید تیز ہو گئیں۔ وہ لائٹ آن کرنے کے لئے دیوار کی طرف بڑھا تو اس کمرے کا دروازہ یکدم تیزی سے بند ہو گیا۔

ارے..... یہ کیا..... وہ اندھیرے میں بڑبڑایا وہ دیدے بھاڑ بھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا مگر سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دوبارہ دیوار پر ہاتھ مارنے لگا تا کہ لائٹ کا سوچ بورڈ ڈھونڈ سکے اور پھر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا اس نے بورڈ کے سارے بٹن آن کر دیئے۔ مگر یہ کیا..... کمرے کا بلب روشن نہ ہوا۔ لگتا ہے اس کمرے کا بلب فیل ہو گیا ہے۔

سنیل نے ہسکامی کے انداز میں خدشہ ظاہر کیا۔ کلک کلک کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ مزید تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک تو یہ لکڑی کا گھوڑا وہ غصے سے بڑبڑایا وہ اندھیرے میں ہاتھ مارتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور دروازے کے دی پینڈل میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ دروازہ باہر سے بند تھا۔ ”سس“ سسما وہ چلایا اسی وقت کمرہ روشنی میں نہا گیا اور ساتھ ہی کلک کلک کی تیز آوازیں بند ہو گئیں۔ ”سنیل“ حقیقی جانب سے ایک سر کی نسائی آواز نے سنیل کے کانوں میں رس کھولا۔ سنیل پہلے تو جیران ہوا پھر وہ گھوما تو حیرت کا ایک اور جھٹکا اس کا منہ تھا۔ سامنے لال ساڑی میں لمبوں ایک خوب صورت عورت کھڑی تھی اور سنیل کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ سنیل نے اتنی خوب صورت عورت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ سنیل کو اس کے چہرے پر ہنسی اور بھی ٹھٹھکی لگ رہی تھی۔ تم آگے رہا جیگر..... وہ عورت پیار سے سنیل کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ اس عورت کی خوب صورتی میں عجیب سی کشش تھی جو سنیل کو اپنی طرف مائل کر رہی تھی۔ میں برسوں سے تمہاری راہ

دیکھ رہی تھی۔ اس عورت کی اس بات پر سنیل چونکا۔ مم..... میری..... حیرت کے باعث سنیل کے منہ سے نکلا۔ ہاں تمہاری..... وہ عورت انداز دہرائی سے بولی۔ ”آج میری برسوں کی تپسیا کا پھل مجھے مل گیا۔“

ساتھ ہی اپنی بانہیں پھیلائے وہ سنیل کی طرف بڑھی جتنی وہ خوب صورت عورت تھی کوئی بھی اس سے گلے لینے کو تیار ہو جاتا اور سنیل بھی بے وقاؤں کی لسٹ میں شامل ہونے جا رہا تھا کہ اس نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا جیسے ہی وہ خوب صورت لال ساڑی والی ایسر اپنی بانہیں پھیلائے سنیل کی طرف بڑھی تو اس کے پیروں سے ساڑی سر کی اور سنیل کو اپنا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے کرتا ہوا محسوس ہوا وہ تیزی سے گھوما اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ دروازہ کھل گیا وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور کمرے کے دروازے کو تیزی سے بند کر دیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا اور اسی وقت حقیقی جانب سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چیختے ہوئے گھوما تو اس کے پیچھے سسما کھڑی تھی۔ ارے کیا ہوا سنیل..... سسما نے حیرانگی سے پوچھا۔ وہ..... وہ اس کمرے میں، میں نے ایک لال ساڑی والی عورت دیکھی۔ سنیل نے دھڑکنے دل کے ساتھ اس کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کس کمرے میں؟“ سسما نے حیرانگی سے سنیل کی طرف دیکھا۔ اس کمرے میں سسما..... سنیل نے دوبارہ اس کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سنیل۔ سسما نے سنیل کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیوں..... کیا ہوا..... سنیل نے سسما کا ہاتھ ہٹایا..... یہ تو تالے والا کمرہ ہے۔ سسما نے بظاہر یاد دہانی کرائی۔ پپ..... پپ تو اب تالا نہیں ہے..... اسی کارن تو میں جیران ہوا تھا کہ اس کمرے کا تالا کیسے کھل گیا۔ پھر مجھے ویسی ہی ”کلک کلک“ کی آوازیں



آنے لگیں جیسی کل اس لکڑی کے گھوڑے کے بننے سے آ رہی تھیں۔ ”مم..... میں حیران ہوں کہ وہ گھوڑا تو یہاں ہال میں پڑا ہوا تھا وہ اس کمرے میں کیسے پہنچا۔ میں نے ہال میں بھی دیکھا پر نہ وہ گھوڑا ہال میں کہیں بھی نہیں تھا اس کمرے سے بار بار تک تک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو کمرے میں کیول اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچ بورڈ کے سارے بین آن کے پرتو کمرے میں لگا بلب نہ جلا وہ شاید ٹیوز ہو چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ بھی خود ہی بند ہو گیا تھا۔ میں نے اندر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی پر نہ وہ نہیں کھلا۔ میں نے بہت زور لگایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نے تمہیں بھی پکارا تھا اسی سے کمرے میں روشنی ہو گئی اور میں نے دیکھا کمرے میں لال ساڑی پہنے ایک سندھ عورت کھڑی تھی وہ میری طرف بڑھی تو اس کے پیروں سے ساڑی کا پٹا اٹھ گیا۔ میں ڈر گیا کیونکہ اس عورت کے دونوں پیروں کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ سنیل نے ایک ہی سانس میں ساری بات بتادی۔ وہ اپنے جذبات دانستہ سشما سے چھپا گیا تھا۔ پھر میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ اس مرتبہ کھل گیا اور میں باہر آ گیا۔

سشما بے یقینی کے عالم میں سنیل کو دیکھ رہی تھی۔ ”کہا ہوا سشما تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو۔“ سنیل نے انہیں آمیز لگا ہوں سے سشما کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ کو نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے۔“ سشما نے ہنستے ہوئے کہا۔ تم میرا مذاق اڑا رہی ہو۔ سنیل نے غصیلے لہجے میں کہا۔ نہیں میری جان، آپ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں کہ ہنسی ہی آئے گی۔ سشما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب،“ سنیل نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ”مطلب یہ کہ آپ کہہ رہے ہیں وہ لکڑی کا گھوڑا اس کمرے میں پڑا ہے تو گھوڑا جناب وہ صوفے کے پاس پڑا ہے۔ سشما نے ہال میں پڑے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سنیل نے

اس طرف دیکھا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ کیونکہ لکڑی کا وہ گھوڑا واقعی صوفے کے پاس ساکت پڑا ہوا تھا۔ اور آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ آپ اس کمرے میں گئے تھے تو میری جان اس کمرے پر تو تالا پڑا ہے اور آپ نے خود کہا تھا کہ اس کی چابی منوج جی کے پاس ہے۔ سشما نے مزید کہا تو سنیل نے تیزی سے اس کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ کیونکہ کمرے کے دروازے کی لکڑی میں بند تالا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

سریش سنیل کی حالت زار پر ہنس رہا تھا اور سنیل نے ہی کے عالم میں اسے غصے سے غمور رہا تھا۔ اب میرا مذاق اڑانا بند ہو گیا ہو تو کوئی کام کی بات کر لیں۔ سنیل غصیلے لہجے میں بولا۔

نہیں..... نہیں یار میں تو اس لئے ہنس رہا تھا کہ ہر ایکشن کاری ایکشن ہوتا ہے یہ بات آج سچ ہو گئی۔ بھابھی تم سے کتنی تمہیں پرستوں ہیں جانتے تھے اور اب تم کہہ رہے ہو بھابھی تمہاری باتوں پر دشواں نہیں کر رہی۔ سریش نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہاں یار..... مجھے اس سے سشما کی باتوں پر دشواں کر لینا چاہیے تھا۔ اور آج وہ بھی میری باتوں پر دشواں کر لیتی..... سنیل افسردہ لہجے میں بولا۔ چلو تمہیں اپنی غلطی کا احساس تو ہوا۔ سریش نے کہا۔ وہ تو کل ہی تمہاری باتوں سے ہو گیا تھا۔ سنیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ تمہیں اپنے رویے پر ہوا تھا۔ سشما بھابھی کے ساتھ جو پراسرار واقعات ہو رہے تھے اور پھر وہی حیران کن واقعات رات کے تمہارے ساتھ بیٹے تو تمہیں سشما بھابھی کی باتوں پر دشواں ہوا۔ سریش نے نقطہ اٹھایا۔

ہاں..... یہ بات بھی تمہاری بالکل صحیح ہے۔ سنیل نے اعتراف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ انسان تب تک کسی کا دکھ نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ خود ویسی ہی سچویش سے دوچار نہ ہو۔ گڈ..... یہ ہوئی نہ بات.....

اب اس گھر میں جیسا بھی چل رہا ہے وہ کافی حد تک کمزور ہو چکا ہے۔ ان شیطانی ہلکتیوں کی شگفتگی کافی کمزور ہو چکی ہے۔ سریش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب۔ سنیل نے سوالیہ لگا ہوں سے سریش کی طرف دیکھا۔ مطلب یہی کہ یہ جو آزمائشیں بھوت پریت اور شیطانی ہلکتیاں ہوتی ہیں نہ یہ انسانوں کو ذہنی طو پر کمزور کرتی ہیں اور پھر حملہ کرتی ہیں۔ وہ پتی پتی میں پھوٹ ڈالتی ہیں تاکہ دونوں ایک دوسرے پر دشواں نہ کریں اور وہ آسانی سے دونوں پر حملہ کر سکیں۔ ”آپ اپنی ہی مثال لے لو جب یہ چیزیں تمہاری جتنی کو نظر آ رہی تھیں تو تمہیں اس کی باتوں پر دشواں نہیں تھا۔ کل تم نے ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا تو وہی چیزیں تمہیں نظر آئے لگ سکیں اور اب بھابھی تم پر دشواں نہیں کر رہی..... اب اگر تم دونوں ایک دوسرے کی باتوں پر دشواں کرو گے تو وہ شیطانی ہلکتیاں تمہیں کم از کم نقصان نہیں پہنچا دیں گی۔ اب تم دونوں کا دشواں ہی تم دونوں کی شگفتگی ہے اور شیطانی ہلکتیوں کی کمزوری۔ سریش نے سنیل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ سنیل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پرتو یہ سب باتیں تم کیسے جانتے ہو؟

میرا ایک دوست ہے وہ بھی کام کرتا ہے۔ سریش نے مسکراتے ہوئے کہا تو سنیل نے حیرانی سے پوچھا۔

کیسے کام؟

یہی شیطانی چکروں والا کام جس میں تم اور تمہاری جتنی چھنے ہوئے ہیں۔ یعنی جو لوگ بھوت پریت آزمائش کے جنگل میں پھنسے ہوتے ہیں وہ انہیں ان سے نکت (آزادہ بنانا) کراتا ہے۔ سریش نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تو سنیل نے تیزی سے پوچھا۔ تو تم نے اس سے اب تک ہمارے بارے میں بات کیوں نہیں کی۔

شریمان جی کل آپ کے گھر کا ایڈریس میں نے اسی کارن لیا تھا پر نہ تو ایسے کام کے سلسلے میں عزت

شہر سے باہر جانا پڑا۔ سریش نے وجہ بتائی۔ کب تک آئے گا وہ سنیل نے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا۔ چتا مت کرو میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی اور تمہاری سمیاسے بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ بس وہ ایک دوسرے کی بات پر دشواں کریں یہ جو شیطانی چیزیں ہوتی ہیں وہ جتنی جتنی میں پھوٹ ڈالتی ہیں اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ جیسے ہی واپس آئے گا ترنت تمہارے گھر ہی آئے گا۔ سریش نے بتاتے ہوئے کہا۔ پر نہ تو اگر انہوں نے ہمیں نقصان پہنچایا تو سنیل نے خوفزدہ لہجے میں سریش کی طرف دیکھا۔ تم چتا مت کرو وہ جیسے ہی واپس لوئے گا۔ تو میں اسے تمہاری طرف لے آؤں گا۔ سریش نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ مجھے ابھی بھی دشواں نہیں ہو رہا کہ دنیا میں ایسی چیزیں اب بھی ہیں۔ سنیل نے سریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دور کیسا بھی ہو جائے سنیل اچھا کنی برائی آتیاں، بھوت پریت ہر دور کا حصہ رہی ہیں۔ ہم ان پر دشواں نہیں کرتے اسی کارن وہ شگفتگی شامی ہو جاتی ہیں۔ سریش نے بتایا۔ پرتو یہ کیوں ہوتی ہیں۔ سنیل بے زار لہجے میں بولا۔ ان کا کوئی کام ادھورا رہ جاتا ہے کچھ آزمائش خون کی پیاسی ہوتی ہیں۔ کچھ آزمائشیں انتقام لینے کے لئے دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ کچھ برے لوگ ان کے ذریعے شگفتگی شامی بننے کے لئے انہیں دنیا میں بلاتے ہیں۔ ایسے کئی کارن ہیں ان چیزوں کے دنیا میں رہنے کے۔ سریش نے سنیل کو بتایا۔ اچھا!!!! سنیل نے حیرانگی سے لفظ ”اچھا“ کو لمبا کھینچا۔ تو پھر ہمارے گھر میں یہ سب کس کارن سے ہو رہا ہے۔

یہ تو بھگوان ہی جانتے۔ اب میرا وہ دوست ہی اس سمیاس کا کوئی پاپا لے گا۔ سریش نے کہا۔ میں نے آج مالک مکان سے بھی ان باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے بھی یہ مکان کسی سے خریدا تھا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس مکان میں کوئی بھی کرایہ دار زیادہ دن نہیں ٹکنا وہ کوئی نہ کوئی کارن بتا کر یہ مکان







دھکا دے دیا اور میں چیختا ہوا سیڑھیوں سے نیچے آگرا..... راہول نے ساری بات بتائی تو سنیل اور شمشا حیرت اور خوف کے طے جل اثرات سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ سنیل آپ میری بات کیوں نہیں مانتے۔ پلیز جلد یہاں سے ورنہ کچھ اترتھ ہو جائے گا۔ شمشا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ٹھٹھ..... ٹھیک ہے چلو بھر..... سنیل نے ہکلاتے ہوئے آخر کار مانی۔ پپ۔ پپ۔ پپ۔

تھا۔ اس کی ساری بہادری رفو چکر ہو چکی تھی۔ آئینے کے کاغذ پر بٹکتے باقی کپڑے بھی اڑے اور ان کا رخ بھی تبدیل ہوا اور راہول تھے کی طرف۔ ان تینوں کی سٹی گم ہو گئی۔ وہ سارے کپڑے ان کے جسموں سے چٹ گئے اور اپنے ننھے ننھے دانتوں سے ان کے جسموں پر کاٹنے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بیک وقت کئی سوئیاں ان کے جسموں میں چبھو دی گئی ہوں اور درد کی تیز لہریں ان کے جسموں سے اٹنے لگیں وہ تینوں چیختے پر مجبور ہو گئے۔ پھر ان تینوں کی موت جواب دے گئی اور اندھیرے کی جھلکیاں ان کی آنکھوں کے آگے آئے لگیں۔

پہلی خون کی لکیریں اب کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔  
 دور تک مسلسل بج رہی تھی۔ سیتل اٹھ کر کھڑا ہوا تو  
 تکلف کے باعث ایک مرتبہ پھر اس کے منہ سے جھجوں  
 کا طوفان سائیل پڑا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے  
 قدموں سے باہر نکلا اور بیرونی دروازے کے قریب  
 پہنچا۔ یکب..... کون..... اس نے احتیاطاً پوچھا۔

رفو چکر ہو گیا اور پھر دوسرے دن سسما کی تصویریں بھی اسی لڑکے نے چھینچیں تھیں۔ جب وہ چھت پر کھڑی تھی۔ پپ..... پر کیوں..... سنیل نے ابھمن زدہ نظروں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا وہ لڑکا مسکرایا اور اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا سفید کاغذ کا لفافہ سنیل کی طرف بڑھا دیا۔ میں نے آپ کے بچے کی تصویر بھی چھینچنی تھی جب وہ اسکول گیا تھا۔ اس نے مزید بتایا۔ سنیل نے اس لفافے کو کھولا تو اس میں تین تصویریں تھیں سنیل نے وہ تصویریں نکالیں۔ تو سنیل نے دیکھا ان میں ایک تصویر وہی تھی جو اس لڑکے نے سنیل کی چھینچنی تھی تصویر میں سنیل موبائل کان سے لگائے اپنی کار کے پاس کھڑا تھا تصویر میں غور طلب بات یہ تھی کہ سنیل کے سر پر ایک کالے رنگ کا سایہ تھا جو بہت خوفناک شکل واضح کر رہا تھا۔ دوسری تصویر سسما کی تھی جو گھر کی چھت پر کھڑی تھی اور ویسا ہی خوفناک سایہ اس کے سر پر بھی تھا تیسری تصویر رابھول کی تھی اور اس کے سر پر بھی وہی خوفناک سایہ تھا۔ تصویریں دیکھنے کے بعد سنیل نے ابھمن آمیز نگاہوں سے اس لڑکے کی طرف دیکھا۔



کارن میں یہاں چلا آیا۔ اس لڑکے یعنی پرکاش نے ساری بات سننے کے بعد پوچھا..... جی..... ہاں..... میں آج ہی منوج صاحب سے اس کمرے کی چابی لے آیا تھا تاکہ میں اس کمرے کو خود دیکھ سکوں کہ اس کمرے میں اصل میں ہے کیا۔ سنیل نے بتایا..... ٹھیک ہے پھر کھول لئے اسے..... پرکاش نے کہا تو سنیل نے اثبات میں سر ہلایا اور لڑتے ہاتھوں سے پیٹ کی جیب سے اس کمرے کے تالے کی چابی نکالی اور پرکاش کی طرف بڑھائی چاہی لیکن جسم سے پہنچنے والے خون نے اسے مہلت نہ دی اور وہ جکرا کر فرش پر جا گرا پرکاش اور سریش بوکھلائے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ سریش اب تم ہی اس کام میں میری سہائیا کرو گے تاکہ میں ان تینوں کو اس پر اسرار بیماری سے بچا سکوں۔ اگر ہم نے ترنت کچھ نہ کیا تو سنیل اور اس کے پرہیزگار جان بھی جاسکتی ہے۔ پرکاش نے سریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پپ..... پرنٹو پرکاش تمہیں تو چاہئے تھا کہ پہلے انہیں ٹھیک کرتے پھر باقی کام کرتے۔ سریش نے بظاہر پرکاش کو بھاتے ہوئے کہا تو پرکاش مسکرا دیا۔ یہ کام ہی ضروری تھا سریش..... خیر اب پہلے میں ان تینوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا باقی بعد میں..... کیونکہ سے بہت کم ہے اب تم سنیل کو اٹھانے میں میری سہائیا کرو۔

سریش نے اثبات میں سر ہلایا دونوں نے سنیل کو اٹھایا اور اس آئینے والے کمرے میں لے آئے۔ انہوں نے دیکھا سسما اور راہول کے جسموں سے بھی کافی خون بہہ گیا تھا انہوں نے سنیل کو بیڈ پر لٹایا اور پھر فرش پر پڑی سسما کو اٹھا کر بھی بیڈ پر لٹا دیا۔ اب میں ان تینوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا۔ کمرے میں کچھ بھی ہو تم نے گھبرانا نہیں بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ اور یاد رکھنا سریش اس دوران میں تمہاری کوئی سہائیا نہیں کر سکوں گا۔ اور سریش نے بیوقوفوں کی طرح اثبات میں سر بھی ہلادیا تھا۔ تب اسے ایسی چوہن کی توجہ پائی جس کی خیراب جو ہونا تھا اسے تو بھگتنا تھا وہ کالے رنگ کا بلا سریش کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے سریش کو گھور رہا تھا پھر وہ بلا اپنی پچھلی ٹانگوں پر جھکا تو سریش کے رونگٹے کھڑے ہو گئے وہ بالا اب سریش پر حملہ کرنے

کارن میں یہاں چلا آیا۔ اس لڑکے یعنی پرکاش نے ساری بات سننے کے بعد پوچھا..... جی..... ہاں..... میں آج ہی منوج صاحب سے اس کمرے کی چابی لے آیا تھا تاکہ میں اس کمرے کو خود دیکھ سکوں کہ اس کمرے میں اصل میں ہے کیا۔ سنیل نے بتایا..... ٹھیک ہے پھر کھول لئے اسے..... پرکاش نے کہا تو سنیل نے اثبات میں سر ہلایا اور لڑتے ہاتھوں سے پیٹ کی جیب سے اس کمرے کے تالے کی چابی نکالی اور پرکاش کی طرف بڑھائی چاہی لیکن جسم سے پہنچنے والے خون نے اسے مہلت نہ دی اور وہ جکرا کر فرش پر جا گرا پرکاش اور سریش بوکھلائے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ سریش اب تم ہی اس کام میں میری سہائیا کرو گے تاکہ میں ان تینوں کو اس پر اسرار بیماری سے بچا سکوں۔ اگر ہم نے ترنت کچھ نہ کیا تو سنیل اور اس کے پرہیزگار جان بھی جاسکتی ہے۔ پرکاش نے سریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پپ..... پرنٹو پرکاش تمہیں تو چاہئے تھا کہ پہلے انہیں ٹھیک کرتے پھر باقی کام کرتے۔ سریش نے بظاہر پرکاش کو بھاتے ہوئے کہا تو پرکاش مسکرا دیا۔ یہ کام ہی ضروری تھا سریش..... خیر اب پہلے میں ان تینوں کو ٹھیک کرنے کی کوشش کروں گا باقی بعد میں..... کیونکہ سے بہت کم ہے اب تم سنیل کو اٹھانے میں میری سہائیا کرو۔

پرنٹو آپ جتنا نہ کریں پہلے تو مجھے آپ کے شریر پر موجود ان گھاؤ کا اچانک کرنا ہے۔ پرکاش نے سنیل کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اب ہمیں اندر بھی آنے دو گے یا یہیں کھڑے رکھو گے۔ سریش مصنوعی غصے سے بولا تو سنیل نے تیزی سے پیچھے ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔ پرکاش ارد گرد دیکھتے ہوئے آگے بڑھا اور پھر اس تالے والے کمرے کے پاس رکا۔ اس کمرے پر تالا کیوں ہے۔ سنیل نے جھک کر تالے کو پکڑتے ہوئے سنیل کی طرف دیکھا۔ مکان مالک کا کہنا یہی ہے کہ اس کمرے میں ٹونا پھوٹا سامان اور فرنیچر وغیرہ ہے۔ پپ..... پرنٹو..... سنیل کہتے کہتے رکا..... پرنٹو کیا..... پرکاش نے خیر لہجے میں پوچھا۔ تو سنیل نے اس کمرے میں ہونے والے واقعات پرکاش کو سنائیے۔ اس کمرے کی چابی آپ کے پاس..... پرکاش

والا تھا۔ سریش کا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دھڑکتا دل پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ اس بلے نے جست لگائی اور سریش چیخا ہوا یک دم گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اگر وہ بروقت ایسا نہ کرتا تو اس بلے کے بچوں نے اس کے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیتا تھا۔ وہ بلا سریش کے سر سے ہوتا ہوا کمرے کی دیوار سے جا کھرایا اور پھر زمین پر جا گرا۔ سریش تیزی سے گھوما وہ بلا اٹھ کر کھڑا ہوا اور خونخوار آنکھوں سے سریش کو گھورنے لگا۔ اب اس بلے کی آنکھوں میں پہلے کی نسبت زیادہ غصہ تھا۔ سریش کے پورے جسم پر لپکتی طاری تھی۔ وہ اس وقت کوکوں رہا تھا جب اس نے پرکاش کے ساتھ آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ غصے کے عالم میں وہ بلا غراتا ہوا دوبارہ سریش کی طرف بڑھا۔ سریش نے اپنی پوری ہمت کو جمع کیا اور ایک زور دار کک اس بلے کے منہ پر دے ماری۔ بلبلاتا ہوا دوبارہ دیوار سے جا کھرایا۔ پرکاش ان کی طرف توجہ کئے بغیر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ منہ میں کچھ پڑھتا ہوا بار بار ہاتھ کی پچھلی پریشی میں موجود سفید غولوں ڈالتا اور بیڈ پر پڑے سنیل، سسما اور راہول کے چہروں پر مسل دیتا، غصے کے عالم میں اب اس بلے کے منہ سے غراہیں نکل رہی تھیں اسے شاید اپنے دودھ کے حملے کی ناکامی کا غصہ تھا۔ اتنا تو سریش کو بھی پتہ تھا کہ بلے کا اس دفعہ کا حملہ کافی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ بلے کی سرخ آنکھوں میں کہیں کہیں سفید لکیریں نظر آ رہی تھیں بلے نے دوبارہ جست لگائی بلے کا نشانہ اس دفعہ بھی سریش کا چہرہ ہی تھا۔ سریش نے خوف کے عالم میں اپنے دونوں ہاتھ چہرے کے آگے کر لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت کسی نے سریش کے کندھے پر ہاتھ رکھا اس نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ ہٹائے تو کمرے میں اسے وہ خوفناک کالا بلی کہیں بھی نظر نہیں آیا اس کے کندھے پر ہاتھ پرکاش نے رکھا تھا۔ شاباش سریش تم نے بڑی بہادری سے اس شیطانی ہتھی کا مقابلہ کیا۔ پرکاش نے مسکراتے ہوئے اسے داد دی۔ شیطانی ہتھی..... حیرانگی

جس میں سفید کلر کا غول تھا۔ پرکاش نے اس شیشی کا ڈھکنا کھولا اور آنکھیں بند کر کے منہ میں کچھ پڑھنے لگا پھر اس نے جھپٹنے سے اپنی دونوں آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ اس کے ہونٹ مسلسل بل رہے تھے۔ پرکاش نے شیشی میں موجود سفید کلر کا غول ہاتھ کی پچھلی پریشی پر ڈالا اور بیڈ پر بے ہوش پڑے سنیل، سسما اور راہول کے چہروں پر وہ غول ملنے لگا۔ سریش حیران کھڑا ہی منظور دیکھ رہا تھا۔

اچانک کمرے میں لگا بلب وقفے وقفے سے جلنے بجھنے لگا۔ سریش نے حیرانگی سے جلتے بجھتے بلب کی طرف دیکھا۔ میاؤں..... سریش کے کانوں میں آواز پڑی تو اس نے تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو اس کے پورے جسم میں خوف کی لہریں دوڑ گئی۔ کمرے کے دروازے کے پاس ایک کالے رنگ کا کلا کھڑا تھا وہ بلا عام بلبوں سے جسامت میں کافی بڑا تھا کمرے میں جلتے بجھتے بلب کی روشنی جب بند ہوتی تو کمرے کی تاریکی میں صرف اس بلے کی سرخ آنکھیں نظر آتیں اور سریش ارد گردہ جاتا وہ بلا سریش کی طرف بڑھا تو سریش کی کی کم ہو گئی کیونکہ اس بلے کے ارادے ٹیک نہیں لگ رہے تھے۔ سریش نے پرکاش کی طرف دیکھا تو وہ اس سے بیگانہ اپنے کل میں مصروف تھا اور اس کے کانوں میں پرکاش کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔



کے باعث سریش کے منہ سے نکلا۔ وہ..... وہ خونی  
بلا..... کک..... کہاں گیا؟

وہ میرے جاپ میں رکاوٹ ڈالنے کی شیطانی  
چال تھی۔ جو تہوارے کارن سئل نہ ہو سکی۔ پرکاش نے  
مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کیا مطلب؟“ سئل نے انھیں  
آميز لہجے میں پوچھا۔

مطلب یہ کہ گھر میں موجود شیطانی ہلکتیاں نہیں  
چاہتی تھیں کہ میں سئل اور اس کے پر یوار کی جان  
بچاؤں انہیں جانکاری تھی کہ میں یہاں آنے والا ہوں  
اسی لئے انہوں نے سئل اور اس کے پر یوار پر خونی حملہ  
کر دیا اگر ہم آج یہاں نہ آتے تو یہ بات نچت تھی کہ  
سئل اور اس کے پر یوار کو جانی نقصان پہنچ سکتا تھا۔  
میں نے جاپ کیا اسی لئے ان شیطانی ہلکتیوں نے  
رکاوٹ ڈالنے کے لئے اس خونی بلے کو تہاری طرف  
بھیجا تا کہ میرا دھیان بھٹک سکے پرتو تم نے بہت ہمت  
دکھائی..... پرکاش نے سریش کو وضاحت سے سمجھاتے  
ہوئے کہا۔ ”اگر..... اگر تمہارا جاپ مکمل نہ ہوتا تو وہ  
خونی بلا آج میری ہتھیا کر کے ہی چھوڑتا سریش نے  
جھر جھری لیتے ہوئے خوف کے عالم میں کہا۔ جن کے  
ارادے نیک ہوں انہیں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ محض تمہیں  
ڈرانے کی چال تھی..... پرکاش نے مسکراتے ہوئے  
کہا۔ سریش نے بیڈ پر لیٹے سئل، راہول اور سشما پر نظر  
ڈالی تو ان کے چہروں اور ہاتھوں پر وہ خونی سوراخ نہیں  
بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ انہیں تھوڑی دیر میں ہوش  
ہو جائے گا..... پرکاش نے سریش سے مخاطب ہوتے  
ہوئے کہا۔ ”تب تک میں ایک جاپ کر لوں۔“

سریش نے سوالیہ نگاہوں سے پرکاش کی طرف  
دیکھا۔ میں چاہتا ہوں میں جب تک یہ پتہ نہ لگا لوں کہ  
آخر اس گھر میں چل کیا رہا ہے۔ میں گھر میں بھی سرکھٹا  
جاپ کر لوں تا کہ اس دوران مجھے یہ شیطانی ہلکتیاں  
تنگ نہ کریں۔ پرکاش نے بتایا تو سریش نے اثبات میں  
سر ہلادیا۔ اب پرکاش نے دوبارہ منہ میں کچھ دھنا  
شروع کر دیا وہ اپنے ہونٹ ہلاتے ہوئے پورے گھر

میں گھومنے لگا وہ جب دوبارہ اس کمرے میں آیا تو  
سئل، سشما اور راہول کو ہوش آچکا تھا۔ سشما پرکاش  
کو دیکھ کر چونکی..... آ..... آپ..... کو میں نے پہلے بھی  
کہیں دیکھا ہے۔ سشما نے ذہن پر زور دیتے ہوئے  
کہا تو پرکاش نے اسے ساری بات بتادی اور سشما کی  
ساری انجمن دور ہوئی۔ بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے جو  
میں سے پرکاش بن گیا۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ پرکاش نے  
کہا۔

پرکاش جی بھگوان کے لئے میں اس شیطانی چکر  
دیو سے بچائیے جس دن سے ہم اس کمرے میں آئے  
ہیں۔ آئے دن ہمارے ساتھ عجیب گھٹنا میں گھٹ رہی  
ہیں۔ اور اب بھی جب ان زخموں کے کارن میں بے  
ہوش ہوئی تھی تو میں نے ایک عجیب پسنا دیکھا تھا.....  
وہ..... وہ سشما کہتے کہتے رکی۔ اس کے چہرے پر  
وحشت چھائی ہوئی تھی۔ شاید ابھی بھی وہ اس خواب کے  
حصار میں تھی۔ ”کیا پسنا.....“ پرکاش نے پوچھا۔

مم..... میں..... میں گھر کے پچھواڑے بنی اس  
سنسان جگہ پر کھڑی ہوں، رونے اور چیخنے کی آوازیں  
میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ پھر میں اس جگہ زمین  
کھودنا شروع کر دیتی ہوں..... پھر..... وہ جتے کہتے  
ایک مرتبہ پھر رکی..... پھر..... پھر کیا..... پرکاش نے  
بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔ پھر میری آنکھ مکمل  
گئی۔ سشما نے مزید بتایا..... ہوں..... پرکاش نے  
ایک گہری سانس اپنے اندر جھنجھی۔ یہ پسنا نہیں سشما  
جی بلکہ ایک سندیش (پیغام) تھا..... پرکاش نے سوچ  
میں ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔ سندیش..... سشما،  
سئل اور سریش کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ جی ہاں  
سندیش..... پرکاش نے اثبات میں سر ہلادیا۔ گھر کے  
پچھواڑے میں ضرور کچھ ہے اور ہمیں ترنت وہاں دیکھنا  
چاہئے۔

وہاں کیا ہو سکتا ہے پرکاش جی..... تو کیوں  
ایک پسنا تھا..... سئل نے حیرانگی سے پرکاش کی طرف  
عجیب نظروں سے دیکھا..... لگتا ہے سئل جی ابھی بھی

آپ کو بھوت پریت اور شیطانی ہلکتیوں پر دھواں نہیں  
ہے۔ حالانکہ گھر میں ہونے والی گھٹنا میں آپ کے  
دھواں کے لئے کافی ہیں۔ پرکاش نے غصے سے منہ  
بٹایا۔ نہیں پرکاش جی میں تو بس ویسے ہی کہہ رہا تھا۔  
سئل نے شرمندہ لہجے میں کہا۔ میں نے محسوس کیا ہے۔  
اس گھر میں کافی سارے راز دفن ہیں۔ پرکاش نے کہا  
اور پھر اس خوب صورت آئینے کی طرف گھوما..... اس  
آئینے میں ضرور شیطانی ہلکتیوں کا بھیرا ہے باہر تالے  
والے کمرے میں بھی ضرور کوئی انہونی ہوئی ہے۔

یہ آپ کیسے جانتے ہیں پرکاش جی۔ سشما نے  
خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ ”یہ نتیجہ میں نے آپ لوگوں کی  
ہٹائی ہوئی باتوں سے لگایا ہے۔ کیونکہ سئل جی کے ساتھ  
اس تالے والے کمرے میں عجیب و غریب انہونی ہوئی  
اور اس آئینے میں آپ اور راہول کو لال ساڑی والی  
عورت نظر آتی جو اس تالے والے کمرے سے پہلے سئل  
جی کو نظر نہیں آئی اور پھر سئل جی کا نظر آنا حالانکہ سئل  
جی کا کہنا تھا کہ وہ اس سے واش روم میں تھے پھر اس  
آئینے پر خون کی آڑی ترچی لیکریں اور وہ کیڑے  
جنہوں نے آپ پر حملہ کیا..... اور اب آپ کا عجیب و  
غریب پسنا..... ہو نہ ہو یہ پسنا یقیناً ایک سندیش  
ہے..... پرکاش نے کہتے ہوئے اپنے آخری جملے پر  
زور دیتے ہوئے کہا.....

تو پھر دیر کا ہے کی..... ہم گھر کے پچھواڑے میں  
بنی اس سنسان جگہ پر چلتے ہیں..... سریش نے بظاہر  
شورہ دیتے ہوئے کہا۔ وہ سندیش ہمیں بلا وجہ نہیں دیا  
میرا سریش اس کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی کارن ہے.....  
ضمیر و ویسے میں ایک کام کر لوں..... اتنا کہہ کر پرکاش  
نے جیب سے اپنا موبائل نکالا اور کسی کے نمبر ڈائل  
کرنے لگا۔ پرکاش جی سر ڈائل کرتا بے کار ہے یہاں  
آج موبائل سئل نہیں آ رہے ہم بھی جب تھوڑی دیر  
پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ کر رہے تھے تو میں نے  
سوچا اب اس شہر میں سریش کے علاوہ کونسی نہیں جانتا  
اسی کارن میں نے سریش کے نمبر ڈائل کرنے کا ہے

پرتو موبائل سئل نہیں تھے۔ سئل نے بتایا تو پرکاش  
دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ سئل جی وہ بھی گھر میں  
موجود شیطانی ہلکتیوں کی کارستانی تھی میں نے اپنے  
جاپ کے ذریعے ان کی ہلکتیاں کافی حد تک کم کر دی  
ہیں۔ اب وہ ہم پر آسانی سے وار نہیں کر سکیں گی۔

☆.....☆.....☆  
پرکاش نے کہا تو سئل حیرت سے اس کا منہ کھٹکے  
لگا۔

ہیلو انسپکٹر شرما کیسے ہیں آپ..... دوسری طرف  
رابطہ ہوا تو پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہوں پرکاش تم سناؤ بڑے سے بعد یاد  
کیا..... دوسری طرف سے انسپکٹر شرما مسکراتی ہوئی آواز  
میں بولا۔ بھگوان کی کرپا سے گھر میں سب ٹھیک ہیں  
..... بولو کیسے یاد کیا..... انسپکٹر شرما نے پوچھا.....

آپ دو تین کاٹھیلو لے کر ترنت نارائن کالونی  
مکان نمبر 10 میں پہنچو..... پرکاش نے کہا..... خیریت  
تو ہے..... انسپکٹر شرما نے حیرانگی سے پوچھا۔ ایک کیس  
آپ کا ویٹ کر رہا ہے..... پرکاش نے مسکراتے ہوئے  
کہا..... اوہ..... ٹھیک ہے میں دس پندرہ منٹ میں پہنچتا  
ہوں۔ اتنا کہہ کر دوسری طرف سے انسپکٹر شرما نے رابطہ  
منقطع کر دیا..... جب تک انسپکٹر شرما یہاں تک پہنچیں  
گے تب تک ہم اس تالے والے کمرے کو دیکھ لیں  
پرکاش نے کہا اور پھر سشما نے مخاطب ہوتے ہوئے  
کہا۔ سشما جی آپ اور راہول اسی کمرے میں رہیے۔  
تب تک ہم اس تالے والے کمرے کو چیک کر لیں۔

مجھے یہاں اکیلے میں ڈر لگے گا۔ سشما نے  
کہا..... آپ جتنا مت کریں سشما جی اب آپ کو کسی  
سے بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے پورے  
گھر میں جاپ کا محاصرہ قائم کر دیا ہے اب کوئی بھی آپ  
کو ڈرائے گا نہیں..... پرکاش نے کہا تو سشما نے  
مطمئن ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔ پرکاش،  
سریش اور سئل اس کمرے سے باہر نکلے۔ اور اس تالے  
والے کمرے کی طرف بڑھے پرکاش نے چابی سے تالا



کھولا اور دروازے کی کنڈی کھولی اور دروازہ کھولا تو منی کا بھسکا سا ان کی ناک سے ٹکرایا تو وہ تینوں کھانے لگے اس سے ایک بات تو ثابت ہوئی تھی کہ یہ کمرہ کئی عرصے سے بند تھا۔ پرکاش نے دیوار پر لگے سوچ پورڈ کو ڈھونڈھا اور اس کے سارے بن آن کر دیئے کمرے کا نظارہ دیکھ کر سنبھل کر رہ گیا کیونکہ کمرے میں واقعی ٹوٹا پھوٹا سامان اور پرانا فرنیچر پڑا ہوا تھا۔ ایک اور چیز جس نے سنبھل کو مزید حیران کر دیا تھا وہ لکڑی کا گھوڑا تھا جو کمرے میں پڑا ہوا تھا اور مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ یہ..... یہ گھوڑا تو ہال میں پڑا ہوا تھا۔ سنبھل نے پرکاش کی طرف دیکھا اور کمرہ بالکل ٹھیک حالت میں تھا یہ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر بھی نہیں تھا۔ کمرے کا بلب بھی جب میں نے آن کرنا چاہا یہ نہیں چلا تھا یہ بعد میں روشن ہوا تھا۔ جب مجھے وہ لال ساڑی والی سندھ عورت اس کمرے میں نظر آئی تھی۔

سنبھل جی آپ پریشان مت ہوں۔ بھوت پریت اور آتماؤں والے گھروں میں ایسا سب کچھ چلتا ہے وہ انسان کو خوفزدہ اور پریشان کرتے ہیں تاکہ وہ خوفزدہ ہو جائیں اور انسانوں کا آسانی سے شکار کیا جاسکے۔ پرکاش نے بتایا..... شکار..... حیرت کے باعث سنبھل کے منہ سے نکلا..... جی ہاں شکار..... پرکاش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا..... اوہ..... سنبھل کے منہ سے نکلا۔ اب میں یہ پتا لگانے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کمرے میں ہوا کیا تھا۔ پرکاش نے کہا تو سربسب ہم کہہ بولا۔ اس مرتبہ تو وہ بلا ہم پر حملہ نہیں کرے گا۔

پرکاش سربسب کی پتلی حالت پر بے اختیار مسکرا دیا۔ چتا مت کرو پہلے میں نے مکمل جاچ نہیں کیا تھا۔ پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا تو سربسب نے اطمینان بھری سانس لی۔ پرکاش نے اب منہ میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ سربسب اور سنبھل کی نگاہیں اب پرکاش پر مگی ہوئی تھیں۔ پرکاش ہونٹ ہلاتے ہوئے ارد گرد بھی دیکھ رہا تھا۔

اچانک کمرے کے وسط میں رکھا ہوا صوفہ پتی جگہ سے سرکا تو پرکاش تیزی سے اس طرف بڑھا سربسب اور سنبھل بھی تیزی سے اس کی طرف لپکتے پرکاش نے اس صوفے کو اپنی جگہ سے ہٹایا اور اپنے جوتوں سے وہاں جمی مٹی مٹانے لگا۔ پھر اس نے جیب سے وہی سفید مخلول والی پٹی نکالی اور کھنوں کے بل اس جگہ پر بیٹھ گیا اور اس پٹیشی میں موجود سارا مخلول بوسیدہ فرش پر انڈیل دیا اسی وقت سربسب اور سنبھل نے حیران کن منظر دیکھا فرش پر گرے ہی وہ سفید مخلول مگرے لال رنگ میں تبدیل ہو گیا پرکاش نے تشویش بھری نظروں سے اس لال رنگ کو دیکھا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کے ہاتھ پرکاش نے اس کا ہونٹ دیکھا اور پھر اس کے ہونٹ پر تشویش کی لہر نظر آ رہی تھی۔

کیا وہ پرکاش جی..... سنبھل نے پرکاش کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس کمرے میں کسی کا خون ہوا ہے!!! پرکاش نے حیران کن بات بتائی۔ کک..... کیا..... سربسب اور سنبھل جیسے چلائے..... کک..... کس کا..... سنبھل نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں پرانا نفرم ہے کہ یہاں خون ضرور ہوا ہے۔ پرکاش نے پہلے لگی میں سر ہلایا اور پھر پنتہ لپچے میں کہا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں یہاں کس کا خون ہوا ہے۔ اچانک ان تینوں کو اپنی حقہ جی جانب سے ایک مردانہ آواز سنائی دی تو وہ تینوں تیزی سے کھوئے اور حیران رہ گئے۔ کیونکہ کمرے کے دروازے کے پاس ایک نقاب پوش کھڑا تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں دیوار اور چمک رہا تھا۔ کک..... کک..... کون ہو تم اندر کیسے آئے۔ سنبھل نے ہکلاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

اس گھر میں داخل ہونا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ نقاب پوش شوخ لہجے میں بولا۔ ”پر تو تم یہاں کیا کر رہے ہو اور تم نے اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے۔ اس مرتبہ پرکاش نے پوچھا۔ میں کون ہوں، اس کمرے میں کس کا خون ہوا ہے اور اس گھر کی کیا کہانی ہے۔ یہ تم لوگ جان ہی نہیں پاؤ گے۔ کیونکہ تم تینوں کا آتم سے

آگیا ہے۔ اس مرتبہ نقاب پوش سفاک لہجے میں بولا۔ ہم نے..... ت..... تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ سربسب نے گھبراہٹ کے باعث ہکلاتے ہوئے اس نقاب پوش سے پوچھا۔ ”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم نے اور اس پرکاش نے اس معاملے میں اپنی ٹانگ کیوں اڑائی اور یہ جو پرکاش ہے اس کا تو کام ہی یہی ہے اب تم تینوں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اتنا کہہ کر نقاب پوش نے دیوار کا رخ پرکاش کی طرف کیا۔

اسی وقت ایک مردانہ چیخ کی آواز گونجی۔ وہ چیخ کسی اور کی نہیں بلکہ اس نقاب پوش کی تھی جو لہر اکرم زمین پر جا کر اس کے پیچھے سسما ہاتھ میں بیٹ کھڑے کھڑی تھی اس کے پاس ہی راہول کھڑا تھا اسی بیٹ کی زوردار ضرب سے اس نقاب پوش کی چیخ لگی تھی جو نقاب پوش کے سر کے پچھلے حصے پر پڑا تھا۔ نقاب پوش بے ہوش ہو چکا تھا۔

دیر کی گزشتھا جی، آپ نے تو کمال کر دیا آپ تو ہمارے لئے ایک مہیا ثابت ہوئیں۔ پرکاش نے خوشی کے عالم میں سسما کی کارکردگی کو سراہا۔

وہ..... وہ میں اندر بھی جب میں نے اس نقاب پوش کی آواز سنی تھی میں اور راہول دروازے کے قریب آئے اور نقاب پوش کو دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ راہول نے کمرے میں پڑا اپنا بیٹ مجھے پڑا اور میں آہستگی سے اس نقاب پوش کے پیچھے آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ گولی چلاتا میں نے بیٹ کو اس کے سر پر زور سے دے دیا۔ سسما نے ساری بات بتائی۔ میں تو آپ کا ابھاری ہوں سسما جی۔ اگر آپ صبح سے پرندہ آتمیں تو ہمارا تو آتم سزا ہو جاتا تھا۔ سربسب نے سسما کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تو سسما بے اختیار ہنس پڑی۔ تھوڑی دیر میں انیسٹر شرا بھی دو عدد کاشیوں سمیت وہاں پہنچ گیا اسے ساری صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو وہ حیرت سے پرکاش کا منہ کھنکے لگا۔ اس نقاب پوش کو تم جانتے ہو۔

انیسٹر شرا نے پرکاش سے پوچھا۔ نقاب پوش

ابھی بھی فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ ابھی تو ہم سے کسی نے بھی اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ پرکاش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے تو پھر سب سے پہلے اس کا چہرہ دیکھ لیتے ہیں۔ انیسٹر شرا نے کہا اور اس نقاب پوش کی طرف بڑھا اور گھنٹوں کے بل بیٹھ کر انیسٹر شرا نے اس نقاب پوش کا نقاب اتارا وہاں موجود افراد کے دل کی دھڑکنیں تیزی سے دھک دھک کر رہی تھیں اور سب کی نگاہیں اس نقاب پوش کا چہرہ دیکھنے کی منتظر تھیں۔ انیسٹر شرا نے اسے سیدھا کیا۔ ارے..... حیرت کے باعث بے اختیار سنبھل اور سسما کے منہ سے نکلا۔ راہول بھی کم حیران نہیں تھا۔ آپ جانتے ہیں اسے..... پرکاش نے پوچھا۔

جی ہاں، یہی تو ہے اس گھر کا مالک منوچ!!! سنبھل حیرت سے بولا تو پرکاش اور سربسب بھی حیران رہ گئے۔ یہ آپ لوگوں کو کیوں مارنا چاہتا تھا۔ انیسٹر شرا نے حیرانگی سے پوچھا۔

پتہ نہیں۔ سنبھل نے کندھے اچکائے۔ خبر یہ ہم پتہ لگا ہی لیں گے۔ ابھی اسے اسپتال لے چلتے ہیں کیونکہ سسما جی نے اس کے سر پر بڑا زور کا حملہ کیا ہے۔ انیسٹر شرا نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ساونت تم اسے اسپتال لے جا انیسٹر شرا نے اپنے پاس کھڑے دونوں کاشیوں میں سے ایک سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو اس کا سنبھل نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ساونت کے جانے کے بعد یہ قافلہ گھر کے پچھواڑے بنی اس سنان جگہ پر آیا۔ پرکاش میرے خیال سے میڈیا والوں کو بھی بلوالینا چاہئے۔ انیسٹر شرا نے بظاہر پرکاش سے مشورہ کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ تھوڑی دیر بعد اس گھر کے باہر میڈیا والوں کی گاڑیاں پہنچ گئیں اور وہ اپنے اپنے کمرے لے کر گھر کے پچھواڑے اس جگہ پر آ گئے۔ اب وہاں کھدائی شروع ہوئی تو وہاں موجود سب افراد پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کیونکہ وہاں سے دو درجن کے قریب انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے۔



پرکاش بھی حیرت سے زمین کی مٹی سے اٹکنے والے انسانی ڈھانچوں کو دیکھ رہا تھا۔ سسٹل، سریش اور راہول کی حالت بھی کافی غیر ہورہی تھی۔ میڈیا والوں کی زبانیں بھی جیسے تالو سے چپک گئی تھیں۔ ان ڈھانچوں میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچوں کے ڈھانچے بھی شامل تھے۔ انسپکٹر شرما نے ان ڈھانچوں کو اسپتال پہنچایا۔ میڈیا والے اب انسپکٹر شرما پر ٹوٹ پڑے تھے۔ انہوں نے انسپکٹر شرما پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دیکھیے..... آپ سب شانت رہنے ہم بھی ان انسانی ڈھانچوں کی حقیقت سے زیادہ واقف نہیں ہیں۔ ہم انویسٹی گیشن کر رہے ہیں جیسے ہی ہمیں کچھ پتہ چلا ہم آپ کو انفارم کریں گے..... انسپکٹر شرما نے نیوز رپورٹروں کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ پرنٹو آپ کو یہ انفارمیشن کس نے دی کہ اس زمین کے نیچے اتنے انسانی ڈھانچے ملیں گے۔ ایک نیوز رپورٹر نے پوچھا۔ ”یہ خبر ہمیں ہمارے خبریوں نے دی تھی۔“ انسپکٹر شرما نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ اور خبریوں کے ذریعے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس گھر میں بھوت پریت اور شیطانی خلعتیوں کا بیڑہ ہے۔

کیا کہا آپ نے..... بھوت پریت اور شیطانی خلعتیاں..... ایک اور نیوز رپورٹر ہنسا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

بالکل ہو سکتا ہے۔ اس میں اچھے والی تو کوئی بات نہیں۔ اس مرتبہ پرکاش نے جواب دیا۔ آپ کی تعریف، اسی رپورٹر نے پرکاش کا نام جانا چاہا۔ ارے یہ تو پرکاش جی ہیں ان کا تو کام ہی یہی ہے بھوت پریت اور آتماؤں کے چکروں میں پھنسے لوگوں کو بچانا۔ ایک اور رپورٹر نے چیلنج کیے ہوئے کہا۔ تو اس کا مطلب یہ اسی کارن یہاں پر ہیں۔ پچھلے رپورٹر نے تصدیق چاہی۔

جی ہاں میں اسی کارن یہاں پر ہوں۔ پرکاش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ تو کیا واقعی یہاں بھوت پریت اور آتماؤں کا بیڑہ ہے۔ رپورٹر کو شاید

پرکاش کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بالکل یہ رپورٹر اس بات کا گواہ ہے کیونکہ ابھی تک انہوں نے اس گھر میں بہت سی حیران کن گھٹائیں دیکھی ہیں۔ پرکاش نے ایک طرف کھڑے سسٹل اور اس کی فیلٹی کی طرف اشارہ کیا۔ پرکاش صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں میں بھی ان باتوں پر دوشاں نہیں کرتا تھا۔ پر میرے ساتھ اور میرے رپورٹر کے ساتھ ایسی گھٹائیں تھیں جو انسانی سوچ سے پرے ہیں۔ اتنا کہ کرسٹل نے اپنے اور سسٹل کے ساتھ ہونے والے واقعات میڈیا والوں کے سامنے بیان کر دیے۔ پرکاش جی یہ بھوت پریت، آتماؤں، روہیں اور شیطانی خلعتیاں انسانوں کو تنگ کر رہی ہیں۔

دیکھئے ہر ایکشن کا ری ایکشن ہوتا ہے۔ اسی طرح بھوت پریت آتماؤں کسی کو بلا وجہ تنگ نہیں کرتیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی کارن ہوتا ہے، کوئی ایسا ادھورا کام ہوتا ہے جو وہ اپنے جنوں میں پورا نہ کر سکے ہوں۔ کوئی انتقام لینا ہوتا ہے۔ ایسے ہی کارن ہوتے ہیں۔ پرنٹو بلا وجہ یہ آتماؤں تنگ نہیں کرتیں۔ پرکاش نے بتایا تو گھر میں ان کے ہونے کا کیا کارن ہے۔ رپورٹروں نے پوچھا۔ ابھی تک اس معاملے میں ہم اندھیرے میں ہیں۔ پرنٹو ہم بہت جلد پتا لگائیں گے۔ پرکاش نے کہا۔ کیا ہم وہ آئینہ دیکھ سکتے ہیں جس میں وہ لال ساڑی والی سندھ عورت نظر آتی ہے۔ اور خون کی آڑی ترچھی لکیریں بھی نظر آتی تھیں۔ رپورٹروں میں سے ایک نے کہا۔ ”ہیں“ پرکاش نے مسکراتے ہوئے کہا تو یہ قافلہ وہاں سے چلنے کے لئے تیار ہونے لگا۔

☆.....☆.....☆

نیوز رپورٹروں اور انسپکٹر شرما کے بعد پرکاش کے موبائل کی بیل بجی۔ پرکاش نے فیس کا بٹن پریس کر کے موبائل کان سے لگایا۔ جیلو..... پپ..... پرکاش جی بول رہے ہیں..... دوسری طرف سے ایک نسوانی گھبراہٹ ہوئی آواز پرکاش کے کانوں میں پڑی۔ جی بول رہا ہوں..... پرکاش نے حیرانگی سے کہا۔

پپ..... پرکاش جی..... ج..... جلدی یہاں پہنچئے..... نن..... نہیں تو وہ میرے رپورٹر کو ختم کر دیں گے۔ دوسری طرف موجود عورت کی روتی ہوئی آواز پرکاش کے کانوں میں پڑی۔ دیکھئے تھوڑا شانت رہے اور ذرا دھیرج سے مجھے بتائیے کہ کیا سسٹل ہے۔ پرکاش نے عورت کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

وہ..... وہ ہم اس گھر میں آج ہی شفٹ ہوئے تھے ابھی رات کے سے میری آنکھ کھلی تو گھر میں بار بار قہقہوں کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے اپنے بچے کی طرف دیکھا تو وہ بیڈ پر موجود نہیں تھے..... مم..... میں کمرے سے باہر نکل کر میرے بچے کی لاش باہر پڑی ہوئی تھی!!! عورت نے حیران کن بات بتائی..... رخ..... خنجر ان کے سینے میں گھونپ دیا گیا تھا اور ان کے ارد گرد خون جمع تھا۔ مم میں روتی ہوئی ان کے پاس بیٹھی..... مم..... میری تو دنیا ہی اجڑ چکی تھی..... اچانک میرے بچے کے شریر میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں چیخنے ہوئی چیخے ہوئی پوچھ رہی تھی کہ وہ بچہ جو کوئی بھی تھے نظر نہیں آ رہے تھے اور میری حالت پر قہقہے لگا رہے تھے۔ آپ..... آپ بس یہاں ترنت پہنچ جائیں وہ قہقہے مجھے بار بار تنگ کر رہے ہیں اور میرے بچے کی چٹا کی راہ گئی نہیں میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اتنا کہہ کر اس عورت نے اپنا ایڈریس بتا دیا۔ آپ چقا مت کر س میں ترنت پہنچتا ہوں۔ آپ قریبی پولیس اسٹیشن میں بھی انفارم کر دیجئے..... پرکاش نے اس عورت کو تاکید کرتے ہوئے کہا..... وہ..... وہ میں نے کر دی ہے..... پولیس یہاں کسی بھی سے پہنچنے والی ہے..... عورت نے کہا تو پرکاش نے OK کہتے ہوئے موبائل کان سے ہٹا لیا۔ سسٹل جی ہمیں ترنت وہاں پہنچنا ہوگا۔ پرکاش نے سسٹل کو اپنی مجبوری بتاتے ہوئے کہا۔

پپ..... پرنٹو پرکاش جی یہاں اگر کچھ اتھو گیا تو..... سسٹل نے پریشان کن لہجے میں کہا۔ آپ چقا مت کر سسٹل جی وہاں جانا بھی میری مجبوری ہے..... آدھا کام تو یہاں کاپلیٹ ہو چکا ہے۔ آدھا کام میں

واپسی پر کردوں گا۔ آپ میرے ساتھ آئیے..... پرکاش نے سسٹل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور پھر سریش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تم بھی میرے ساتھ آؤ۔

سریش نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ تینوں کمرے سے باہر نکل آئے باہر رات کے سائے ابھی بھی گہرے تھے۔ پرکاش نے باہر نکل کر سسٹل کو ایک طرف جا کر کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

ادھر سسٹل نے راہول کو بیڈ پر لٹایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گئی اچانک اس کی نظر کمرے میں لگے آئینے پر پڑی تو وہ چونکی کیونکہ آئینے میں وہی لال ساڑی والی سندھ عورت سسٹل کو اگلی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ تم سب نے میرا کام خراب کر دیا۔ وہ لال ساڑی والی عورت نفرت سے بولی۔ سسٹل اہم جمع کرتے ہوئے بیڈ سے نیچے اتری..... مم..... مم..... مم..... کہاں جا رہی ہیں..... راہول نے ڈرتے ہوئے پہلے آئینے میں نظر آنے والی عورت اور پھر سسٹل سے کہا۔ مگر سسٹل بنا کوئی جواب دیے بغیر اس آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

گگ..... کون ہو تم اور اس طرح ہمیں تنگ کیوں کر رہی ہو..... سسٹل نے اپنی ہمت جمع کرتے ہوئے اس لال ساڑی والی عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا..... تنگ تو تم لوگوں نے مجھے اب کیا ہے..... اور میں تم سب کو اس کی سزاؤں کی..... اس عورت نے غصے سے سسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے تمہیں کوئی تنگ نہیں کیا بلکہ تم ہمیں پچھلے کئی دنوں سے تنگ کر رہی ہو..... تن..... تن..... تم میرے گھر سے چلی کیوں نہیں جاتی۔ سسٹل جی سے مشابہ لہجے میں بولی۔

تمہارا گھر..... وہ عورت طنزیہ لہجے میں بولی ساتھ ہی وہ قہقہے لگانے لگی۔ تمہارا نہیں ہے میرا گھر ہے اور تم یہاں میری مرضی سے آئی ہو۔ تم ہی نہیں بلکہ تمہارا بچہ اور یہ بیٹا بھی پرنٹو تم لوگوں نے اس پرکاش کو یہاں



بلا کر بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ میں تم لوگوں کو اس کی سزا دوں گی۔

لال ساڑی والی عورت نے اپنا ہاتھ سسما کی طرف کیا تو سسما چیختی ہوئی اچھلی اور کمرے کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ مم۔ مم۔ مم۔ راہول نے گھبرائے ہوئے سسما کو پکارا وہ بیڈ سے نیچے اتر اور زمین پر گری سسما کی طرف بھاگا۔ آئینے میں نظر آنے والی وہ عورت غائب ہو چکی تھی اور سسما بے ہوش ہو چکی تھی۔ مم۔ مم۔ مم۔ کیا ہوا آپ کو۔۔۔۔۔ راہول نے سسما کو بازوؤں سے پکڑ کر ہلایا مگر بے سود اس وقت سسنا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ موجودہ چوہن پر حیران ہوا۔ اور تیزی سے سسما کی طرف بڑھا۔ راہول بیٹا کیا ہوا تمہاری مم کو۔ سسنا نے پریشان کن لہجے میں راہول سے پوچھا تو راہول نے اسے کمرے میں ہونے والی گزشتہ لمحے پہلے ہونے والی صورتحال سے آگاہ کیا۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ پریشانی کے باعث سسنا نے منہ سے نکالا۔ لگتا ہے پرکاش جی کے کئے گئے جاپ کا اثر ختم ہو چکا ہے۔

پپ۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ بابا آپ پرکاش افضل کو فون کریں۔۔۔۔۔ راہول نے سسنا کو مشورہ دیا۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ پرنتو بیٹا وہ تو کافی دور نکل چکے ہوں گے۔ سسنا نے راہول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پہلے ہم تمہاری مم کو تو ہوش میں لائیں۔

سسنا نے سسما کو کندھے سے پکڑ کر زور سے ہلایا تو سسما کے جسم میں ہلکی سی ہلچلی پیدا ہوئی پھر اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں راہول اور سسنا سسما کی آنکھیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سسما کی آنکھیں خون کی طرح سرخ تھیں۔ وہ یکدم اٹھ کر بیٹھی۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی سسما کی آواز میں عجیب سی خراہٹ شامل تھی۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔۔۔ راہول سسما کی طرف بڑھا۔ سسما نے نفرت زدہ نگاہوں سے راہول کی طرف دیکھا اور اسے زوردار دھکا دیا۔ راہول چیختا ہوا اڑ کر بیڈ پر جا گرا۔ سسما یہ کیا کر رہی ہو

دیل ڈن سسنا جی آپ نے بہت اچھا کام کیا۔۔۔۔۔ پرکاش نے مسکراتے ہوئے سسنا کو داد دیتے ہوئے کہا۔ سفید کمر کی لہروں میں جکڑی اس عورت نے ابھن آمیز نگاہوں سے پہلے سسنا اور پھر پرکاش کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ آپ کی حیرت ہم دور کئے دیتے ہیں وٹ آتما جی۔۔۔۔۔ دراصل میں نے خود ہی اس گھر سے مرگھٹ جاپ ختم کیا تھا تاکہ تم میری نظروں کے سامنے آؤ۔ جاپ ختم ہوتے ہی تم نے پہلا چیترا آرمایا اور میرے موبائل پر فیک کال کی۔ میں اسی سے سمجھ گیا تھا کہ یہ تمہاری چال ہے تم میرا ذہن نہ بڑھ سکواں کارن میں نے اپنے اوپر ستر بڑھایا تھا اور تم بھی کہ میں تمہارے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہوں۔ پرنتو میں تم میرے جال میں پھنسی ہو۔ میں نے گھر سے باہر پلٹے ہی سسنا کو یہ پارہ دے دیا تھا۔ جس کا انہوں نے بہت اچھا طریقے سے استعمال کیا اور بہت اچھے سے پر گیا۔ اب تم اس قید سے تباہی رہا ہو سکتی ہو جب تک یہ نہیں بتاؤ گی کہ آخر اس گھر میں چل کیا رہا ہے۔۔۔۔۔ پرکاش نے فاتحانہ لہجے میں بتاتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ لال ساڑی والی عورت غصے سے چیختی۔۔۔۔۔

یہ دھمکیاں بعد میں دینا پہلے ساری بات بتاؤ نہ میں تمہیں جلا کر بھسم کر دوں گا۔۔۔۔۔ اور یہ مت سمجھنا کہ یہ دھمکی ہے۔ میری شکلیوں کی جانکاری تو نہیں ہے۔ اس لئے کسی مینڈ کی طرح چھد کنا بند کرو اور ہمیں سب کچھ بتاؤ۔ پرکاش اس مرتبہ بنجیدہ لہجے میں بولا۔

اس گھر میں ہونے والی گھٹناؤں اور ہتھیاروں کا کارن منوج ہے۔ جو اصل میں میرا بیٹی تھا!!! لال ساڑی والی عورت نے عجیب انکشاف کیا۔۔۔۔۔

مم۔۔۔۔۔ منوج تمہارا بیٹی۔۔۔۔۔ حیرت کے باعث سسنا کے منہ سے نکلا۔

نے دولت کی خاطر مجھ سے شادی کی تھی۔ پر یہ حقیقت مجھ پر بعد میں کھلی تھی۔ اور یہ بھی کہ وہ ایک شرابی بھی ہے۔ شادی کے کچھ مہینے تو وہ میرے ساتھ ٹھیک رہا پھر اس کا راز مجھ پر کھلنے لگا کہ وہ شرابی ہونے کے ساتھ ساتھ کوشوں پر بھی جاتا تھا میں نے اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی۔ پرنتو وہ نہیں مانا اور اوپر سے مجھے مارتا بھی تھا۔ میں کب تک برداشت کرتی۔ میں نے تھک ہار کر اسے پیسے دینا بند کر دیئے اور آفس میں بھی کہہ دیا کہ وہ منوج کو کوئی پیسہ نہ دیں۔ جب ہر طرف سے پیسوں کی برسات بند ہوئی تو وہ میرے سامنے گڑگڑانے لگا۔ پرنتو میں نہیں مانی اور اس نے تمام برے کاموں سے توبہ کر لی۔۔۔۔۔ پرنتو یہ میرا بھرم تھا وہ صرف مجھے بے وقوف بنارہا تھا وہ تو کسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس کے اچھے برتاؤ کے کارن میں نے اسے دوبارہ پیسے دینا شروع کر دیئے تھے۔

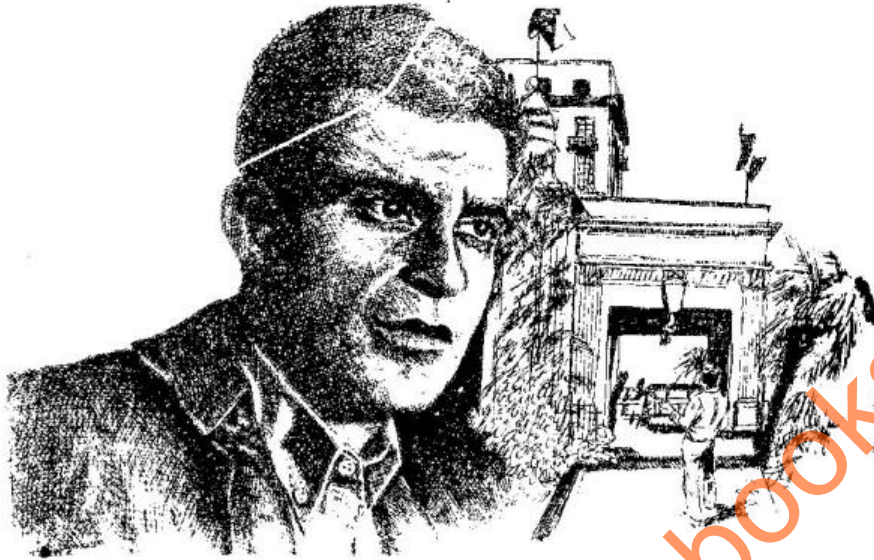
اور پھر ایک دن اس نے پکا پلان بنایا میری مرتیو کا۔۔۔۔۔ اس نے اس تالے والے کمرے میں میری ہتھیا کی۔ اب سسما میرے شریر کو چھپانے کی تھی۔ اس کا اپائے بھی اس نے نکال لیا۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ لال ساڑی والی عورت رکی۔

کیا اپائے نکالا منوج نے۔۔۔۔۔ پرکاش نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

اس نے اسی کمرے کے دو حصے بنائے جہاں تم سب لوگ کھڑے ہو۔ اس لال ساڑی والی عورت نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔ پرکاش نے حیرانگی سے پوچھا۔ اس نے اس کمرے میں میرے شریر کو رکھا اور درمیان میں دیوار بنا کر اس پر بڑا سا آئینہ لگا دیا۔ میرا اس دنیا میں منوج کے علاوہ کوئی نہیں تھا اس لئے کسی نے بھی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کی۔ میری آتما اب منوج کے خون کی پیاسی تھی۔

ایک رات منوج نشے کی حالت میں ایک لڑکی کو اس گھر میں لے کر آیا تو میں نے اپنا آپ اس پر غاہر کر دیا وہ مجھے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران اور





ان کا کیا ان کے سامنے آ گیا تھا، لیکن میری زندگی تو ختم ہو گئی تھی جو چاہ کر بھی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ شاید میری کہانی سے لوگ کچھ سبق حاصل کریں اور حسد کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔

ہم کو تنگ کرتی تھیں مگر میرے والدین نے ہمیشہ انہیں بڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ شیم پھپھو کی ایک بی بی تھی ”شازینہ“ اور وہ اپنی والدہ سے چار ہاتھ آگے تھی۔ عمر میں تو وہ مجھ سے سات آٹھ سال بڑی تھی مگر سب کو میرے جتنا جانتی تھی۔ شیم پھپھو اور شازینہ ہر وقت مجھے نچا دکھانے کے چکر میں پڑی رہتی تھیں اور اگر بات صرف اتنی ہی ہوتی تو شاید آج میں یہ سب نہ لکھتی۔

بیان دنوں کی بات ہے جب میں کالج کے آخری سال میں تھی اور اسی زمانے میں ہمارے دادا ابو کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب ان کی وصیت

**7 جولائی** میری زندگی میں بہت ہی اہم ناقابل فراموش تاریخ ہے اور آج بھی 7 جولائی ہے اس کے آتے ہی میری آنکھوں سے برسات شروع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ حسد انسان کو تباہ کر دیتا ہے اور اس کی آگ میں جلنے والا انسان کہیں کہیں رہتا اور اس کے ساتھ وہ بھی جو حد کا شکار ہوا ہو اور حسد کی جیتی جاگتی مثال میں خود ہوں۔ میرے والد صاحب کا نام مرتضیٰ ہے اور شیم پھپھو میرے والد کی بڑی بہن تھیں مگر ان میں بڑی بہنوں والی کوئی کمی بات نہیں تھی اور نہ ہی کبھی انہوں نے بڑے پن کا مظاہرہ کیا ان کا رویہ اللہ جانے کیوں ہم سے ایسا تھا وہ ہر بات کو زانی کار تک نہ کر

خوفزدہ ہو گیا۔ سس..... سادھنا..... تھیں تو میں نے مار دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر لرزتی ہوئی آواز میں بولا.....

ہاں..... تم نے کیا سمجھا تم میرا اثر ختم کر کے بچ جاؤ گے..... پرتو میری آتما اب تمہارے خون کی پیاسی ہے۔ جسے اب تم بھی ختم نہیں کر سکتے۔ میں زہریلے لہجے میں بولی ساتھ ہی میں نے اس کے ساتھ آئی لڑکی پر حملہ کر دیا اور اپنے نوکیلے دانت اس لڑکی کی گردن میں گاڑ دیئے۔ میری آتما کو انسانی خون بہت اچھا لگا۔ اب منوج کی باری تھی۔ دیکھو سس..... سادھنا بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ مم..... مجھے معاف کر دو۔ منوج گڑ گڑاتے ہوئے بولا۔

ایک شرط پر میں تمہیں زندہ چھوڑ سکتی ہوں۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ منوج تیزی سے رضامند ہوتے ہوئے بولا۔ تم اس مکان میں میرے لئے انسانی خون کا پر بند کرو گے۔ میں نے اپنی شرط بتائی۔

کیا مطلب، منوج شاید سمجھا نہیں تھا۔ تم اس گھر کو کرایہ کے لئے رکھو اور کسی فیلیوں کا ڈھونڈ و جن کا آگے پیچھے کوئی نہ ہو..... میں ان فیلیوں کا خون پیوں گی اور بدلے میں تمہاری جان بخش دوں گی۔ میں نے اسے سمجھا تو وہ مان گیا اب وہ ایسا ہی کرتا ایک چھوٹی سی فیملی کو ڈھونڈتا جس میں صرف تین چار ممبر ہوتے اور ان کے علاوہ ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔

پہلے میں ان کو تنگ کرتی جس سے مجھے بہت مزہ آتا اور جب میرا بچہ بھر جاتا تو میں ان کی ہتھیا کر کے ان کا خون پی لیتی اور فیلیوں کی لاشیں منوج گھر کے پچھواڑے اس ویران جگہ پر دفن دیتا..... سنیل اور اس کا پر پور بھی اب میرا شکار بننے لگا تھا۔ پرتو تم نے آکر سارا کام خراب کر دیا۔ میرا کوئی بھی



سامنے آئی۔ تو اس میں دادا نے اپنا گھر شیم پھوس کو اور ساری زمینیں میرے والد صاحب کے نام کر دی تھیں۔ ابو چونکہ سمجھدار تھے لہذا انہوں نے زمینوں کا استعمال صحیح انداز میں کیا اور یوں ہمارا شمار ٹھیک ٹھاک حیثیت والے لوگوں میں ہونے لگا۔ اس بات پر بھی پھوس نے خاندان میں ہنگامہ کھڑا کیا کہ دادا ابونے ان کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا حالانکہ جو مکان ملا تھا اس کی آدمی قیمت اچھی خاصی تھی مگر ان کا رد نام نہ نہیں ہوتا تھا۔

گرمیوں کی چٹھیاں ہوئیں تو ہم نے ابو سے ضد کی کہ لاہور خالہ کے ہاں چلتے ہیں اور پھر ہم سب گھر والے لاہور اپنی خالہ کے ہاں چلے گئے۔ دو چار روز بعد پتہ چلا کہ ”شازینہ“ کے رشتے کی بات چل رہی ہے پھوس سے دیے بھی زیادہ ملنا چلتا تو نہ تھا مگر ابو کو افسوس ضرور ہوا کہ سبکی بہن نے انہیں بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ خیر ہماری چٹھیاں تو خوب مزے سے گزریں اور پھر ہم چٹھیاں مناکے واپس گھر آ گئے۔ جس روز ہم واپس آئے اس کے اگلے ہی دن پھوس اپنی بیٹی کے رشتے کی خبر سنانے ہمارے گھر آئیں۔ خبر کیا تھی بلکہ اپنا رعب بھانے آئی تھیں اور آتے ہی بڑے غور سے بولیں۔ ”میری بیٹی کا رشتہ تو اس کی شان کے مطابق ہے لڑکا باہر گیا ہوا ہے اور خاندان بھی امیر ہے انہوں نے تو دیکھتے ہی شازینہ کے لئے ہاں کر دی۔“

اور پھر تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ابو بولے۔ ”ارے میں تو بتانا ہی بھول گیا تو اگر کو باسط صاحب کے گھر پارٹی میں جانا ہے ان کا بیٹا ”عمیر“ باہر سے آ رہا ہے باسط اکل ابو کے کافی پرانے دوست تھے مگر کبھی ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اتوار کو سب جانے کی تیاری کر رہے تھے، میں بھی اپنی الماری کھول کر کپڑے دیکھنے لگی کہ کیا پہنوں پھر میری نظر اپنے پسندیدہ بلیک سوٹ پر ٹھہر گئی اور میں نے وہ نکالا اور تیار ہونے لگی۔ جب تیار ہو کر میں نیچے آئی تو میری چھوٹی بہن ندا مجھے دیکھ کر بولی۔ ”ماشاء اللہ! آپ تو اس بلیک سوٹ میں قیامت لگ رہی ہیں۔“

”بس چپ کر دو تم زیادہ بولنا ٹھیک نہیں، چلو! دیر ہو رہی ہے۔“ پارٹی میں پہنچ کر ہماری ملاقات پہلی دفعہ باسط اکل اور ان کی فیملی سے ہوئی، بہت ہی خوش اخلاق لوگ تھے۔ باسط اکل، ان کی بیگم، چھوٹا بیٹا جو ابھی پڑھ رہا تھا اور بڑے بیٹے عمیر جس کے آنے کی خوشی میں پارٹی تھی پارٹی بہت شاندار تھی کیونکہ باسط اکل کو روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی ان کا ٹرانسزین کا بہت بڑا برس تھا جو کہ کافی بڑے پیانے پر پھیلا ہوا تھا۔ پارٹی میں، میں نے محسوس کیا کہ عمیر کا جھکاؤ میری طرف زیادہ ہی درہا تھا اس روز پارٹی میں کافی مزہ بھی آیا۔

کچھ دنوں بعد میرے امتحان بھی ختم ہو گئے تو ہم دوستوں نے ناٹم پاس کرنے کے لئے مختلف کورسز کرنے شروع کر دیئے کہتے ہیں کہ کوئی چیز بیکار نہیں ہوتی اور ابھی کورسز کی وجہ سے آج میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ خیر میں روز سینئر جاتی اور شام تک واپسی ہوتی تھی۔

ایک روز میں واپس آئی تو باسط اکل اور ان کی بیگم آئے ہوئے تھے میں اپنی بیگم کے رکن کے پاس چلی گئی اور پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب وہ چلے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ میرے لئے عمیر کا رشتہ لے کر آئے تھے اور پھر ابو اور باسط اکل نے رشتہ طے کر کے دوستی کو رشتے داری میں بدل دیا اور پورے خاندان اور دوستوں میں مٹھائیاں بھیجی گئیں۔ اس بات کے اگلے ہی دن شیم پھوس پھر ہمارے گھر آئیں اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور ہمیں لگیں۔ ”میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ میری بیٹی کی خوشیاں کسی سے ہٹ سکتی ہیں گی۔“ ابو بولے۔ ”آپا جان بات کیا ہے؟“ پھوس بولیں۔ ”اتنے معصوم نہ ہو! میری بیٹی کی خوشیوں کو آگ لگا کر پوچھتے ہو کیا بات ہے؟“

اب تو ابھی غصے میں آ گئے اور بولے۔ ”صاف صاف بتائیں کیا ہوا؟“ تو شیم پھوس بولیں۔ جو رشتہ شازینہ سے طے ہو چکا تھا اس کو تو ترک کرنے اپنی بیٹی حیا کا رشتہ طے کر دیا۔“

یہ سن کر ابو سکتے میں آ گئے پھر رک کر انہوں نے باسط اکل کو فون کر کے بلایا تو وہ فوراً اپنی بیگم کے ساتھ آئے ان کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں انہیں دیکھ کر پھوس چونک گئیں پھر وہ خاتون بولیں۔ ”شیم اس عمر میں ہجرت بولتی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی!“ پھر سب کو مخاطب کر کے بولیں۔ ”میں رشتے کرواتی ہوں باسط صاحب کے گھر میرا آنا جانا ہے۔ ان کی بیگم نے مجھ سے کہا تھا کہ عمیر کے لئے کوئی لڑکی ہو تو بتانا مگر ہاں جب ہی ہوگی جب عمیر کو لڑکی پسند آجائے۔ میں نے شازینہ کی تصویر انہیں دے دی مگر عمیر کو تصویر دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی پارٹی میں عمیر کو حیا پسند آ گئی اور وہ تصویر جوں کی توں واپس آ گئی۔ یہ سن کر پھوس ایک منٹ بھی نہ رہیں۔

ایک مہینہ بعد کی شادی کی 7 تاریخ طے ہوئی اور گھر میں تیاریاں شروع ہو گئیں۔ شادی سے چند روز پہلے اجا تک شیم پھوس اور شازینہ اپنا سامان لے کر ہمارے گھر آئیں ابو سمجھے پھر کوئی تماشا ہوگا مگر اس کے برعکس بات چیت اور ان کی پھوس روتے ہوئے ابو سے بولیں۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں اپنے کئے پر، اس روز وہ ہوا فلفلی کی وجہ سے ہوا تھا، مجھے معاف کر دو!“ ابو بولے۔ ”نہیں آج اب مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔“ اور بات ختم ہوئی، کم از کم میرے گھر والوں کے لئے بات ختم ہوئی تھی۔

مگر یہ تو ایک نہ تھنے والے طوفان کی ابتداء تھی اس کے بعد سے شازینہ کا رویہ ہی بدل گیا تھا اور وہ میرے غریب رہنے لگی تھی بلکہ اس نے تو مجھ سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ پھر شادی کا دن بھی آن پہنچا۔ اس روز دو پہر کو میں نہانے کمرے میں آرام کر رہی تھی کہ میری آنکھ لگ گئی اور بینہ میں مجھے لگا کہ کوئی میرے اوپر جھکا ہوا ہے پھر تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی مگر سکرہ خالی تھا۔

میری شادی کا جوڑا بہت ہی خوبصورت تھا۔ مگر سہ سرخ رنگ کا اور اس پر زری سے ماتھ کا کام کیا گیا تھا جب میں دلہن بن کر سب کے سامنے آئی تو

سب میری بلائیں لینے لگے۔ عمیر کے گھر والوں نے شادی پر دل کھول کر ارمان نکالے اور اتنا خرچ کیا کہ باہر کے لوگ بھی ایک دوسرے سے ذکر کرنے لگے اور یہاں بھی پھوس اور شازینہ دل ہی دل میں جل رہی تھیں مگر ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔ شادی کے بعد جب میں گھر آئی تو شازینہ نے مجھ سے کہا۔ ”حیا کیا میں تمہارے چند سوٹ لے سکتی ہوں، یہ مجھے بہت پسند آئے ہیں اور اب تو تم انہیں پہنوں گی بھی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے میں بہن ہوں تمہاری۔“ اور وہ مسکراتے لگی اور یوں میں نے خود اپنے پیروں پر کھلادی دے ماری۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ کس ارادے سے میرے کپڑے مانگ رہی تھی۔ شادی کے بعد چند مہینے تو ایسے گزرے۔ لیکن اس کے بعد پہلا جھکا ہمیں میرے سر کی موت کا لگا۔ اس روز رات کے کھانے پر وہ بالکل ٹھیک تھے مگر رات کو اجا تک وہ زور سے چنچنے لگے اور اپنا دل پکڑ کر کہنے لگے۔ ”وہ میرا دل بھیج رہا ہے۔“ وہ درد سے تڑپتے رہے اور پھر مرج کے وقت وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ڈاکٹروں کے مطابق ان کا دل اجا تک بند ہو گیا تھا معاملہ کیا تھا کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا، جہاں ہم ان کی اجا تک موت سے بے حال تھے، اس کے ساتھ اس کا اشریدہا برنس پر پڑا کیونکہ عمیر تو ابھی باہر سے پڑھ کر آئے تھے اور انہوں نے برنس جوائن بھی نہیں کیا تھا اور راتیں وہ تو ابھی پڑھ ہی رہا تھا۔

عمیر کی کوششوں کے باوجود نقصان پر نقصان ہونے لگا۔ ساتھ ہی شاطر کاروباری حریف جو کہ شاید اسی دن کی تباہی میں تھے، ان کے حربوں سے آدھا برس ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا جو کچھ بچا تھا اسے عمیر کسی طرح دیکھ رہے تھے۔ ابھی میرے سر کے انتقال کو سال بھی نہ گزرا تھا کہ ایک روز میری ساس نہا نے غسل خانے میں گئیں اور کافی دیر کے بعد بھی باہر نہ آئیں تو میں نے آوازیں دیں مگر اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے دروازے کو زور سے پینا اور کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر



سے لاک تھا پھر پڑوسیوں کی مدد سے دروازہ توڑا گیا اور میں اندر گئی تو دیکھا۔ ”میری ساس واپار کے سہارے بیٹھی تھیں اور ان کے بال ”تل“ میں الجھے ہوئے تھے اور انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلہ دیا ہوا تھا، انگلیاں جیسے گلے میں پیوست تھیں اور دونوں آنکھیں باہر کواہلی پڑی تھیں۔“ یہ سب دیکھ کر میں بے ہوش ہو گئی۔

مجھے جب ہوش آیا تو گھر کی فضا عجیب تھی سب ایک دوسرے کے چہرے تک رہے تھے۔ ایک سال میں یہ دوسرا جھگڑا تھا ہمارے لئے ادھر بزنس میں بھی یکے بعد دیگرے نقصان ہوتا جا رہا تھا ابھی ہم سمجھتے بھی نہ تھے کہ چند دن بعد ایک اور جھگڑا ہمارے لئے تیار تھا میرے ایک بہت بڑی بلڈنگ کی کنسٹرکشن کروائی تھی اور اسے بنے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا کہ وہ پوری کی پوری بلڈنگ زمین بوس ہو گئی۔ میرے کو تو ہوش ہی نہ تھا کیونکہ انہوں نے پوری ذمہ داری سے اپنا کام کیا تھا ان کے سارے انجینئرز اور ورکرز بھی حیران تھے مگر اس حادثے کے بعد ہمارا ہا سہا بزنس بھی بیٹھ گیا اور ہم سڑکوں پر آ گئے۔ اس مشکل وقت میں میرے دوستوں نے ہمارا ہا ساتھ دیا اور کسی نہ کسی طرح راجیل کو ملک سے باہر بھیج دیا اور اس لئے وہ شاید بچ گیا کیونکہ وہ یہاں نہ تھا۔ اس سارے معاملے میں ہمارا گھر بھی بک گیا گھر کی رقم میں سے تھوڑی راجیل کے باہر جانے میں لگی کچھ رقم لوگوں کی مدد سے مل گئی اور تھوڑی جو باقی بچی اس کا ایڈوانس دے کر ہم نے ایک چھوٹا سالیٹ کرائے پر لے لیا۔

اس دور میں میرے میرے میکے والوں کی مدد لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ادھر شیم پھونے شانیزہ کی شادی ایک بہت بڑے بزنس مین سے طے کر دی اور لوگوں سے کہنے لگیں۔ ”اچھا ہوا کہ اس جگہ شانیزہ کا رشتہ نہ ہو ورنہ آج حیا کی جگہ شانیزہ ہوتی۔“ مگر ہم نے نظر انداز کر دیا۔ شادی کا کارڈ دیکھ کر میرے چونک کر بولے۔ ”اس آدمی کی شہرت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہاری پھوپھو بہت بڑی غلطی کرنے جا رہی ہیں۔“ اور جب یہ بات پھوپھو اور شانیزہ کو بتائی تو وہ بولیں۔ ”ہمیں

معلوم ہے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ اور چند روز بعد شانیزہ کی شادی ہو گئی لیکن میرے اور میں اس شادی میں نہ گئے۔ اللہ اللہ کہ اب دن خیریت سے گزر رہے تھے میری تعلیم کی وجہ سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انہیں چاہل تھی۔ ہم بھی اپنے اس گھر میں سیٹ بھی نہ ہو پائے تھے کہ یہاں بھی جیب و خرب و واقعات ہونے لگے۔ ایک دن میں اور میرے جیب کھانا کھانے بیٹھے تو ایک دم لائٹ چلی گئی میں موم بتی لینے پکڑ میں تھی تو وہاں چپ چپ کی آوازیں آ رہی تھیں میں نے جلدی سے موم بتی جلائی تو دیکھا دودھ کا برتن زمین پر الٹا ہوا ہے اور ایک کالا بلا دودھ چاٹ رہا ہے میں نے ایک لکڑی اٹھا کر زور سے بٹے کو مارنا چاہی تو پیچھے سے میرے آگے اور بولے۔ ”کیا ہوا؟“

میں نے کہا۔ ”یہ“ اور مڑی تو پشت پر میرے موجود نہیں تھے اور دودھ ابھی جگہ اوپر رکھا ہوا تھا۔ اسنے میں لائٹ آگئی اور ہم کھانا کھانے لگے پھر ایک روز میں الماری میں دھلے ہوئے کپڑے دکھ رہی تھی کہ جیسے ہی میں نے الماری کھولی انتہائی لذتی بدبو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں ناک پر دوپٹہ رکھ کر الماری میں دیکھنے لگی پھر دوسری سائیڈ کا دروازہ کھولا تو دیکھا۔ ”میری شادی کے نئے کپڑے غلاظت سے بھرے ہوئے تھے۔ میں کبھی یہ وہی بلا ہو گا جو کد آنکھ بچا کر اس نے یہ کر دیا۔ پھر میں نے بڑی مشکوں سے سارے کپڑے نکالے اور انہیں گرم پانی سے دھوئے لگی مگر بدبو بھی کہ جا کر نہیں دیتی تھی، پھر ان کپڑوں کو سکھا کر بھی چپک کیا مگر بدبو پھر بھی نہیں گئی۔ میں ان کپڑوں کو رسی پر چھوڑ کر واپس آ گئی جب میرے آئے تو میں نے انہیں ساری حقیقت بتائی اور جب کپڑے دکھائے جا رہے تو سارے کپڑے غائب تھے سارا گھر چھان مارا مگر کپڑے نہ ملے اور جب الماری کھولی تو سارے کپڑے الماری میں جوں کے توں موجود تھے اور کپڑوں سے نہ کوئی بدبو آ رہی تھی یہ دیکھ کر میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئی۔ میرے بولے۔ ”ہم اتنے پریشان ہیں اس لئے تم کو ایسی چیزیں لگ رہی ہیں۔“

دو روز بعد میں کپڑے دھو رہی تھی کہ مجھے اپنے ہاتھ پر کبھی محسوس ہوئی، میں نے دیکھا وہاں سرخ چوٹی نظر آئی تو میں نے اسے جھٹک دیا اور جگہ میں چلی گئی۔ وہاں میں نے دیکھا کہ آٹے کے ڈبے کے پیچھے بے شمار چوٹیاں کھل رہی تھیں، میں انہیں صاف کر کے کام میں لگ گئی لیکن میں جب اگلی صبح سوکر اٹھی تو میرے کو دیکھتے ہی میری چیخ نکل گئی کیونکہ ان کا پورا منہ سو جا ہوا تھا اور آنکھوں کے اوپر تو سوچ کر کبھی جیسی بن گئی تھی پھر ہم نے گھر کا سارا سامان باہر نکالا اور پورے گھر کو دھو کر اس پرے کر دیا اور ہر چیز کو صاف کر کے واپس اندر آ گئے اتنا کام تھا کہ اندر آتے ہی ہم بستر پر گر کر سو گئے۔

اگلی صبح جب میں اٹھی تو میری آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں اور جب میں نے کوشش کی تو تکلیف ہونے لگی میں نے آنکھیں میں دیکھا تو میری روح فنا ہو گئی کیونکہ میرا منہ سوچ کر غبار سے جیسا بھرا ہوا تھا اور میں چیختی ہوئی باہر نکل آئی پھر میرے کہنے پر میں واپس اندر آئی تو وہاں کوئی چوٹی نہیں تھی رات تک ہم ادھر ادھر چپک کرتے رہے پھر ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔

آدھی رات کے قریب اچانک ایک آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں گھر سے باہر آئی تو دیکھا کہ کچن کے سامنے کوئی کالے شے پڑی ہے پھر جب میں قریب گئی تو دیکھا ایک کالا ہاتھ اور اس نے میری طرف دیکھا اور مل بھر میں ایک کالی عورت میں تبدیل ہو گیا۔ پھر میری چیخیں آسمان چھونے لگیں اور اچانک میں تاریکیوں میں ڈوب گئی پھر ہم نے وہ گھر چھوڑ دیا اور ہم مارشی طور پر اپنے فلیٹ کے نیچے والے فلور پر رہنے لگے پھر اس بزمی میں نہ ہوا اور اس کے بعد پھر میری زندگی میں وہ کبھی آئے اس کا تصور بھی میں نہیں کر سکتی تھی۔

وہ دن میری زندگی کا بدترین دن تھا رات کو ہم کھانا کھا کر سو گئے اور تقریباً رات کے تین بجے اچانک ایک آواز آئی، کوئی میرے کو آواز دے رہے تھا۔ ”میرا! میرا! میرا!“ پھر میرے اٹھے اور بولے۔ ”میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔“ جیسے ہی وہ گھر سے نکلے آتی زور سے

دھماکہ ہوا کہ میں لرز گئی اور باہر کان بھاڑ دینے والا شور سنائی دینے لگا۔ میں دوڑتی ہوئی باہر گئی اور جو میں نے دیکھا، خدا کی عورت کو نہ دکھائے۔

سامنے بجلی کا بہت بڑا کھمبا گرا ہوا تھا اور اس کے نیچے تاروں کے کچھے میں ایک جسم الجھا ہوا تھا اور حل کر سیاہ ہو گیا تھا اسے میں نے ہاتھ کی گھڑی سے پچھا جا جو میں نے میرے گھٹ دی تھی۔

جب میں اسے حواس میں واپس آئی تو میں اپنے والدین کے گھر میں تھی۔ گھر والے بتاتے ہیں کہ میں بہت دنوں بعد بولنے کے قابل ہوئی تھی مگر میری زندگی تو ختم ہو چکی تھی میرا پورا راجیل اپنے بھائی کی میت کی وجہ سے آیا ہوا تھا اور وہ آ کر میرے گلے لگ کر رونے لگا اور بولا۔ ”بھابھی نہ جانے کس کی نظر کھا گئی ہمارے بھتے بھتے گھر کو“ راجیل کو میں نے یہاں رکھنے سے منع کر دیا اور وہ واپس کینیڈا چلا گیا اور وہاں سے مجھے پیسے بھیجتا رہا اور میں ان پیسوں کو جمع کرتی رہی۔

میری ایک دوست نے مشورہ دیا۔ ”کیوں نہ ان پیسوں سے ایک ادارہ بناؤ جہاں بے سہارا عورتوں کو ہنر سکھا کر اس قابل بنایا جائے کہ وہ معاشرے میں کسی قابل ہو جائیں۔“ یہ بات میرے دل کو لگی پھر میں نے راجیل سے مشورہ کر کے میرے نام پر ایک ادارہ بنادیا۔ دوسری طرف شانیزہ کے شوہر کو بیرون ملک گرفتار کر لیا گیا تھا وہ بیرون اور انسانوں کی اس سنگت کرتا تھا اور یوں شانیزہ نے واپس شیم پھونے کے پاس آ گئی مگر میرا ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیا اور میرے ادارے کی پندرہائی ہوئی اور میرا نام اچھائی کے ساتھ جڑ گیا اور یہ بات ہی ان ماں باپ کی کو پسند نہیں آئی اور پھر اسی لئے انہوں نے اپنا آخری اور سب سے خطرناک وار کر دیا۔

ایک روز میرے بے ہوش شدید قسم کا درد تھا اور پھر شام تک یہ درد ناقابل برداشت ہو گیا تھا اتنا کہ میں سرخ رہتی تھی۔ مجھے فوراً اسپتال لے جایا گیا پھر میرے سارے ٹیسٹ ہوئے اور تمام رپورٹس بالکل نارمل آئیں مگر وہ کم نہ ہوا اور میں سر پٹنے جاری تھی امی ابو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر



## بھیا نک انجام



ہر رات راشدہ بیگم کے لئے جہنم سے کم نہیں ہوتا۔ وہ چینی چلاتی تھیں، واہلا چاتیں، ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہتیں۔ اور پھر ایک صبح وہ بھی اپنی کوشڑی میں مردہ پائی گئیں۔

”مجھے یقین ہے عالیہ! تم مجھے انکا نہیں کرو گی، اپنے آگن کا یہ آجالا ضرور مجھے عطا کرو گی“ راشدہ بیگم نے پیار سے آجالا کی طرف دیکھا۔ جو تمام باتوں سے بے خبر آگن پر سے دھلے ہوئے کپڑے اتار رہی تھی، وہ بولی دھوپ نے چہرے کی رنگت میں لالی بھردی تھی اس کے نقاب لب جانے کیا سوچ کر آپ ہی آپ مسکرا رہے تھے۔ عالیہ بیگم نے آنکھوں میں بیٹی کی نظر اتارتے ہوئے تنہا کی جانب دیکھا تھا۔ ”آبا! سارا خاندان گواہ ہے کہ میرے اور آپ کے تعلقات مجھی بھی تند بھادج کے نہیں رہے ہم نے

بہنوں کی طرح رہ کر پورے خاندان کو مثال بن کے دکھایا ہے جب بھی کبھی بڑی بہن کی کمی محسوس ہوتی میں نے آپ کے آنچل میں پناہ لی مگر آپ اب ڈر لگتا ہے“ راشدہ بیگم نے حیرانی سے انہیں دیکھا ”کیوں بھلا؟“ ”آبا! یہ ساس بہو کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ عمر کے اس موڑ پر میں اپنی بڑی بہن سے محروم ہو جاؤں۔ ماشاء اللہ فیہم ہیرا لڑکا ہے اسے آجالا سے زیادہ اچھی لڑکیاں مل جائیں گی“ انہوں نے محبت سے میاں کے بچے کا ذکر کیا۔ ”لاحول ولا قوۃ! کیا تم بھی مجھے عام جاہل عورتوں

تھے۔“ بزرگ پھر ابو سے بولے ”بول! بدلہ چاہتا ہے؟“ ابو بولے۔ ”جہنم میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑنا ہوں۔“ تو وہ بزرگ مسکرا کر خاموش ہو گئے پورا پانی آنکھوں بند کر لیں اور میرے سر کا روپوں غائب ہو گیا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں، اس کے بعد ان بزرگ نے کوئی جواب نہیں دیا اور ہمیں والہی کا اشارہ دیا تو اٹھ کر ہم آ گئے۔

کچھ روز بعد ہی پچھو اور ان کی بیٹی کو اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ ہوا یوں کہ وہ بہر کے وقت وہ سورہی تھی اور لیکن میں گیس لیک ہونے لگی، انہیں پتہ ہی نہیں تھا شاہ کو جب وہ لیکن میں گئیں اور ماچس چلائی تو آگ نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اتنی بری طرح جل گئیں کہ لیکن کا کچھ سامان تک ان کے جسموں سے نہ چک گیا تھا مٹلے والوں نے انہیں اسپتال پہنچایا۔

میں جب معلوم ہوا تو ہم دوڑے اسپتال پہنچے اور دونوں کو دیکھ کر ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہمیں دیکھ کر پچھو بولیں ”مت رو اپنے یہ جیتی آنسو ہم گنہگاروں کے لئے ضائع مت کرو، حسد میں ہم اندھے ہو گئے تھے۔“

شاذیہ بولی۔ ”ماموں میں، حقانی کے لائق تو نہیں ہوں، شاید آپ کے معاف کرنے سے ہماری روح آسانی سے جسم سے نکل جائے! تم بھی مجھے معاف کر دو۔“

ابو بولے۔ ”میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا، معاف کرنے والا تو اللہ کی ذات ہے پھر بھی اگر میرے کہنے سے تمہیں تسلی ہوتی ہے تو میں آپ دونوں کو معاف کرتا ہوں۔“ پھر ابو کے کہنے پر میں نے بھی دونوں کو معاف کر دیا۔

شام تک دونوں کا انتقال ہو گیا۔ ان کا کیا ان کے سامنے آ گیا تھا لیکن میری زندگی تو ختم ہو گئی تھی جو چاہ کر بھی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ شاید میری کہانی سے لوگ کچھ سوچیں سبق لیں اور حسد کو اپنے دل میں جگہ نہ دیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین)

دعا نہیں مانگنے لگی اور عقیدتا یہ میرے ماں باپ کی دعا نہیں ہی تھیں جو آج میں زندہ ہوں۔ جب امی دعا مانگ رہی تھیں تو ایک خاتون انہیں دیکھ کر آ گئیں اور انہیں ساتھ لے کر باہر چلی گئیں اور کہنے لگیں۔ ”مجھے تو یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے، میں ایک بزرگ کو جانتی ہوں ویسے تو لوگ انہیں پاگل کہتے ہیں مگر میرا ماننا ہے کہ وہ کچھ خاص ہیں اور لوگوں سے دور رہنے کے لئے ایسے بنے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی بیٹی کو انہیں دکھا میں انشاء اللہ یہ ٹھیک ہو جائے گی۔

امی ابو مجھے لے کر ان بزرگ کے گھر گئے۔ بزرگ کا گھر گنڈا بڑا تھا۔ وہ ایک طرف خاموش بیٹھے تھے۔ امی نے ان کے گھر کی پوری صفائی کی اور مجھے لے کر ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔ وہ ہمیں خاموشی سے گھورتے رہے اور پھر بولے۔ ”اس بچی کو حسد کھا گیا ہے اور دشمن نے اپنا آخری اور کاری دار کر دیا ہے، تیرے رشتے داروں میں دو عورتیں ہیں نام نہیں بتا رہا، مجھے معلوم ہے انہوں نے تیری بیٹی کے استعمال ہوئے کپڑوں پر عمل کیا اور اسے برباد کرنی رہیں۔ اس کے شوہر، ساس، سرسب کو مار دیا، کاروبار ختم کر دیا مگر یہ بیٹی اچھائی کی وجہ سے بھلائی کی راہ پر چل کر پھر خوشحال ہو گئی تو ان کو حسد کوڑے کی طرح ان کے دل پر پڑا اور انہوں نے اپنا یہ داؤ کھیل دیا۔ ان میں سے ایک نے دھوکے سے تیری بیٹی کی لٹ کاٹ لی تھی اور اسی پر یہ عمل ہو رہا ہے جو اسے ختم کر دے گا۔“

مجھے وہ وقت یاد آ گیا، میں جب اپنی شادی والے دن سورہی تھی اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ کمرے میں کوئی آیا تھا، امی ابو تو سر پکڑ کر پیٹھ گئے۔ پھر ان بزرگ نے آنکھیں بند کیں تو ان کی منگی میں تین لیٹوں آ گئے۔ پہلا لیٹوں انہوں نے میرے سر پر رکھا اور کچھ پڑھنے لگے اور پھر میرے سر پر ہی اس لیٹوں کو کاٹ کر ہوا میں اچھال دیا، جب وہ دونوں ٹکڑے زمین پر گرے تو وہ سرخ ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس طرح دوسرے لیٹوں کاٹ کر اچھالا جب وہ زمین پر گرا تو ایک ٹکڑا سرخ تھا پھر اسی طرح انہوں نے تیسرا لیٹوں میرے سر پر کاٹ کر اچھال دیا اور اب کہ جب دونوں ٹکڑے زمین پر گرے تو وہ صاف



## انناس کھانسی دور کرے

کیڑا اور مالٹے کو دنا من سی سے بھر پور ہونے کی وجہ سے کھانسی کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ پھل کھانسی میں کافی آرام دیتا ہے لیکن ایک اور پھل ایسا بھی ہے جس کے بارے میں ماہرین صحت کہتے ہیں کہ یہ کھانسی کے شربت سے بھی 500 فیصد زیادہ مفید ہے۔ اس پھل کا نام انناس یا پائین اپل ہے۔ انناس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ نظام انہضام کے لیے بہت مفید ہے اور ساتھ ہی جسم میں موجود انفیکشنز کو ختم کرتا ہے۔ بروسلین نامی خامرہ کی وجہ سے یہ جوڑوں کے درد، سوجن اور سرجری کو جلد مندمل کرتا ہے۔ یہ بیکٹیریا کو ختم کرنے کے ساتھ جسم میں موجود انفیکشن کو ختم کرتا ہے، اس میں موجود دنا من سی کی وجہ سے یہ کھانسی اور زکام میں بہت زیادہ آرام دیتا ہے۔ ایک کپ پائین اپل روزانہ کھانے سے ہمارے جسم کی دنا من سی کی طلب پوری ہوتی ہے، اس کی وجہ سے خون کی شریانیں بھی کھلتی ہیں اور یہ پتھوں اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ اس کے علاوہ انناس میں دنا من بی 6، میٹھیم، بیکٹیر، پوٹاشیم اور ریبوفلیوین ہوتی ہے جو کہ جسم کی توانائی کی مقدار کو پوری کرتی ہے۔ اس کے جوس کی وجہ سے کھانسی ختم ہوتی ہے اور ساتھ ہی جسم میں موجود باکٹرم کم ہوتی ہے۔

(حمزہ عرفان - کراچی)

میں طرح انکار کر دیتیں اور اب کرتیں بھی تو وہ رنجش کدیا جاتا کیونکہ بہن نے بھائی سے اپنی ذات کا مان حاصل کر لیا تھا اور یوں چٹ مٹتی پٹ پیادہ کے مصداق اچالا راشدہ بیگم کے گھر آگئی اور راشدہ بیگم کے دل میں بیٹی کی محبت کی جگہ ہوئی نفرت جگہ بنانے لگی۔ نعیم بھی بہت شکی مزاج تھا بات بے بات مار کٹائی اور بھگڑا کرتا۔

اچالا کے گال پر زور دار تھپڑ پڑا تھا اگر اس نے گرمی صوفے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو بھائی منہ کے بل گرتی۔ یہ صرف اتنی جھکی کہ کھانے میں نمک تیز ہو گیا تھا پھر تو یہ ہر گزائی روز کا معمول بن گئی..... راشدہ بیگم بیٹے کو کھانسی لگنے اور وہ ان کے معمول کے مطابق چلنے لگا۔ اچالا اپنے نام کی طرح واقعی دل و دماغ کا بھی اچالا تھی اور ایسا وہ شادی سے پہلے ہی مگر شادی کے بعد جاری رہا۔ اندھیرا مسلط کر دیا گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھے، سوئے، جاگے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے جانے لگے، اس اذیت و ظلم سے وہ اندر ہی اندر پھور پھور ہونے لگی۔ لیکن کہتے ہیں کہ انسان کا چہرہ اندرونی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ سو اچالا کے چہرے نے بھی سب پر اندرونی ظلم کو آشکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کو ایک لفظ بھی نہ کہتی، کبھی بھی اس نے اپنے اوپر بیٹنے والے ظلم کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا مگر جب بکارات پاپ نے پوری کیفیت کو بھانپ لیا اور پھر تو دونوں بھائیوں کی اپنا دل تھام کر بیٹھے چلے گئے۔

عالیہ بیگم ایک دن شوہر کے سامنے روتے ہوئے اصرار کر رہی تھیں "میں نہ کہتی تھیں کہ اس رشتے پر میرا دل نہیں اور میں شروع سے انکار ہی کرتی رہی مگر بہن کے سامنے اقرار کر کے آپ نے ہماری ہول جیسی بیٹی کو دکھوں کا گوارہ بنادیا" احد میاں ہوش تھے اور ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، پھر دونوں میاں بیوی زاد و قتال سکڑوں میں لپٹنے لگے اور دونوں نے بیک وقت آسمان کی طرف ہاتھ کر کے کہا "اللہ تعالیٰ بیٹی کا غم اب ہمارے لئے

کی صف میں کھڑا کر رہی ہو جو شادی ہوتے ہی وہ اپنی ساس بن جاؤں گی اور جہنم میں گھر بناؤں گی" میں خود احد سے بات کروں گی۔ انہوں نے بھائی کا نام لیا۔ "اپا اس معاملے میں انہوں نے مکمل اختیار مجھے سونپا ہوا ہے مگر آپ یقین مایے میرا دل بالکل اس بات کے لئے راضی نہیں ہو رہا، آپ مجھے معاف کر دیں، مجھ سے اصرار نہ کریں" انہوں نے لجاجت سے ان کے گلے پر ہاتھ رکھا تو راشدہ بیگم نے گہری سانس بھر کے انہیں دیکھا۔

"تمہاری مرضی یہ ہے تو یہی سہی مگر میں بڑی آس لے کر آئی تھی" ایسا لگ رہا تھا کہ ان کا موڈ آف ہو گیا ہو۔ "اب چلتی ہوں" انہوں نے چادر اٹھائی۔ "ارے، آپ کچھ چائے، کچھ ٹھنڈا۔"

"نہیں بس، اس وقت تم نے مجھے ایسا مایوس کیا ہے کہ اب کسی طرف بھی طبیعت مائل نہیں ہوتی" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آپ، ناراض ہو کر مت جائیں" عالیہ بیگم راشدہ بیگم کے گلے لگ گئیں۔

"میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں" اچھا چلو کوئی بات نہیں جس میں تم خوش اس میں ہم خوش" راشدہ بیگم مسکرائیں تو عالیہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

"کیا ہوا امی؟ کچھ بھائی جلدی چلی گئیں" اچالا حیران حیران سی ماں کے پاس آئی۔ "ہاں انہیں کچھ کام تھا" عالیہ بیگم بڑی کی نوکری اور چٹکوں کا شمار اٹھا کر بکن میں چلی گئیں تو اچالا بھی سر جھٹک کر ان کے پیچھے ہوئی۔

"صبح آپ آئی تھیں" حسب معمول ہر کام سے فارغ ہو کر رات احد صاحب مطالعے میں مصروف تھے جبکہ عالیہ بیگم فارغ انداز میں بیڈ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"اصرار کر رہی تھیں اپنی اچالا کے لئے" "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیوں انکار کر رہی ہو" انہوں نے کتاب کو سائڈ ٹیبل پر رکھا "اچھا بھلا لڑکا



نا قابل برداشت ہے۔

ایک دن راشدہ بیگم اور ان کے میاں کی قریبی عزیز کے گھر گئے تو اُجالا گھر میں اکیلی رہ گئی آج صبح سے اسے چکر آرہے تھے وہ بدم ہو کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ”ماسوں، ممانی کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ دونوں موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے ہیں تم میرے ساتھ چلو۔“ اُجالا کو لگا جیسے کسی نے اس کے قریب ہم پھوڑا ہو۔۔۔۔۔ اور پھر حواس باختہ ہو کر وہ چیخنے چلانے لگی۔۔۔۔۔ بہر حال وقت گزرتا گیا۔۔۔۔۔ اور اس کے ذمہ کچھ مندرل ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

”اری کجنت۔۔۔۔۔ برتن کیا تیرا باپ آ کر دھوئے گا، منوس کہیں کی۔۔۔۔۔“ راشدہ بیگم نے دو چھڑاں کی کر پر جڑ دیئے انہیں اپنے بھائی کے مرنے کا بھی کوئی دکھ نہ تھا۔ سب کی نظریں اُجالا کی جائیداد اور اس کے ماں باپ کے اس بنگلے پر تھیں۔ جس میں اب وہ سب رہ رہے تھے اور اب وہ اُجالا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔ کیونکہ اس کے بعد تمام جائیداد خود خودان کے بیٹے نعیم کی ملکیت ہو جاتی۔۔۔۔۔ وہ لوگ طرح طرح کے ظلم اُجالا پر کرنے لگے مگر اُجالا کے صبر و تحمل میں فرق نہ آیا۔ ایک دن اُجالا گھر پر اکیلی تھی صبح سے اس کی طبیعت بہت خراب تھی مگر راشدہ بیگم اسے تنہا چھوڑ کر پڑوس میں چلی گئیں۔

اچانک ڈور تیل بجی۔۔۔۔۔ اُجالا سے چلنا مشکل ہو رہا تھا اور تیل مسلسل بجتی چلی گئی۔ اس نے بڑی تکلیف سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے نعیم بڑے خونخوار اثرات کے ساتھ کھڑا تھا۔

”کہاں مر گئی تھی۔ اتنی دیر سے گھنٹی بج رہا ہوں۔“ وہ اسے ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر سارے گھر میں آدم بواڈم بول کر تا پھرتا رہا۔ ”بتا کیوں نہیں رہی، کیوں دروازہ نہیں کھول رہی تھی؟“ ڈرائنگ روم، لاؤنج، کچن، باتھ روم، بیڈ روم اور ہر کونے کھدرے میں جھانک کر اور کسی کر لینے کے باوجود اُجالا

سے وہ پوچھ رہا تھا۔۔۔۔۔ بتا کہاں چھپایا ہے اپنے یار کو۔“ اسنے میں راشدہ بیگم اور ان کے میاں بھی آئے۔۔۔۔۔ ”ہاں ہاں پوچھ اس بے غیرت سے تیری آنکھوں میں دھول جھونک کر یہ کیوں سے یار کے ساتھ رنگ لیاں مٹا رہی تھی“ راشدہ بیگم نے جلتی پر تیل چھڑکا۔

نعیم نے بے تحاشانہ زباں گا لیاں دیں، لاتوں اور گھونٹوں سے اُجالا کا برا حال کر دیا مگر اس پر بھی بس نہیں کیا۔ اور چونک سے ماتس لاکر ماں کو پکڑا دی اور خود پیٹرول چھڑکنے لگا۔۔۔۔۔ ماں نے اُجالا کے جسم پر تیلی جلا کر پھینک دی۔ اُجالا جھپٹی چلائی رہی مگر کسی کو اس پر ٹرس نہ آیا اور یوں اُجالا نام کا یہ باب ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

پولیس سے بچنے کے لئے انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئی کیونکہ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے اور اس طرح دن گزرتے چلے گئے اور وہ سب دولت کے نشے میں چور ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

راشدہ بیگم نے زور سے چیخ ماری اور نیند سے بیدار ہو گئیں۔ ”اف کیا بُرا خواب دیکھا ہے میں نے سنے ہو نعیم کے ابا۔۔۔۔۔ آج پھر میں نے وہی خواب دیکھا، میں نے دیکھا کہ اُجالا ایک بڑا سا چادر لکر میری طرف بڑھ رہی ہے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، راشدہ بیگم، کیا خواب کا بھی حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ذہن سے نکال دو اس بات کو اور آرام سے سو جاؤ۔“ راشدہ بیگم ششے میں دیکھ کر اپنے بال سلجھا رہی تھیں جب انہوں نے ایک کالا سیاہ لمبا ناگ اچانک اپنی گردن سے لپٹتے ہوئے دیکھا۔

”س۔۔۔۔۔ س۔۔۔۔۔ سا۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔۔ وہ حلق کے بل چلائیں۔ نعیم بھاگا ”کہاں ہے سانپ۔۔۔۔۔“ ”یہاں ابھی یہاں پر تھا۔“ مگر نعیم کو سانپ نظر نہ

آیا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اماں اتنی دولت پا کر۔۔۔۔۔“

نعیم نوکروں پر برس پڑا ”کیا دیکھ رہے ہو دفع ہو جاؤ“ نوکر جو شوری آواز سن کر آئے تھے فوراً چلے گئے کہ اچانک نعیم نے اپنا پاؤں پکڑ لیا۔۔۔۔۔ ”سانپ۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔۔ مارو۔۔۔۔۔ پکڑو۔۔۔۔۔ نعیم چلا یا۔۔۔۔۔ دونوں نوکر بھاگے بھاگے آئے مگر ان کو کوئی سانپ نظر نہ آیا ”میرا منہ کیا دکھ رہے ہو سانپ کو مارو“

”مگر صاحب سانپ تو کہیں نہیں ہے۔“ نعیم نے نیچے پاؤں کے پاس دیکھا تو واقعی وہاں کچھ نہ تھا۔ ”اچھا اب جاؤ“ نعیم سنجیدگی سے اس معاملے کو سونے لگا کیونکہ سانپ اس نے خود دیکھا تھا۔۔۔۔۔ اور اگلی صبح ناشتے کے وقت سب سنجیدگی سے سوچنے لگے ”چلو بیگم ایک کپ چائے پلاؤ اپنے ہاتھ کی۔“ راشدہ بیگم کے شوہر دلاور نے بیگم کا ذہن بنانے کے لئے کہا۔ اور راشدہ بیگم اٹھ کر کچن میں آگئیں چولہا جلانے کے لئے نظر دوڑائی ماحس کے لئے تو اچانک چولہا خود بخود ہی جل پڑا وہ بھیچیں چلے نظر دلوں سے دیکھنے لگیں۔

اچانک ہی چھٹی پتی کے ڈبے ہو اس میں لہرائے لگیں وہ بھاگنے کے لئے حسیں تو دیکھا کہ اُجالا قبر بار نظروں سے اُنہیں دیکھنے لگی راشدہ بیگم کے دل کی دھڑکن خوف کے مارے بند ہونے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر نعیم اور دلاور بھی خوفزدہ ہو گئے۔

”ظالمو! تم نے مجھے پیٹرول چھڑک کر جلا دیا تھا میری روح ہر وقت بے چین رہتی ہے اپنا بدلہ لینے کے لئے اب میں تمہارے اس بیٹے کو بھی بالکل ویسے ہی جلا کر مار دوں گی۔“ اُجالا نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ خدا کے لئے رحم کرو۔۔۔۔۔ ایسا نہ کرو۔۔۔۔۔ وہ بیٹوں بلکتے لگے۔

”کیا تم کو کچھ برترس آیا تھا، نہیں نا۔۔۔۔۔“ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے دھول پر لہراتا ہوا پیٹرول کا ڈبہ نعیم کے کپڑوں کو تر کر گیا اور آگ فانا ہی نعیم کے کپڑوں میں آگ بھڑک اٹھی۔۔۔۔۔ اور 15 منٹ میں سب کچھ ختم

ہو گیا۔ راشدہ اور دلاور اگلی صبح غم کی تصویر بنے بیٹھے تھے کہ دلاور نے کہا ”کیوں نہ ہم کسی عامل وغیرہ کے پاس چلیں۔“ خبردار۔۔۔۔۔ جو ایسا کیا تو میں تمہیں جلا کر بھسم کر دوں گی“ اچانک ہی اُجالا کی آواز ابھری اور پھر وہ ظاہر ہو گئی۔

”اگر تم ایسی بھیا تک موت سے بچنا چاہتے ہو تو پولیس اسٹیشن جا کر اپنا گناہ قبول کرلو۔۔۔۔۔ ورنہ دوسری صورت میں، میں خود تمہیں مزادے دوں گی۔“ ”ٹھیک ہے ہم۔۔۔۔۔ ہم اپنا گناہ قبول کر لیں گے اور کل اپنی گرفتاری دے دیں گے۔“ ”نہیں۔۔۔۔۔“ اُجالا دھاڑی ”کل نہیں آج ابھی۔۔۔۔۔ اور اسی وقت چلو۔“

اور یوں دونوں میاں بیوی نے تھانے میں اقبال جرم کر لیا اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے اُجالا کو جلا کر بھسم کیا تھا۔

مقدمہ چلا۔۔۔۔۔ پیشی ہوئی۔۔۔۔۔ اور پھر دونوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ مگر اگلے ہی دن دلاور میاں جیل کی کھڑکی میں مردہ پائے گئے نبھانے خود کشی کا کیس تھایا کچھ اور کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آیا۔

اب اسی طرح کار روز کا معمول بن گیا۔ ہر رات راشدہ بیگم کے لئے جہنم سے کم نہیں ہوتی۔ وہ جھپٹی چلائی تھیں، واویلا مچاتیں، مامی بے آب کی طرح تڑپتی رہتیں۔ جیل کا ہر شخص اپنی اپنی جگہ اچنبھے میں تھا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخريات میں ہی انہیں طرح طرح کی ناقابل برداشت تکلیف کیسے ہو جاتی ہے وہ اُجالا کا نام لے کر معافی مانگتیں، مٹیں کرتیں، دہائیاں دیتیں، باتوں نے اب بے سمجھ لیا کہ چونکہ انہوں نے بہو کے ساتھ ظلم کیا تھا لہذا وہ نفسیاتی مر لیض بن گئی ہیں اور پھر ایک صبح وہ بھی اپنی کھڑکی میں مردہ پائی گئیں۔

بہر حال ان کا انجام سامنے تھا جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ دنیا میں ہی پالیا تھا۔

☆



خوف و ہراس کے افق پر اٹھکھکیاں کرتی جسم و جاں کو لرزادی والی دل گرفتہ دل شکستہ و دوا دج  
کہ پڑھنے والوں کو اپنے جیسے میں ڈال دے گی۔



**میری** نظروں کے سامنے ایک راحشش  
کھڑا ہوا مجھے گرسنہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی  
قامت بارہ فٹ سے زیادہ رہی ہوگی وہ ہاتھی کی  
جسامت جیسا تھا اس کا چہرہ اس قدر بھیاں تک اور مکروہ  
اور گھناؤنا تھا کہ میرے بدن میں ہونچھونچنے لگا۔ اس  
کے ہاتھ سات سات فٹ کے تھے، بے حد موٹے  
بھدے، گلایاں کسی پیڑ کے تنے کی مانند اور ناخن چار  
انچ کے تھے۔ نہ صرف ہاتھ بلکہ پیر بھی مڑے ہوئے  
تھے۔ اس کے دانت جو منہ سے باہر نکلے ہوئے کسی خون  
خوار درندے کی طرح ایک ایک فٹ کے تھے آنکھیں  
خون میں تیرتی ہوئی تھیں ناک ایک فٹ لمبی اور موٹی  
بھی تھی ننھے اتنے بڑے اور کھلے ہوئے تھے کہ ان میں  
بل بھی گھس سکتی تھی۔

میرا بدن خوف اور ہشت سے لرزنے لگا اگر میں  
مضبوط اعصاب کی مالک نہ ہوتی تو یقیناً بے ہوش  
ہو جاتی میرے حواس جو منتشر ہو رہے تھے میں نے  
انہیں یک جا کر کے قابو میں کیا لیکن اس کے باوجود میرا  
سینہ بری طرح اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے سینہ شق  
کر کے نکل آئے گا سانپوں کا زہر ویم چھو لے گا ہار رہا تھا  
میں بت کی طرح ساکت و جامد تھی۔

میری دکان نوادرات کی ہے اگر اسے عجیب خانہ  
کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا غلط نہ ہوگا اس میں نوادرات  
کے علاوہ مورتیاں، جن بھوت کے جیسے، ناگ، ناگنوں

میں تو ہم پرست نہ تھی مجھے کبھی بھوت، بدروح  
، چڑیل اور راحشش کے وجود کا یقین نہ تھا ان کی  
جو کہانیاں سننے کی تھیں انہیں من گھڑت اور فرضی سمجھتی تھی لیکن  
اب جو ایک راحشش کو دیکھا تو یقین کرنے پر آمنا  
ان کا وجود ہے۔

”ہم اپنی حسین و جمیل رانی کو خوش آمدید کہتے  
ہیں؟“  
اس کی انسانی آواز نے سکوت کو توڑا تو مجھے اپنی  
سعادت پر فورا کا احساس ہوا۔  
میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا



میں اس سے کہتی بھی تو کیا کہتی، گوگنی بنی کھڑی رہی۔  
 ”میرے من کی رانی!..... اہم آپ کی راہ برسوں  
 سے دیکھ رہے ہیں۔ آج من کی مراد پوری ہوئی ہے؟“  
 ”تت..... تت..... تم کون ہو؟“ میں نے بہ  
 وقت تمام کیا۔

”میں تمہارا راجہ ہوں..... اور کنوارہ ہوں؟“ اس  
 نے معنی خیز لہجے میں کہا۔  
 ”ت..... تم دفع ہو جاؤ..... مجھے جانے  
 دو۔“ میں پھنسی پھنسی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی۔  
 ”تم دریا کے کنارے جانا چاہتی ہو.....؟ یہ  
 تو بہت دور ہے چلتے چلتے تمہارے سر میں خوب  
 صورت اور سڈول بیروں میں موج آجائے گی.....  
 آؤ..... میری ہاتھوں میں سا جاؤ تاکہ میں تمہیں گود میں  
 اٹھا لوں..... تمہیں ایک قدم بھی چلنا نہیں پڑے گا  
 ..... نہیں..... میں تمہیں وہاں نہیں لے جاؤں گا.....  
 میں تمہیں۔“

”جو اس بند کرو..... تم میرے قریب بھی نہیں  
 آنا۔“ میں نے نفرت اور حقارت سے کہا۔  
 ”اچھا..... اچھا..... تم مجھے اس جلیے میں دیکھ  
 کر خوف زدہ ہو رہی ہو۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔  
 ”اچھا تو میں راج کمار کے روپ میں  
 آ جاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ ایک دم سے نظروں سے غائب ہو گیا  
 ۔ چند لمحوں کے بعد وہ نمودار ہوا تو وہ ایک خوب صورت  
 وجہ اور دراز قد راج کمار کے روپ میں تھا اس کے بدن  
 پر شاہی پوشاک تھی۔

وہ ایک ایسے تصوراتی محبوب کے روپ میں تھا  
 کہ کنواریاں کیا، شادی شدہ اور جواں سال عورتیں بھی  
 دیکھیں تو ان کے سینے دھک سے ہو کر رہ جاتیں اور اس  
 کے بازوؤں کے حصار میں قید ہونے کی تمنا کریں۔

چوں کہ میں اس کا اصل اور گھناؤنا روپ دیکھ چکی  
 تھی اور جانتی تھی کہ یہ راجہ کمار ہے اس لیے میرے  
 قدم اس کے قریب کے لئے نہ بڑھے ورنہ شاید میں بے

اعتبار اس کی طرف بڑھ جاتی اور غور کو اس کے حوالے  
 کر کے اپنا سب کچھ سوٹ دیتی لیکن میں اس کے جادو  
 منتر کے حصار میں نہیں آئی۔  
 ”کیا بات ہے میری رانی..... تم میرے قریب  
 نہیں آ رہی ہو؟“  
 ”تم راجہ کمار.....؟ تم مجھے بے وقوف نہیں  
 بنا سکتے؟“ میں نے ہمت کر کے کہا۔

”نہیں میری جان..... نہیں..... یہ تمہارا وہم ہے  
 ..... میرا تمہارا راج کمار ہوں..... تم میری رانی ہو.....  
 وہ میری طرف غیر محسوس انداز سے بڑھنے لگا  
 تھیں نے اس کے چہرے کی درندگی اور آنکھوں کے  
 پیلے بن اور خباثت اور تیر سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ  
 مجھے گود میں اٹھا کر لے جائے گا اور میں بے بس  
 ہو جاؤں گی اپنی ہر خواہش اور ارمان پورے کرے گا یہ  
 روح فرسا خیال مجھے کسی نہرے لیے سانپ کی طرح ڈس  
 رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کس طرح اپنی عزت  
 و آبرو بچاؤں؟

زمین پر ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنا  
 دفاع کر سکوں۔ مجھ میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی  
 زمین پر پتھر تک نہ تھے جس سے میں اس کا مقابلہ  
 کر سکوں؟ چشم تصور میں دیکھ رہی تھی کہ میں اس سرخ  
 حویلی کے جملہ عروسی میں ہوں اور وہ مجھ پر آندھی بن کر  
 ٹوٹ پڑا ہے۔ میں دل میں بھگوان سے پراختیا کرنے  
 لگی۔ ”اے بھگوان مجھے اس درد سے بچا۔“

ایک ثلث مجھے اس گڑیا کا خیال آیا جسے میں نے  
 اپنی ساڑی کے پلوں میں چھپایا ہوا تھا۔ اس راجہ کمار  
 کے کسی منتر سے پلوں میں اور سینے سے پھسلنے لگا  
 تو میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی، میرے سینے سے  
 جو گڑیا چلی ہوئی تھی وہ اک دم سے زمین پر گر پڑی۔

مجھے گڑیا سے زیادہ اپنی آبرو کی فکر تھی پھر مجھے  
 خیال آیا کہ دلدل میں ڈوبتے ہوئے کو تھکے کا سہارا  
 ہوتا ہے۔ کیوں نہ گڑیا سے مزاحمت کروں میں یہ سوچ  
 کر چلی تاکہ گڑیا کو اٹھاؤں گڑیا جو گڑ بھری اور وحشی میں

پہنچی ہوئی تھی اور وحشی اس کے بدن سے الگ ہوئی اور وہ  
 چار گز کی اوڑھنی میں تبدیل ہو کر فضا میں کسی زنجیر کی  
 طرح لہرائی۔

دوسرے لمحے وہ راجہ کمار میری طرف بڑھتے  
 ہوئے ٹھٹھک کے رک گیا میرے اوپر راجہ کمار کے  
 درمیان وہ اوڑھنی حائل ہو کر لہرائے لگی راجہ کمار نے  
 طے سے جو اس اوڑھنی کو ہٹانے کی کوشش کی تو اک دم  
 سے اس کا ہاتھ جل اٹھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے  
 سارے بدن میں آگ لگ گئی وہ جھپٹیں مارنے لگا  
 پھر اس کا وجود آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا۔  
 صرف چند لمحوں میں وہ جھم ہو گیا زمین پر سیاہ راکھ کے  
 صوٹ چھو نہ تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اوڑھنی بالکل محفوظ رہی تھی  
 اور وہ پھر چھوٹی ہو کر گڑیا کے بدن پر کھڑی تھی پھر وہ  
 سادہ سات میں آگئی تو میں نے فوراً ہی جھک کر اوڑھنی  
 اٹھ کر گڑیا اٹھائی گڑیا کو اوڑھنی میں لپیٹ دیا۔

مجھے ایسا لگا کہ میں نے کوئی عجیب و غریب  
 اٹھائی سنسنی خیز چیز دیکھا ہے۔ اس گڑ بھری اوڑھنی  
 نے جو چار گز میں تبدیل ہو کر راجہ کمار کو چھم  
 گدیا اس کا لپٹن ہی نہیں آیا تھا؟ اس اوڑھنی نے میری  
 امداد اس راجہ کمار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچائی  
 تھی۔ اس اوڑھنی سے راجہ کمار کو آگ لگ گئی تھی  
 جب کہ مجھے کچھ نہیں ہوا تھا نہ ہی میں نے اس کے س  
 میں اور گڑیا ہٹ کر محسوس کیا تھا ایسا لگتا رہا تھا کہ یہ  
 گڑیا اس کوئی نوازا سیدہ ہو۔

میں نے تیز قدم اٹھائی ہوئی دریا کی طرف  
 بھاگنے لگی۔ میں یہ جانتی تھی کہ جتنا جلد ہو سکے اس  
 صحرار اور خوف ناک وادی سے نکل جاؤں۔ اس لئے  
 میں نے اپنی آبرو اور زندگی کو خطرہ ڈال کر محسوس کر رہی  
 تھی اگر یہ طلسماتی گڑیا میرے ہاتھ نہ لگتی تو پھر میری  
 اور آبرو بلیا میٹ ہو چکی ہوتی۔

میں بار بار مڑ کے دیکھتی بھی جاری تھی کہ میں  
 نامعلوم عفریت میرے تعاقب میں تو نہیں۔ لیکن

اس کے باوجود میرا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا  
 اور سانس پھول رہی تھی اس کے باوجود کہ یہ گڑیا جب  
 تک میرے پاس ہے میری عزت اور جان پر کوئی آج  
 نہیں آ سکتی دوسووں اور اربا اندیشوں کا کیا کرتی؟ وہ  
 زہریلے ناگوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔

میرے اوڑھنی کے درمیان فاصلہ وہ کم ہوتا  
 جا رہا تھا میں چاہتی تھی کہ وائبرٹ میں سوار ہو جاؤں  
 پھر میں نے دیکھا دریا کی موجوں نے اپنا ہر وہ پ بدلایا  
 وہ مگر مجھ بن گئے ایک نہیں..... درجنوں مگر مجھے..... وہ  
 اپنا منہ کھولے میری طرف بڑھ رہے تھے میں نے  
 ایک لمحے میں سوچا کہ کاش میں یہاں نہ آتی  
 ..... کاش؟ میں اپنے گھر میں ہوتی..... یہ گڑیا کیا مجھے

ان درجنوں مگر مجھ سے بچا سکے گی؟ ان کے منہ اتنے  
 بڑے تھے کہ وہ بیک وقت تین چار آدمیوں کو نگل سکتے  
 تھے ان میں سے ایک مگر مجھ جو چالیس فٹ لمبا اور  
 موٹا تھا میری طرف بڑھا مجھے اس بات کا یقین ہو گیا  
 کہ اب میں موت سے نہیں بچے سکتی موت کا احساس  
 ہوتے ہی میں خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی میں  
 کتنی دیر بے ہوش رہی مجھے کچھ اندازہ نہ ہو سکا لیکن  
 سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ میں مگر مجھ کے  
 پیٹ میں ہوں لیکن جب میں نے پوری طرح اپنی  
 آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو اپنے گھر کے کمرے  
 میں اور بستر پر دراز پایا۔ میرے سینے پر گڑیا رکھی تھی  
 لیکن اس کی اوڑھنی نہیں تھی میں نے سوچا کہ کہیں میں  
 بے ہوشی کی حالت میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟  
 میں یہاں کیسے پہنچی، مجھے یہاں کون لایا؟ وہ جزیرہ  
 سینکڑوں سال دور تھا میں نے چند لمحوں کے بعد نہ  
 صرف اپنے بدن کی چٹکیاں لیں بلکہ سوئی تک چھو  
 کر دیکھی یہ سپنا نہیں تھا ایک حقیقت تھی یہ بڑی عجیب  
 اور انتہائی پراسراری بات تھی جو میں مگر چھوٹوں سے سچ  
 کر یہاں آ گئی اگر گڑیا نہ ہوتی تو میں اسے سپنا ہی  
 سمجھتی۔

میں ایک اور نہایت اہم اور عجیب و غریب بات



کہنا چاہتی ہوں کہ اس گڑیا کی جو ادھنی تھی نہ جانے کہاں رہ گئی؟ کون لے گیا یا لے گیا سارا مال پر اسراریت اور جادو اس ادھنی کا تھا میں نے یہ گڑیا فروخت کے لئے رکھ دی اتنی خوب صورت، پیاری اور دلکش گڑیا کوئی اور نہیں ہے میرا خیال تھا کہ یہ گڑیا فوراً ہی کوئی نہ کوئی خرید لے گا؟ لیکن عجیب اور بڑی پر اسرار سی بات ہے کہ اس گڑیا کو کسی نے نہیں خریدا جب کہ وہ دوسری اور عام قسم کی گڑیاں بک گئیں کوئی اسے معمولی قیمت پر بھی خریدنے پر تیار نہیں ہوا تم پہلی کا ہک ہو جو اس گڑیا کو خریدنا چاہتی ہو تم اس کی جو بھی قیمت دو گی وہ میں لے لوں گی نہ بھی دو تو کوئی حرج نہیں۔

”اگر میں آپ کو دو سو روپے دوں تو کیا آپ اسے اتنی رقم کے عوض بیچ دیں گی؟“ چاندنی نے قدرے پش و پیش سے کہا۔

”میں اس کی اتنی کم قیمت اس لئے دے رہی ہوں کہ میں ایک معمولی سی لڑکی ہوں۔“

”میں تم سے بخوبی واقف ہوں۔“ آنٹی نے کہا۔

”تم جتنی حسین ہوتی ہو پیاری اور سیدھی سادی بھی..... عام لڑکیوں سے بہت مختلف، تم جیسی لڑکیاں خالی خالی ہی نظر آتی ہیں۔“

”تم بیس روپے بھی دو تو میں دے دوں گی۔ میں نے اسے کہیں سے خریدا ہی نہیں ہے مجھے اس بات سے خوشی ہو رہی ہے کہ اس گڑیا کو خریدنا چاہتی ہو جسے کوئی مفت میں لینے کو تیار نہیں ہے۔“

”بہت بہت شکریہ آنٹی! چاندنی نے ممنونیت سے کہا۔ پھر پرس سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھائے۔

”اس گڑیا کو میں اُمول اور یادگار تحفہ سمجھ کر رکھوں گی اس کے علاوہ آپ کا احسان بھی آپ نے تو میرا دل جیت لیا۔“

”نہیں بیٹی اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”آنٹی نے اس کے ہاتھ سے صرف سو کا ایک نوٹ لیا۔

”میرے لئے صرف سو روپے کافی ہیں تم اسے میری طرف سے تحفہ سمجھو۔ چوں کہ میرے کچھ کاروباری اصول ہیں اس لئے میں تمہیں وقت دینے سے قاصر ہوں۔ اس کا فروخت نہ ہونا آج بھی میرے لئے صرف پر اسرار بلکہ معرہ بھی ہے جیسے یہ اتنی بد صورت، مکروہ اور خفاک ہے کہ چڑیل معلوم ہوتی ہو جبکہ اتنی خوب صورت نہ تو کوئی گڑیا ہے اور نہ ہی قدریہ نوادرات۔“

چاندنی دکان سے باہر آئی تو خوشی سے اس کا برا حال تھا اور اس پر ایسی سرشاری جاری تھی کہ زمین پر اس کے قدم کسی شرابی کی طرح پڑ رہے تھے اور ہنک رہے تھے قدم کہیں اور گر گئی تھی تو کہیں اور پڑ رہے تھے۔ جیسے اس نے دنیا کی اُمول اور بہت بڑی دولت پائی ہو۔ یہ گڑیا اس کے لئے قارون کے خزانے سے کم نہ تھی۔ وہ خزانہ بھی مل جاتا تو شاید اس کے قلب کو وہ مسرت ہرگز نہ ملتی خواہے گڑیا سے ہو رہی تھی۔

یہ گڑیا اس کے من کو بہت بھائی تھی۔ آج تک کوئی چیز یا ہستی اس کے من کا اس طرح بھائی نہیں تھی۔ اس لئے وہ دل میں جتنی تیراں تھی اس سے کہیں زیادہ خوش..... ایسی موقعی صورت کی گڑیا کی گاہک کو پسند نہیں آتی تھی اور نہ ہی تھی جو دو برسوں سے آنٹی کی نوادرات کی دکان میں تھی اور سب سے خوب صورت اور بے مثال بھی تھی اور اس کی دل کشی کے آگے نوادرات کا حسن اور سحر ماند پڑ گیا تھا آخر کیوں اور کس لئے..... بات آنٹی کی طرح بڑی عجیب، پر اسرار اور معرہ کی تھی۔ وہ کسی چڑیل کی بھیا تک اور خوف ناک شکل و صورت کی نہ تھی۔

آخر اس کا اس گڑیا سے کیا تعلق تھا.....؟ اس نے دکان میں آنٹی کی نگاہیں بجا کر بے تحاشہ گڑیا کو چوم لیا تھا؟ یہ ایک بے جان گڑیا تھی..... جو نہ بول سکتی اور نہ حرکت.....؟ اس کے دل میں اس گڑیا کے لئے اتنی چاہت اور انسیت پیدا ہو گئی تھی جیسے اس نے جنم دیا ہو! اسے اب لگ رہا تھا جیسے یہ اس کی روح ہو؟ وجود ہو؟

گھر جاتے وقت بہت ساری باتیں اس کے دل و دماغ میں ایک ایک کر کے آ رہی تھی۔

آنٹی نے اسے اس گڑیا کے متعلق جو کچھ بتایا وہ یہ تھا کہ اس گڑیا کو نمایاں جگہ میں رکھنے کے باوجود کسی نے خریدنے کی کوشش کی اور نہ ہی اسے پسند کیا گا کہوں نے اسے بد صورت اور کسی نے تو چڑیل تک کہا تھا یہ بات ناقابل فہم تھی کہ اتنی خوب صورت گڑیا کیوں نہیں بکئی۔ شاید یہ سب کچھ اس لئے تو نہیں کہ یہ گڑیا اس کے نصیب میں تھی۔

چاندنی نے گھر پہنچ کر گڑیا کو پیکٹ میں سے نکالا پھر وہ اسے لے کر بستر پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر گڑیا کو سینے پر رکھ لیا گڑیا کی آنکھیں جو نہایت خوب صورت اور محو کن تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ گڑیا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے آج تک اسے کسی نے بھی ایسی محبت بھری نظروں سے نہیں دیکھا تھا گڑیا بول تو نہیں سکتی تھی لیکن اس کی دو بڑی آنکھیں جیسے بول رہی تھیں اسے کان نہیں دل سن اور محسوس کر رہا تھا تم نے بہت ہی اچھا کیا جو مجھے خریدا..... چاندنی ہو..... مجھے کسی نے بھی نہیں خریدا کس لئے..... اس لئے کہ جو مجھے خریدا نا جانتا تھا اور پسند کرتا تھا میں اس کی نظروں میں ایک دم سے بھیا تک اور خوف ناک شکل کی چڑیل بن جاتی تھی اس لئے کہ میں چاہتی تھی کہ صرف تم مجھے خریدو۔ میں تمہارا اس بزرگے پر بھی بھی انتظار کر رہی تھی اور میری ان جانی طاقت نے اسے جزیرے پر نوادرات کے بہانے سے کھینچا تا کہ وہ مجھے یہاں سے لے جائے۔ میں خود بھی آ سکتی تھی لیکن کسی وجہ سے خود سے نہیں آئی میں چاہتی تھی کہ تم اس دکان پر آؤ گی! آخر میں تمہارے ہاں آ گئی۔ آج وہ خوشی کا دن آ رہی گیا۔

چاندنی دفتر سے گھر آنے کے بعد نہایتی ضرور تھی۔ نہانے سے نہ صرف دن بھر کی تھکن اتر جاتی بلکہ سارے جسم میں جستی اور تازگی آ جاتی تھی۔ انگ انگ میں جو کسل مندی بھری ہوتی تھی وہ تھوڑی جاتی تھی پھر وہ

بڑے اطمینان اور آزادی سے شاور کے نیچے کھڑی ہو کر نہایتی اور سوچتی رہی تھی کہ وہ یہ تحفہ اپنی سہیلی کو نہیں دے گی وہ اسے اپنے کمرے میں رکھے گی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے کمرے میں گڑیا کے آتے ہی ایک عجیب سی رونق اور حسن آ گیا ہے اس گڑیا نے زینت بن کر چار چاند لگا دیئے ہیں۔

چاندنی نہانے کے بعد کمرے میں آ کر سنگھار میز کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر تو لیے۔ سے ہال اور جسم کو خشک کیا آئینے میں اسے کانس پر کھی ہوئی گڑیا نظر آئی جو اس کی پشت پر کانس پر کھی ہوئی تھی اسے ایسا محسوس ہوا کہ گڑیا کی آنکھیں مسکرا کے اس طرح سے دیکھ رہی تھی جیسے ایک مرد دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں صرف ستائش ہی نہیں بلکہ شوقی بھری ہوئی تھی۔ ان بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے زندگی بھی موجود ہے۔

”کتنی بڑی بات ہے گڑیا رانی.....“ چاندنی اس کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی اور شوق لہجے میں بولی۔

”اے..... کیا اس بے باکی سے دیکھتے ہیں؟“

چاندنی نے دیکھا کہ گڑیا کی آنکھیں مسکرانے لگیں وہ مسکراہٹ چہرے پر نکھر کے تبسم بن گئی ہے۔ ان میں ایک عجیب سی چمک کوندنے لگی چاندنی شرما اور لجا سی گئی جیسے واقعی کوئی عورت اسے دیکھ رہی ہو پھر اس نے اپنا تالیا گڑیا پر ڈال دیا۔

”اب تم دیکھ نہیں سکتی ہو؟“

پھر اس نے کپڑے پہن کر تالیا گڑیا کے اوپر سے اٹھایا اور بالکنی میں بندھی رہی پر پھیلا دیا۔ پھر بالکنی کا دروازہ بند کر کے وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تاکہ جائے بنا کر پھینکے۔ پھر وہ چائے بنا کر کمرے میں آئی تھی کہ اطلاع کتنی عجیب وہ پیالی میز پر رکھ کر دروازے کی طرف لپک گئی۔

چاندنی نے دروازہ کھولا اس کی تینوں گہری پیاری اور عزیزہ جان سہیلیاں نظروں کے سامنے کھڑی تھیں وہ ان سے بے حد بے تکلف بھی تھیں جب وہ



تینوں اندر داخل ہوئیں تو چاندنی نے دروازہ بند کر دیا  
انہیں نشست گاہ میں لاکر بیٹھا دیا۔

”لگتا ہے کہ تم تینوں کسی خاص مقصد کے تحت  
نازل ہوئی ہو؟“

”ہاں..... ہم تینوں چائے پینے اور تمہیں پارک  
لے جانے کے لئے آئی ہیں۔“

”ویری..... ویری گڈ..... میں بھی اسی وقت  
چائے پی کر باہر نکلنے والی تھی۔“ چاندنی نے کہا۔

”اچھے وقت پر آئیں میں تم لوگوں کے لئے گرم  
گرم چائے بنا کر لاتی ہوں میری چائے بیڈروم میں

رکھی ہوئی ہے اسے نہ لی لیتا کیوں کہ وہ ٹھنڈی ہو چکی  
ہوگی۔ تم لوگ جانتی ہو کہ میں زیادہ گرم چائے نہیں پیتی

ہوں۔“

چاندنی چائے بنانے کے لئے باورچی خانے کی  
طرف بڑھ گئی۔ شیدا اس کے بیڈروم میں داخل ہو گئی اس

نے جو گڑیا کو دیکھا تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی اسے لگا کہ  
کوئی ٹھنڈی مٹی سی ڈہن کارنس پر کھڑی مسکرا رہی ہے وہ

ٹھنک کر دیکھے جارہی تھی وہ ایک لمحے کے لئے اس کے  
حسن کے سحر میں کھو گئی وہ اسے محویت سے دیکھنے لگی۔

دوسرے لمحے وہ گڑیا کے سحر سے نکلی  
اور پھر چلائی گئی۔

”موننی..... سارہ..... جلدی سے آؤ.....  
تمہیں ایک چیز دکھاؤں..... ایک اصول کی چیز۔“

وہ دونوں چند ثانیوں کے بعد سرائیکی کے  
انداز میں بیڈروم میں گھس آئیں۔

موننا نے شیدا کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے  
پوچھا۔ ”کیا چیز ہے؟ کہاں ہے؟“

سارہ ادھر ادھر دیکھنے لگی ان کی نگاہ کارنس پر نہیں  
گئی تھی۔

”وہ دیکھو..... وہ دیکھو..... چاندنی ڈہن۔“ شیدا  
نے کارنس کی طرف اشارہ کیا۔

”کیا خوب صورت ہے.....؟ ایسا لگ رہا ہے  
کہ چودھویں کا چاند کمرے میں اتر آیا ہے۔“

”کیا کہا.....؟ چودھویں کا چاند.....؟“  
”واقی.....“ سارہ بولی۔

”کہاں ہے چاند؟“  
”وہ رہا.....“ موننا نے اس کی باتیں پکڑ کر کارنس

کی طرف اشارہ کیا۔  
”یہ کیا یہ نظر نہیں آ رہی ہے؟ چاندنی ڈہن۔“

”یہ چاند سا کھڑا کر یہ گڑیا نہ ہوتی..... اتنی ٹھنڈی  
ڈہن نہ ہوتی تو میں اسے جیج کی ڈہن کہتی۔“ سارہ

بولی۔  
”یہ گڑیا..... شاید چاندنی خرید کر لاتی ہے۔“ موننا

نے ہا۔  
”اس نے ہمیں بتایا نہیں۔“

”شاید یہ آج ہی خرید کر لاتی ہے۔“ سارہ بولی۔  
”کل میں اس سے مل کر گئی ہوں میں نے کل تو یہ

گڑیا نہیں دیکھی تھی۔“  
چاندنی اسی وقت مے میں گرم گرم بھاپ

اڑاتی ہوئی چائے کے لئے داخل ہوئی۔ اس وقت شیدا  
کارنس کے پاس جا کر گڑیا کو کارنس پر سے اٹھالیا۔

”معلوم نہیں کہاں سے خرید کر لاتی ہے؟“  
”یہ گڑیا کس قدر حسین ہے؟“ موننا بولی۔

”میں تو اس پر بری طرح مر رہی ہوں چاندنی تم  
یہ گڑیا کہاں سے خرید کر لاتی ہو؟“

”آئی کی دکان سے۔“ چاندنی نے جواب دیا۔  
”میں تو اس گڑیا رانی پر مر رہی ہوں۔“ شیدانے

اس کے پاس جا کر اسے اٹھالیا اور سینے میں جذب  
کرتے ہوئے کہا۔

”اری کیسی..... یہ گڈا نہیں گڈی ہے۔“ موننا  
نے کہا۔

”کوئی بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کاش یہ  
گڈا ہوتا تو میں اسے اپنا محبوب کہتی۔“

”اگر یہ جیج کا محبوب ہوتا تو کیا..... تو اظہار  
محبت کرتی؟“ سارہ ہنس پڑی۔

”کیوں نہیں۔“ شیدا بولی۔

”کیا تجھے شرم اور لاج نہیں آتی.....“ موننا نے  
کہا۔

”نہیں.....“ شیدانے سر ہلایا۔  
”یہ گریارانی ڈہن کے لباس میں کتنی پیاری لگ

رہی ہے؟ کاش جیج کی ہوتی اور یہ ہمارے قد و قامت  
کی ہوتی؟“

”بے شرم..... یہ کیوں نہیں کہتی کہ وہ مرد ہوتی  
اور تیرا محبوب۔“ موننا نے کہا۔

”یہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے میں تو اس  
پر ہزار جان نہیں بلکہ لاکھوں جان سے فریفتہ ہو گئی

ہوں۔“ شیدانے گڑیا کو سینے سے ہٹا کر اس کی آنکھوں  
میں جھانکا۔

”یہ گڑیا جس نے بھی بنائی اس نے بڑے کمال  
اور اس کی بہارت کا ثبوت دیا ہے۔“

”یہ گڑیا اور ہماری پیاری چاندنی بھی کتنی حسین  
ہیں۔“ سارہ بولی۔

”ذرا دور سے دیکھو تو ان دونوں میں ایسی  
مطابقت ہے کہ جڑواں لگتی ہیں۔ یہ ایک عجیب سا اتفاق

ہے۔“  
”اچھا بھئی..... گڑیا کی تعریفیں بند کرو، چائے

ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ چاندنی نے شیدا کے ہاتھ سے گڑیا  
لے کر کارنس پر رکھ دی۔

”میں نے اپنی زندگی میں کتنی ہی گڑیاں دیکھی  
ہیں اب تک ایسی پیاری گڑیاں لگا ہوں سے نہیں

کر رہی۔ اسے جس فنکار یا فنکارہ نے بنایا ہے اس نے  
اپنے فن کا نچوڑ اس میں بھر دیا ہے اگر اس گڑیا کی قامت

چار باج فٹ ہوئی اور اسے کسی ایسی جگہ رکھ دیا جاتا  
تو جو نظروں میں آئی تو لوگ اسے جیج کی ڈہن سمجھ

لیتے۔ گوکہ یہ بہت چھوٹی ہے اور اس پر کسی کھلونے کا  
گمان ہو رہا ہے لیکن جیج کی مٹی سی ڈہن لگ رہی

ہے۔ اس کی چمکتی آنکھیں بتا رہی ہیں کہ کسی بھی لمحے  
اس میں زندگی آ سکتی ہے اس میں اتنی جاویدیت اور ایسی

جلال کشی ہے کہ میرے دل کے نہاں خانے میں نقش ہوتی

جارہی ہے۔“ شیدا بولی۔  
ان تینوں نے چائے پینے کے بعد گھر سے نکلیں

اور قریم پارک میں جائیں۔ شام ہونے اور اندھیرا  
ہونے کے بعد کھانا کھانے کے لئے وہ ایک قریبی

ریسٹورنٹ میں گئیں کھانے کے دوران بھی گڑیا ان کا  
موضوع رہی۔ جب چاندنی نے انہیں اس گڑیا کی کہانی

جو آئی نے اسے سنائی تھی، سنائی تو انہیں اس عجیب  
، حیرت انگیز اور پراسرار کہانی کا یقین نہیں آیا۔ وہ

اوڑھنی کے بارے میں سن کر بولیں کہ آئی کو چاہئے کہ  
اب وہ پراسرار کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔

”وہ خالص کاروباری ہی نہیں بلکہ بڑی تیز  
اور گھاگ قسم کی عورت ہے۔“ موننا بولی یہ جھوٹی

اور عیار قسم کی بھی ہے۔ وہ اپنی چیز بیچنے اور گاہک کو بے  
وقوف بنانے کا فن بھی جانتی ہے اس لئے اس نے تمہیں

جھوٹی کہانی سنائی۔“  
”لیکن اس نے میرے ہاتھ یہ گڑیا صرف

سورپے میں بیچ دی۔“ چاندنی بولی۔  
”مجھے یہ گڑیا اس قدر پسند آئی کہ میں نے

ہزار میں بھی خریدنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اسے جھوٹ بولنے  
کی ضرورت کیا تھی؟ دو ہزار میں بیچتی..... سورپے میں

نہ دیتی۔“  
”تو اسے ہزار روپے میں بھی خریدنے کو تیار ہو گئی

تھی۔؟“ شیدانے تعجب بھرے لہجے میں کہا۔  
”کیا تو اس پر اس قدر مر رہی تھی؟“

”معلوم نہیں کیوں؟ چاندنی نے جواب دیا۔ اس  
گڑیا کی خوب صورتی نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں خود

اس کی وجہ مجھے سے قاصر ہوں لیکن جب اس نے  
سورپے میں میرے ہاتھ بیچ دیا تو یقین نہیں آیا

اور پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ اس گڑیا کو دو برس میں کوئی  
بھی کوڑی کے دام خریدنے کو تیار نہیں تھا۔“

”یہ تیرے نصیب میں تھی اس لئے تجھے مل  
گئی۔“ سارہ نے کہا۔

”اگر میں تیری جگہ ہوتی تو میں اسے دو ہزار



روپے میں خرید لیتی اس لئے کہ ایسی بیماری گزرا میں نے  
سپنوں میں بھی نہیں دیکھی۔“

☆.....☆.....☆

دوسرے دن رات کے وقت وہ گہری نیند میں  
ڈوبی ہوئی سپنوں کی ان جانی وادی میں چلی جا رہی  
تھی۔ اس نے ایک محبوب کا ہاتھ تھاما ہوا تھا وہ دونوں  
شامی مخلوں، ہر سبز وادیوں اور پہاڑوں پر سے جیسے  
پرداز کر رہے تھے جب بھی وہ سونے کے لئے بستر  
پر جاتی تو کچھ دیر پہلے نشست گاہ میں بڑے صوفے  
پر نیم دراز ہو کر کوئی رومانی ناول ضرور پڑھتی تھی۔ اسے  
مطالعہ کا شوق ہی نہیں بلکہ جنون تھا۔ اس طرح اسے  
نیند آتی تھی جب نیند آتی اور پلکیں بھاری ہونے لگتیں  
تو وہ بیڈروم میں چلی جاتی تھی آج وہ ایک رومانی ناول  
پڑھ رہی تھی کہ نیند نے اسے دیوبچ لیا۔ نیند میں جو اس  
کا محبوب دیوبچ لیتا تو وہ ہڑ بڑا کے بیدار ہو جاتی تھی  
اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ سپنوں کا محبوب حد سے  
تجاوز کر رہا ہے آج بھی اسے نیند کی آغوش میں کسی  
بات کا احساس نہیں رہا۔ وہ چانک گہری نیند سے اس  
طرح بیدار ہو گئی جیسے کوئی اس کے ساتھ من مانیاں  
کر رہا ہو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے ان جانے  
سننے سے وہ بیدار کیسے ہو گئی ایسے سپنوں میں وہ اتنی  
دور چلی جاتی تھی کہ واپسی کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا، اس  
نے دیکھا کہ نشست گاہ میں روشنی ہو رہی ہے وہ کہانی  
پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی کھلی کتاب اس کے سینے پر رکھی  
ہوئی تھی اس نے کتاب اٹھائی اس کا رنگین سرورق بڑا  
رومانی اور جذباتی تھا جب وہ کتاب بند کر کے رکھنے لگی  
تو اس کا سینہ دکھ سے ہو کر رہ گیا سامنے والے صوفے  
پر شیلا بیٹھی ہوئی تھی۔

دوسرے لمحے اس نے اپنے ڈر اور خوف  
پر قابو پایا۔ اس پر حیرت غالب آ گئی اس کی سمجھ میں نہیں  
آیا کہ شیلا اس کے فلیٹ میں کیوں کر آ گئی۔  
نیچے جو فلیٹ تھا وہ میاں بیوی کا تھا وہ دو ماہ کے لئے  
اندرون ملک اپنے رشتہ داروں کے ہاں بیاہ میں شرکت

کے لئے گئے ہوئے تھے وہ نیچے والے زینے کا دروازہ  
بند کر کے اور تالا لگا کر آئی تھی اور اپنے کمرے کا باہر کھٹے  
والا دروازہ بھی مقفل کر دیتی تھی کیوں کہ وہ اکلی رہ رہی  
تھی اندر آنے کا کوئی متبادل راستہ بھی نہیں تھا کوئی بھی  
اندروال ہو سکتا تھا تین ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک جوڑا  
تیسری منزل پر رہتا تھا شوہر ٹائٹ ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا اس  
کی بیوی اکلی اور ناجائز حالت میں سو رہی تھی اس  
نے دروازہ ٹھیک سے بند نہیں کیا ہوا تھا دو ڈکیت  
جو چوری کی نیت سے آئے تھے دروازہ بٹھا دیکھ کر اندر  
گھس آئے تھے پھر وہ دونوں درندے بن کر راج ٹیک  
رہے تھے وہ اس روز سے دہشت زدہ اور بے سہارا  
ہو گئی تھی چوہا بلی بھی فلیٹ میں گھس کر نہیں آ سکتی تھی آج  
شیلا کی سال گرہ تھی اور وہ رات دس بجے ہی تولوئی کی  
لہذا شیلا کا آنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

حالی کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر پڑی۔ اس میں را  
ت کے دو گھنٹے میں باجی منٹ باقی تھے یہ بات نہ صرف  
حیرت انگیز بلکہ اسے ہراساں بھی کی۔  
”شیلا..... تم؟ اس وقت.....؟“ چاندنی ہڑ بڑا  
کر اٹھی۔ اس کا لہجہ تیز و زور تھا۔  
”تم یہاں کیسے؟“

”ہاں میں شیلا ہی ہوں۔“ اس نے اپنا سر ہلایا۔  
”اس میں اس قدر حیرانی اور پریشانی کی کیا بات  
ہے؟ کیا میں تم سے ملنے کی وقت بھی نہیں آ سکتی؟ کیا  
میں اس سے پہلے نہیں آئی؟ میں تم سے زیادہ دور تو نہیں  
رہتی ہوں؟“

لیکن اتنی رات گئے ایک نوجوان اور حسین عورت  
کا اکیلے نکل کر آنا.....؟ اتنی رات کوئی سواری بھی  
تو نہیں ملتی ہے۔ راستے میں کوئی بد معاش کیا شریف  
آدی بھی شیلا کو دیکھ کر ہبک سکتا تھا۔

”لیکن شیلا..... تم اندر کیسے  
آئیں.....؟“ چاندنی کی حیرانی دو چند ہو گئی۔  
”میں نے نیچے والا زینے اور اس فلیٹ کا دروازہ  
بھی مقفل کیا ہوا تھا۔“

”نیچے تمہارے فلیٹ کا دروازہ بھی کھڑا ہوا سا تھا  
لئے میں آسانی سے اندر آ گئی۔ اس کمرے میں  
میں دیکھی تو میں سمجھی کہ تم جاگ رہی ہو؟“ اس نے  
اب دیا۔

”اچھا.....“ چاندنی چکر اسی گئی۔  
”حیرت کی بات ہے کیوں کہ مجھ سے کبھی ایسی  
بات اور بھول نہیں ہوتی ہے خیر، لیکن تم اس وقت کس  
لئے آئی ہو کیا کوئی ضروری کام آنا پڑا ہے؟“  
”میں گزرا کو ملے جانے آئی ہوں۔“ شیلا نے  
اب دیا۔

”میں دو راتوں سے اس کے فراق میں ایک پل  
کی نہیں سو سکی ہوں۔“  
”گزرا.....؟“ چاندنی بری طرح چونک پڑی  
اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تم ہوش میں ہو؟ نیند میں تو نہیں ہو؟“  
”ہوش میں کہاں ہوں؟“ شیلا سر دھڑکے  
لی۔

”معلوم نہیں اس گزرا نے مجھ پر کیا جادو کیا ہے  
اب سے اسے دیکھا ہے اپنے حواس کو بھی نہیں ہوں۔“  
”معاف کرنا شیلا! میں نہیں یہ گزرا نہیں دے  
سکتی۔“ چاندنی نے سازشی کا پلو درست کرتے ہوئے  
کہا۔

”میرے اس انکار کا تم کچھ غلط مت خیال  
کرنا..... پلیز۔“  
”کیوں نہیں دینا چاہتی ہوں؟“ شیلا نے حیرت  
سے سوال کیا۔

”کیا میں تمہاری سہیلی نہیں ہوں؟“  
”اس لئے کہ میں نے اسے بہت احتیاط سے  
اور بہت ہی سنبھال کر رکھا ہوا ہے مجھے اس سے محبت  
ہو گئی ہے جیسے یہ میری کوئی بڑا جان ہو۔ ہم دونوں  
میں کسی قدر مشابہت بھی تو ہے۔“  
”لیکن مجھے بھی تو اس سے جذباتی لگاؤ اور شوق  
ہو گیا ہے میں اس کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی

ہوں۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔  
”اگر ایسی ہی دیوانگی ہے تو تم ایسا کرو کہ آئی کی  
دکان پر چلی جاؤ آئی نے ساری دنیا کی خوب صورت  
گزرا میں سچائی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی گزرا  
پسند آ جائے گی۔ اگر وہاں پسند نہ آئے تو کسی اور دکان  
پر چلی جاؤ شہر میں بہت ساری دکانیں ہیں۔“  
”مجھے تمہارے اس مشورے کی کوئی ضرورت  
نہیں ہے؟“ شیلا نے لپکا حیر لہجے میں کہا۔  
”یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ چوں کہ میرا دل اس  
گزرا پر آ گیا ہے اس لئے اسے لے جانے آئی ہوں۔“  
”شیلا..... میری جان افسند نہ کرو۔“ چاندنی نے  
اسے بڑے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ میری دل پسند چیز ہے میں اسے نہیں دے  
سکتی۔ کیوں کہ اسے دیکھ دیکھ کر میرا دل خوش ہو جاتا ہے۔  
اور قلب کو ایک عجیب سی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔“  
”دیکھو..... ہٹ دھرمی کرو گی تو میں جبر و زور سے  
اسے لے جاؤں گی۔“ شیلا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی

۔  
”تم میں اگر ہمت ہے تو مجھے رک کر دیکھ لو۔“  
”نہیں تم اسے زبردستی نہیں لے  
جا سکتیں؟“ چاندنی کو بھی خندا آ گئی۔  
شیلا غصے میں آ کر کمرے کی طرف بڑھنے لگی  
تو چاندنی نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔

”میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ میرے سامنے سے  
ہٹ جاؤ چاندنی۔“ شیلا کسی ناگن کے انداز میں  
پھنک رہی۔  
”ورنہ تمہاری خیر نہ ہوگی میں تمہیں ختم کر دوں  
گی۔“

”شیلا.....“ چاندنی کی آنکھیں حیرت و خوف  
سے پھیل گئیں اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔  
”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو میری جان! کہیں تم مذاق  
تو نہیں کر رہی ہو؟“  
”ہاں..... میں سنجیدہ ہوں مذاق نہیں کر رہی



ہوں۔“

شیلا نے اتنا کہہ کر چاندنی کو شیلے برساتی آنکھوں سے گھورا تو چاندنی بری طرح سہم گئی۔ اس نے کسی شیلہ کی ایسی خوف ناک اور سرخ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں یہ آنکھیں کسی مرد، کسی لڑکی عورت کی نہیں بلکہ کسی ناکس کی طرح دکھائی دے رہی تھیں وہ دہشت زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”تم میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہو.....؟“

”مذاق تو تم کر رہی ہو جو میرے دل کی رانی کو لے جانے نہیں دے رہی ہو؟“

شیلا نے اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ شیلا نے چاندنی کا بازو پکڑا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے بازو پر کھولتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو چاندنی کے سارے بدن میں آگ برتی رو کی طرح پھیل گئی وہ درد سے کراہ کر رہ گئی تڑپے لگی۔

چاندنی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ شیلا کو ہو کیا گیا ہے اس کی آنکھیں اس قدر سرخ اور خوف ناک کیسے ہو گئیں؟ اور پھر اس کے ہاتھ میں اتنی طاقت کہاں اور کیسے آگئی؟ اور پھر اس گڑیا کے حصول کے لئے اس پر اس قدر دیوانگی اور جنون کیوں کر طاری ہو گیا جبکہ اس نے اپنی سالگرہ میں گڑیا کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ کسی نے اپنی زندگی میں ایسی خوب صورت اور پیاری سی گڑیا نہیں دیکھی ہوگی لیکن اس نے اپنی محبت کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا اور محبت کا کوئی اظہار..... لیکن اب یہ سب کچھ کیا ہے؟

شیلا چند لمحوں کے بعد دوسرے کمرے میں تھمس تو چاندنی بھی دہشت زدہ ہونے کے باوجود اس کے پیچھے پیچھے گئی تھی شیلا نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے جیسے ہی گڑیا کو ہاتھ لگایا اور اسے اٹھانے کا ارادہ کیا تو گڑیا کی آنکھیں غضب ناک ہو گئیں شیلا نے جیسے ہی ہاتھ لگایا تو اس کے ہاتھ اس طرح سے ایک جھٹکے سے الگ ہو گئے جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہوا اس نے دیکھے انگاروں کو چھو لیا ہو۔

شیلا خوف زدہ سی ہو کر اچھل پڑی، پھر اس میں گڑیا کو چھونے اور ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں ہوئی اس کا ہاتھ بری طرح جھل گیا تھا شیلا نفرت اور غصے سے گڑیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے غضب ناک ہو کر گھر سے باہر ہی تھی۔ چاندنی کو ایسا لگا کہ جیسے وہ دونوں لگا ہوں کی زبان میں باتیں کئے جا رہی ہوں گڑیا کی خوب صورت بے جان اور نمندگی میں بے حس و حرکت..... لیکن ان میں جیسے جھگڑا یاں بھڑک رہی تھیں جبکہ شیلا کی آنکھیں تجسس ہی تھیں چند لمحوں تک وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہی تھیں جیسے ایک دوسرے سے نفرت اور غصے کا اظہار کر رہی ہوں۔

پھر ایک لمبے شیلا سرعت سے مڑی اور اس کے پاس سے گزرتی ہوئی نشست کی طرف چلی گئی۔

چاندنی اس کے پیچھے پیچھے نہیں گئی کیوں کہ اسے شیلا سے ایک انجانا خوف محسوس ہو رہا تھا پھر اس نے گڑیا کی طرف دیکھا اس کی خوب صورت اور محسوس آنکھوں میں سابقہ گفتگو کی نہ تو وہ انگاروں کی طرح سرخ تھیں اور نہ ہی غضب ناک..... مسکراتی ہوئی تھیں جو اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں چاندنی کو اس کی آنکھوں پر بے اختیار پیارا تھا تو اس نے گڑیا کو اٹھا کر چوم لیا۔ پھر واپس کارنس پر رکھا تو دیکھا اس گڑیا کی آنکھیں مدھمکی ہو گئی ہیں۔

لیکن چاندنی کے لئے یہ امر بڑا حیران کن تھا کہ گڑیا کی ان آنکھوں میں شیلا کو دیکھ کر جو کیفیت پیدا ہوئی تھی اب اس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اور پھر یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ شیلا اس چھوٹی سی گڑیا کو اٹھا کر کیوں نہ لے جا سکی اس نے جیسے ہی گڑیا کو ہاتھ لگایا تو اسے زبردست برقی جھٹکا ایسا لگا تھا جیسے اس گڑیا میں بجلیاں بھری ہوئی ہوں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟

کہیں یہ گریبا جیج کی پرستان کی شہزادی تو نہیں ہے؟ وہ شاید جادو منتر جانتی ہے اس لئے کسی کی مجال

نہیں کہ کوئی اس کی مرضی کے خلاف لے جائے جسے وہ کسی وجہ سے ناپسند اور نفرت کرتی ہو؟

یہ اسرار اور معمہ جو وہ حل نہیں پائی تھی اس کی عزیز از جان اور محسن سہیلی کو کیا ہو گیا تھا؟ اس پر اتنی رات گئے پاگل پن کا دورہ کیوں پڑا تھا شیلا نے اس سے کیوں کہا تھا کہ وہ قریب ہی رہتی ہے یہ جھوٹ بات تھی وہ دور رہتی تھی اس کا گھر یہاں سے پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ رات کو ایک حسین، نوجوان اور پرکشش لڑکی منہ اٹھائے صرف ایک گڑیا کے لئے چلے آنا بے وقوفی کی بات تھی کیوں کہ رات میں کوئی بھی ایک نوجوان لڑکی کو ایکی قابو میں کر سکتا تھا اور پھر وہ ایسے نامناسب لباس اور بے عجبائی کی حالت میں تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

چاندنی بری طرح الجھ سی گئی تھی۔ بہت ساری باتیں ایسی تھیں جو نہ صرف ناقابل فہم بلکہ پراسرار اور دہشت ناک تھیں وہ ان کے بارے میں جتنا سوچتی اتنا ہی الجھتی تھی جاری تھی پھر اسے خیال کہ دروازہ بند کر لینا چاہئے شیلا دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی۔ اس عمارت کے نوجوان لڑکے اور مرد جانتے تھے کہ وہ ایکی رہتی ہے لڑکوں اور مردوں کی آمد رفت کا وقت مقرر نہیں ہوتا ہے وہ دروازہ کھلا دیکھ کر کسی صاحب یا گ کی طرح محسوس کرتے تھے اسے ان کا ڈسٹا کچھ مشکل نہ ہوتا۔

وہ لپک کر کمرے میں تھمس گئی اور دروازے کے پاس گئی تو اس کی حیرت کی انتہا رہی دروازہ بند تھا اور اندر سے اس کی چٹکی لگی ہوئی تھی شیلا اس کمرے میں آ کر کونسا سے اور کیسے گئی؟ معاً اس کی نگاہ باہر کھلنے والی کھڑکی پر پڑی جو قدرے کھلی ہوئی تھی لیکن اس کھڑکی میں گرل کی ہونٹیں ملاخوں کے درمیان سے صرف بی کا بچہ ہی آ سکتا تھا لیکن اس میں سے اس کا آنا اس لئے مشکل تھا کھڑکی بہت اونچائی پر تھی بی کے آنے کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا کوئی پائپ بھی نہیں تھا جس سے کوئی اوپر اور نیچے چڑھا اور اتر سکے۔

لیکن یہ کھڑکی کیوں کھلی ہوئی ہے اور اسے کس

نے کھولا۔؟ کیوں؟ وہ اس کھڑکی کو کھولتی نہیں تھی اس لئے کہ سامنے جو عمارت تھی اس سے اس کھڑکی سے اس کے کمرے کی بے پردگی ہوتی تھی وہ کھڑکی بند کرنے کے خیال سے بڑی کھڑکی بند کرتے وقت اس نے نیچے والے پیچھے پر ایک حسین ناگن کو کنڈی مار کر بیٹھے دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا اس کے نہ صرف ہاتھ خنڈے ہو گئے بلکہ سارے بدن پر پسینہ پھوٹ پڑا اس ناگن نے آہٹ سن کر بچھن اٹھا کر اسے گھورا اس میں نفرت، حقارت اور غصہ بھرا ہوا تھا وہ اس کی غضب ناک نظروں کی تاب نہ لا سکی اور پھر اس کے بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔

☆.....☆.....☆

کیا وہ خواب تھا؟ اس نے سوچا ہاں شاید وہ ڈراؤنا خواب ہی تھا۔ اس نے اپنے سر کو بڑے زور سے جھٹکا۔

آگر وہ حقیقت ہوتی تو اس وقت وہ اس کمرے میں کھڑکی کے پاس بے ہوشی کی حالت میں موجود ہوتی گھر میں ایسا کوئی فرد نہ تھا جو اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دے..... یا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہوش میں آ کر سونے کے لئے بستر پر آگئی ہو؟ نہیں، ایسا نہیں..... اگر ایسا ہوتا تو پھر اسے یاد آ جاتا..... اف، یہ کیا ڈراؤنا خواب تھا۔ وہ ناگن نفرت اور غصے سے کہیں خوف ناک لگ رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے ڈس لے گی؟ آگر وہ سچ بچ کی ناگن ہوتی اور یہ حقیقت ہوتی تو اسے یقیناً ڈس لیتی..... اس وقت وہ دنیا میں نہیں آسمان پر ہوتی۔

اس نے ٹپکے پر اپنا سر لگا کر گڑیا کی طرف دیکھا جو کارنس پر اپنی جگہ موجود تھی۔ اس کے چہرے پر دمک سی تھی اور آنکھوں میں شوخی بھری ہوئی تھی گڑیا کی آنکھوں کی شوخی اس سے جیسے بہت کچھ کہہ دے رہی تھی۔ اسے اس روز کے رات کا پسینا یاد آ گیا جس میں گڑیا نے اسے اپنی تعرش میں لے کر بڑی پیار بھری باتیں کیں اس کے حسن و شباب کی تعریف کی اور اسے



بہت پیار بھی کیا تھا جیسے وہ اس کا محبوب ہو چاندنی نے گڑیا کو کالس سے اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

”میری رانی گڑیا..... آپ بڑی شریہ ہیں اس رات میرے سینے میں مجھے بہت پیار کیا جیسے میں آپ کی محبوبہ ہوں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا نا.....؟“ چاندنی نے اسے چوم کر اس کی آنکھوں میں جھماکا تو اس کی آنکھیں جیسے بولیں۔

”سارا دوش تمہارا؟“

”اس میں میرا کیا دوش!“ چاندنی نے قدرے توقف کے بعد اس کا گال تھپ تھپایا۔

”تمہارے حسن و شباب کا دوش ہے جس نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ تمہارے حسن کی رعنائیوں نے مجھے اسیر بنالیا ہے کاش! میں مرد ہوتی مجھے تم سے اتنی محبت ہو جائے گی میں سوچ نہیں سکتی۔“ گڑیا کی زبان جیسے کہنے لگی تھی۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں کا وجود ایک دوسرے کی ذات کا وجود ہیں۔“ چاندنی کہنے لگی۔

”جانتی ہو رات میں نے کیا ڈراؤنا خواب دیکھا۔؟“ پھر اس نے مختصر طور پر اپنا خواب سنایا پھر بولی۔

”ایک ناگن میری سہیلی کے روپ میں تمہیں مجھ سے چھین لیتا چاہتی تھی اگر وہ خواب نہ ہوتا حقیقت ہوتی اگر وہ ناگن تمہیں مجھ سے چھین کر لے جاتی تو جانے میرا کیا ہوتا؟ میں شاید زندہ نہ بچ پاتی۔“ اتنا کہہ کر چاندنی جذباتی ہونے لگی۔

”دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی..... ایک کیا ہزار ناگنیں بھی..... لہذا تم اس بات سے فکرمند اور پریشان اور ہراساں نہ ہو۔“ گڑیا نے اسے جیسے دلاسا دیا۔

پھر ایک نکتہ گڑیا اس کے ہاتھ سے پھسل کر اس کے چہرے پر گر پڑی چاندنی نے ایک عجیب سی بات محسوس کی کہ اس گڑیا کے رخساروں اور ہونٹوں نے جیسے اس کے گالوں اور ہونٹوں کو چوم لیا اور اس میں جذب

ہو گئے سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کالس بڑا لطیف انوکھا اور پر کیف تھا جیسے گڑیا کوئی جان دار سستی ہو۔ پھر وہ گڑیا کو سینے سے لگا کر مہری نیند سو گئی۔

دوسرے دن رات بارہ بجے تک وہ اپنے کمرے میں بستر پر نیم دراز ہو کر ایک روحانی جذباتی ناول پڑھ رہی تھی کہ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ لگی اسے جبر تک نہیں ہوئی اس نے مہری نیند میں محسوس کیا کہ وہ کسی کی آغوش میں ہے اس کی گرفت بہت سخت ہے۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے اس کی پسلیاں ٹوٹ رہی ہیں اور جیسے اس کی جان لگی جا رہی ہے سینے میں دم ٹھٹھ رہا ہے گرم گرم سائیں اس کے چہرے اور ہونٹوں کو جلتے دے رہی ہیں اسے ایک بل کے ہزاروں جیسے میں خیال آتا کہ شاید اس کے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا ہو اور رات گئے روشنی دیکھ کر کھس آیا ہو وہ چوں کہ رات کو صرف چولی اور لنگا پہن کر سوئی تھی لہذا اس حالت میں کسی درندہ صفت مرد نے دیکھ کر اسے دبوچ لیا ہے وہ بے بس ہو گئی ہے وہ حد سے بخاؤڑ کرنے والا ہے۔

وہ اس کی گرفت میں کسمپاسی کی آواز کی آنکھ کھل گئی اس نے دیکھا کہ ایک ناگن اس کے جسم سے لپٹی ہوئی ہے اور اس نے اپنا چہن اٹھا رکھا ہے اور اپنی پارک زبان باہر نکال رہی ہے اور شعلہ بار لگا ہوں سے ٹھوکر رہی ہے۔

اس ناگن کو دیکھتے ہی چاندنی کا جسم دہشت سے لرزے لگا وہ غش کھاتے کھاتے رہ گئی اس میں اتنی طاقت اور ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ ناگن کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتی۔

”اگر تم اپنی سلامتی اور زندگی چاہتی ہو تو اس گڑیا کو کھڑکی سے باہر پھینک دو۔“ ناگن نے انسانی اور نسوانی آواز میں کہا۔ ایک ناگن کو انسانوں کی طرح بات کرتے دیکھ کر چاندنی کو یقین نہیں ہوا وہ خوف سے زیادہ تھیر زدہ ہو گئی۔

چاندنی نے بہ وقت تمام اپنے خوف و ہراس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”تم اس بے جان گڑیا کو لے کر کیا کرو گی؟“

”میں کیا کروں گی کیا نہیں کرو گی یہ میرا مسئلہ ہے میں تم سے جو کہہ رہی ہوں جو حکم دو رہی ہوں وہ گرو۔“ ناگن نے خشونت آمیز لہجے میں کہا۔

”جھٹ نہیں کرو۔“

”نہیں..... نہیں۔“ چاندنی اس کی گرفت میں محسوساتی ہوئی بولی۔

”یہ میری پیاری گڑیا ہے، میں اسے خرید کر لائی ہوں۔“

”میں تمہیں اس کی منہ مانگی قیمت دے سکتی ہوں..... سوئے، ہیرے، جواہرات کے زیورات لار ایک بڑی رقم بھی۔“ ناگن نے تیز لہجے میں کہا۔

”میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“

”تم ساری دنیا کے خزانے بھی میرے قدموں تلے ڈال دو گی تب بھی میں یہ گڑیا نہیں دوں گی۔“ چاندنی نے نہ جانے اتنی ہمت ہاں سے آگئی تھی اس میں ہمت بھی پیدا ہوئی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کا خوف آپ ہی آپ مٹ ہونے لگا ہے۔

”تم اس معمولی گڑیا کے لئے لاکھوں کی دولت کو ٹھکر کر رہی ہو.....؟ بے وقوف نہ ہو کیوں تم اس کی خاطر اپنی جان دینا چاہتی ہو۔“ ناگن چٹکلائی۔

”کیا تمہاری مت ماری گئی ہے؟“

”میرے لئے یہ گڑیا لاکھوں کی دولت سے کہیں زیادہ اس لئے عزیز ہے کہ اس سے جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ جیسے یہ گڑیا نہیں بلکہ میری بہن ہے..... میرا خون ہے ہم دونوں نے جیسے ایک ماں کی کوکھ سے ہم لیا ہو۔“ چاندنی نے جواب دیا۔

”تم نہ صرف بہت حسین ہو بلکہ نوجوان بھی ہو۔“ ناگن کہنے لگی۔

”اور پھر تم ایک انسان ہو، تمہارے لئے یہ گڑیا ہمیں کام کی نہیں ہے یہ تمہیں پتہ نہیں دے سکتی اس کے لئے تم اپنی بھری جوانی اور زندگی غارت نہ کرو۔“

”میں چاہے دولت لے لو اور اپنا مستقبل بنا کر کسی مہارانی

کی طرح عیش کی زندگی گزار دو۔“

”یہ گڑیا جب میرے کسی کام کی نہیں ہے تو پھر تمہارے کسی کام کی ہو سکتی ہے؟“ چاندنی نے ٹھہرا کر کہا۔

”اسے میں نے یوں بھی کمرے کی سجاوٹ کے لئے رکھا ہے۔“

”یہ گڑیا میرے کسی کام کی ہے یا نہیں.....؟ یہ میں جانتی ہوں۔“ ناگن جھک کر بولی۔

”تم میری بات مان جاؤ بے جا ضد اور ہٹ دھرمی نہ کرو۔ اس گڑیا کو باہر پھینک دو۔“

چاندنی کی نگاہ معاً گڑیا پر پڑی اس نے محسوس کیا کہ گڑیا کی آنکھیں ناگن کی بات ماننے سے منع کر رہی ہیں اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا اس نے ناگن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”بہتری اسی میں ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو..... کیوں کہ میں تمہاری کوئی بھی بات اور کوئی حکم مان نہیں سکتی جس طرح آئی ہو اسی طرح چلی جاؤ، میری گڑیا رانی اسی کمرے میں رہے گی۔“

”تم نے نہیں جانتی ہو کہ میں کون ہوں.....؟“ ناگن نے رعوت سے کہا۔

”اس لئے مجھ سے بہت سوچ کر ابھرو۔“

”واقعی میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو.....؟ لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ناگن کے روپ میں شاید کوئی بدروح ہو جو ناگن کا روپ دھار کر مجھ سے انسانوں کی طرح بات کر رہی ہو مجھ پر رعب ڈالنے اور خوف زدہ کرنے اور جان لینے کی دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں..... پیدا آئی ناگن ہوں مجھے سو برس تک ناگوں کے سب سے بڑے کالے مندر میں ہر برس ساون میں اماؤں کی رات دو انسانی جانوں کے خون سے نہ صرف اشان کر دیا گیا بلکہ چڑھایا بھی گیا جس سے میں نے انسانی عورت کا روپ دھار لیا میں جو روپ چاہے بھر سکتی ہوں اور اس پر مجھے عمل اختیار ہے میرے آگے سامری جاؤ گری بھی پانی بھرتا ہے۔ میں جو جاؤ



جانتی ہوں اور مجھ میں جو شکتی ہے وہ کسی ناگن کو نہیں  
نہیں ہے اس لئے مجھے سورن مہارانی کہا جاتا ہے میں  
انسانی خون کی پیاسی ہوں جب مجھے کوئی انسان ہاتھ لگا  
ہے ایک پیاس کی طرح پل بھر میں اس کا خون پانی کی  
طرح پی جاتی ہوں اس لئے انسانی خون پی کر بہت ہی  
طاقت و دراز ناقابلِ تسخیر ہوگئی ہوں تم نے میری بات  
اگر نہیں مانی تو تمہارا بھی خون پی جاؤں گی اور تم سے  
کہیں بے پناہ حسین ہو جاؤں گی اس گڑیا سے بھی  
زیادہ..... پھر مجھ جیسی حسین اس دنیا میں کوئی نہیں  
ہوگی۔“

پھر ایک کرخت ترختی ہوئی نسوانی آواز فضا میں  
گونجی۔  
”تو کیا اپنی جان بخشی چاہتی ہے یا اپنا  
خاتمہ.....؟“  
”مجھے شام کر دو..... میری جان بخشی  
کر دو۔“ ناگن بڑبڑاتی اور لڑکھائی کے انداز میں کہتی تھی۔  
”میرا خاتمہ نہ کرو۔“  
”میری ایک شرط پر تیری جان بخشی ہو سکتی ہے  
مکار۔“ اس کرخت آواز نے اسے جیسے لگا۔  
”مجھے ہر شرط منظور ہے..... ہر شرط منظور  
ہے۔“ وہ منت سماجت کرنے لگی۔  
”جلدی سے مجھے شرط بتاؤ۔ میں اسے پورا  
کر دوں گی۔“

”تم وچن دو کہ اب یہاں کبھی بھی نہیں  
آؤ گی۔ اور اس محسوس چاندنی کو تنگ اور ہراساں  
نہیں کرو گی؟ اس کا خون نہیں پینا؟“  
”میں وچن دیتی ہوں کہ اب یہاں کبھی نہیں  
آؤں گی اور اس لڑکی کو پریشان نہیں کرو گی اور نہ ہی اس  
کا خون پیوں گی؟“  
”تم بہت جھوٹی مکار اور فریبی ہو لیکن میں  
پھر بھی تمہاری بات ماننے لیتی ہوں۔“

پھر اس کرخت آواز نے کہا..... پھر اس کمرے  
کی کھڑکی پر پڑے ہوئے پردے آپ ہی آپ ہٹ  
گئے پھر کھڑکی کے پٹ بھی کھل گئے پھر چاندنی نے  
حیرت سے دیکھا ناگن ایک دم سے ننگی چڑیا بن گئی  
اور کھڑکی پر پہنچی پھر گرل کے درمیان میں سے اڑتی ہوئی  
باہر نکل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل  
ہو گئی۔

چاندنی تھوڑی دیر تک جھونچکی سی بیٹھی رہی اس  
پر ایسا سخت طاری تھا جیسے کوئی بجلی سی آگری ہو۔ اس کی  
سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ سب کیا ہے..... یا یہ کوئی  
خواب تھا؟ وہ خواب ہی تھی اگر اس کا بدن درد سے

”اگر تم واقعی اتنی ہی طاقت ور اور ہر قسم کا جادو  
جانتی ہو تو پھر جادو کے زور سے اس گڑیا کو کیوں نہیں  
لے جا رہی ہو؟“ چاندنی نے طنز سے لہجے میں کہا۔  
”ایک ایسی بات ہے جو میں نہیں بتا نہیں سکتی  
اور نہ ہی میں جادو چلا سکتی ہوں میں بے بس سی ہو گئی  
ہوں ورنہ میں تم سے نہیں کہتی میں اس گڑیا کو لے کر نہ  
جانے کب کی غائب ہو چکی ہوتی ایک ایسی بات ہے  
جس کے آگے میں بے بس سی ہوں اس مجبوری نے مجھے  
باندھ دیا ہے..... تم میری بات مان لو..... انکار نہ  
کرو..... پچھتاؤ گی میں تمہارا خون پی جاؤں گی تم  
پر ترس نہیں کھاؤں گی۔“

ناگن نے اتنا کہہ کر چاندنی کو جواب دینے کا  
موقع نہیں دیا اور اپنا خوب صورت چہن لہرایا اور اس کے  
چہرے پر جھک کر اس کے گلے کے نیچے ڈسنا  
چاہا تو چاندنی دہشت زدہ ہو گئی اور اس کا چہرہ سفید پڑتا  
چلا گیا اس سے پہلے کہ ناگن اپنا چہن ماری کسی نادیہ  
ہاتھ نے جیسے اس کی گردن دبوچ لی۔ اور پھر اس ناگن  
کو اتنے زور سے کھینچا کہ چاندنی اس کی گرفت سے  
آزاد ہو گئی پھر وہ ناگن جیسے اس نادیہ ہاتھ کے گلے  
میں جیسے کس گئی تھی اور وہ کھینچنے اور دھکے دینے اس قدر سخت  
اور آہنی تھا کہ ناگن تڑپنے اور اچھلنے لگی جیسے اس کی جان  
نکلنے والی ہو وہ اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے اپنا پورا  
زور لگانے لگی اس کی کوشش اور جدوجہد بے سود ہو رہی

تڑپ نہ رہا ہوتا۔ اس ناگن نے اسے دبوچ کر جو گرفت  
میں لیا تھا اس کے کارن سارا جسم تکلیف محسوس کر رہا تھا  
اسے سوچا کہ آخر یہ گڑیا ایسی کیا چیز ہے جو اسے لے  
جانے کے لئے ایک حسین اور خطرناک ناگن اس کے  
گھر میں کھس آئی تھی اس نے کل جو خواب دیکھا اس  
میں بھی ایک ناگن آئی تھی لیکن وہ اس کی کیلی شیلہ کے  
بہروپ میں تھی لیکن وہ خواب تھا لیکن آج اب اس  
وقت جو کچھ سامنے آیا تھا یہ ایک حقیقت تھی کل اس نے  
جو کچھ دیکھا شاید وہ بھی ایک حقیقت ہو..... اس گڑیا میں  
لعل وہیرے جواہرات جڑے نہیں ہیں؟ پھر ناگن  
تو اسے لعل وہیرے جواہرات کا لالچ دے رہی تھی تھوڑی  
دیر کے لئے اسے خواب مان لیا اور مجھ لیا جائے تو لیکن  
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کون اٹھا کر بستر پر لے آیا؟  
اس نادیہ ہستی نے تو نہیں جس نے اس کی جان بچائی  
ایک ذہریلی ناگن سے..... اگر یہی ہستی اس کی مدد نہ کرتی  
تو وہ ذہریلی ناگن شکتی اس کا خون پی جاتی۔ لیکن یہ  
نادیدہ ہستی کون تھی جس نے اس کی جان بچائی تھی۔  
اسے گود میں اٹھا کر بستر پر لاکر لٹا دیا اگر یہ نادیہ ہستی  
اس کی مدد نہ کرتی تو وہ ذہریلی ناگن اس کا خون پی  
جاتی؟ اس ناگن شکتی سے کتنی طاقت ور..... یہ ناگن  
اس نادیہ ہستی اس کے آگے کسی مجبور اور کم زور ہو گئی  
تھی اور اس ناگن کا کوئی جادو منتر نہ تھا اور نہ ہی اس  
کی شکتی بھی کام آسکتی اس نادیہ ہستی نے اس ناگن  
کو کس آسانی سے پرندہ بنا کے کھڑکی سے باہر پھینک  
دیا تھا۔ وہ گندھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گئی  
تھی۔

”اب تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے؟“ ایک  
لخت اس نادیہ ہستی کی آواز فضا میں کسی سر کی طرح  
لہرائی جس میں سارے جہان کی مٹھاس بھری ہوئی تھی  
جو اس کے کانوں سے ہوتی اس کے من کی گہرائیوں میں  
گوںجے لگی اس تم اپنے دل سے ہر قسم کا زور اور خوف نکال  
دوا ب کوئی ناگن نہیں آئے گی اور نہ ہی تمہارا مال بیکا  
کر سکے گی اگر اس نے یا کسی نے بھی اسے کی حماقت کی

تو وہ ہم ہوجائے گی پھر اسے جہنم نزل سکے گا۔“  
”آ..... آپ..... ہیں کون؟“ چاندنی نے ایک  
دم سے چونک کر پوچھا۔  
”آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں کبھی بھی  
اسے بھول نہیں سکتی؟“  
”یہ تم جان کر کیا کرو گی؟“ اس نے جواب دیا۔  
”میں نے جو کچھ بھی کیا اپنا فرض ادا کیا ہے وقت  
آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ لیکن تم اس  
گڑیا رانی کا خیال رکھنا۔“  
”جو آپ کا حکم۔“ چاندنی منمنیت سے بولی۔  
”میں اسے اپنی جان سے سے زیادہ عزیز رکھوں  
گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“  
”اچھا..... اب ہم جا رہے ہیں۔“ اس نادیہ  
ہستی نے شیریں لہجے میں کہا۔  
”اب تم جاؤ..... سکون و اطمینان سے سو جاؤ۔“  
چاندنی اس نادیہ ہستی سے یہ کہنا چاہتی تھی کہ  
آپ اپنی ایک جھلک دکھا دیں لیکن وہ غائب ہو چکی تھی  
تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا لباس اور اس کی ہتھکین  
درست کیا اس ناگن نے جو اسے اپنی گرفت میں  
لیا تو اسے سے نکلنے کی کوشش اور جدوجہد میں کسمپاسی  
تو بال اور لباس بے ترتیب ہو گیا تھا۔ اس نے ہال بھی  
درست کئے اس نے آگے بڑھ کر کانس سے گڑیا کو اٹھایا  
اور اس کا منہ چومتی ہوئی بولی۔  
”کاش! تم مجھے بتا سکتیں کہ وہ ناگن تمہیں کس  
لئے لے جانا چاہتی تھی..... کیا تم سچ سچ پریوں کی رانی  
ہو جو گڑیا بنی ہوئی ہو یا بنادی گئی ہو؟“

چاندنی اس سے بہت بہ دیر تک نہ جانے کیا کیا  
باتیں کرتی رہی تھی اس دہن گڑیا رانی نے اس کی کسی بات  
کا جواب نہیں دیا بس وہ ایک گڑیا ہی تھی کیا بولتی  
اور جواب دیتی۔ اس کی چپکی محبت بھری آنکھیں اس  
طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ سب کچھ نہ سمجھ رہی ہو۔  
چاندنی کو یہ سب کچھ بہت ہی پر اسرار، عجیب  
و غریب اور تحیر انگیز محسوس ہوا تھا۔ وہ کیسے کیسے خوف



ناک واقعات کی زد میں رہی تھی حالات نے اسے یہاں پہنچایا تھا لیکن یہ سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آیا تھا اور آئی نے اس گڑیا کے بارے میں جو کہانی سنا تھی وہ سن کر خاموش رہی تھی اتنا اثر نہیں لیا اور نہ ہی سنجیدہ ہوئی تھی آئی نے بتایا تھا کہ اس گڑیا کی اور سنی نے اسے تحفظ دیا تھا لیکن وہ اور سنی نہیں رہی تھی کہاں چلی گئی؟ کیسے چلی گئی؟ کون لے گیا؟ وہ کچھ نہیں جانتی تھی اس لئے کہ بے ہوش ہوئی تھی شاید اور سنی ہی تھی جس نے آئی کو حفاظت سے اس کے گھر پہنچایا تھا..... سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات یہ تھی کہ اتنی خوب صورت اور پیاری گڑیا جو عروسی لباس میں تھی کسی نے بھی کوڑیوں کے دام میں بھی نہیں خریدتا تھا کیوں کہ جو بھی اس گڑیا کو خریدنے کا ارادہ کرتا تو گڑیا بھیا تک اور انتہائی بد صورت دکھائی دیتے لگتی تھی..... یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ گہری نیند سو گئی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن جب وہ دفتر سے گھر آ کر نہانے کے بعد چائے بنائی اور کمرے میں بیٹھ کر چائے پی رہی تھی کہ اطلاق گھنٹی بجی اس وقت دن ڈوب چکا تھا اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا شیلا مونا اور سارہ کھڑی ہوئی تھیں اس نے نیچے جا کر زینے کا دروازہ کھولا وہ تینوں اوپر آ کر اس کے بیڈ روم میں گھس گئیں چاندنی نے دانستہ اپنا خواب شیلا کو نہیں سنا تھا جس میں اس نے شیلا کو ناگن کے بہروپ میں دیکھا تھا۔ اگر وہ بتاتی تو اس کی بات کا یقین نہیں کیا جاتا جس طرح آئی کی کہانی کا یقین نہیں کیا تھا اور آئی کا خوب مذاق اڑایا تھا اس کی خیر نہ ہوتی وہ مذاق اور چھیڑ چھاڑ کر کے اس کا ناک میں دم کئے دیتیں۔

مونانے چائے کی پیالی دیکھ کر شرارت کے انداز میں اسے چھیڑا۔

”حیرت کی بات ہے.....؟ بد اخلاقی نہیں کہ تم اکیلی چائے پی رہی ہو اپنی پیاری لہن گڑیا رانی کو نہیں بلارہی ہو؟“

”یہ آسمان کی پری ہے..... پرپاں دودھ نہیں پیتی میں اس لئے کہ وہاں نہ تو بکریاں ہوتی ہوں گی اور نہ ہی ڈبے کا دودھ ملتا ہوگا؟ اس لئے میں اکیلی چائے پی رہی ہوں۔“

”بھری پوچھ تو لیا ہوتا؟“ شیلا بولی۔

”ہم سے کسی جھوٹے منہ چائے کے لئے نہیں پوچھا؟“

”اچھا ان فضول باتوں کو چھوڑو..... یہ بتاؤ کہ تم تینوں چڑیلیں ایک ساتھ کیوں اور کس لئے میرے ہاں نازل ہوئی ہو۔ چائے پینے یا خون پینے؟“ چاندنی نے شوخی سے کہا۔

”آج تم تینوں سے میری ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی آج شام کا کوئی پروگرام بنانا اور تم تینوں نے میرے ہاں آنے کی بات کی تھی؟“

”شام پانچ بجے میرے دفتر میں کام کرتے ایک ساتھی عورت نے اخبار کا ایک تراش دکھایا۔“ شیلا کہنے لگی۔

”اس میں ایک اشتہار چھاپا ہوا تھا شہر کے سب سے بڑے فائبرسٹار ہوٹل میں آج ایک بین الاقوامی گڑیاؤں کی نمائش ہو رہی ہے ایک طرح سے مقابلہ ہو رہا ہے سب سے اچھی تین گڑیاؤں پر انعامات ہیں پہلا انعام پانچ لاکھ، دوسرا دو لاکھ، تیسرا ایک لاکھ، میں نے یہ اشتہار بڑھ کر مونا اور سارہ کو فون کیا ہمارا یہ خیال ہے کہ تمہاری چھ گڑیا پہلا انعام حاصل کر لے گی ہم اس لئے آئی ہیں کہ تمہیں اور تمہاری گڑیا کو اس نمائش میں لے جائیں تمہارا کیا خیال ہے؟ چلو گی؟“

”خیال تو بہت اچھا ہے۔“ چاندنی نے کچھ سوچ کر پس و پیش سے کہا۔

”نہ جانے کیوں میرا دل نہیں چاہ رہا ہے کہ میں اس نمائش میں گڑیا کو لے جاؤں؟“

”عجب احمق قسم کی ہو۔“ شیلا نے کہا۔

”ہم تمہارے بھلے کی بات کر رہی ہیں پانچ لاکھ کا پہلا انعام ملے گا..... آج ہی..... آٹھ بجے ایک جیوری

فیصلہ دے گی اور نقد رقم بھی دے گی تم ہو کہ اس مقابلے میں حصہ لینے سے کتر رہی ہو؟ پانچ لاکھ کی رقم کم نہیں ہوتی ہے تمہارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

”میری جان! ایسا سہرا موقع پھر بھی نہیں ملے گا! زندگی میں صرف ایک بار ہی ملتا ہے جو اس سے فائدہ نہیں اٹھاتا وہ سب سے بڑا احمق ہوتا ہے۔“

”اسے کسی قیمت پر ہاتھ سے نہ جانے دے۔“ سارہ نے اسے مشورہ دیا۔

”اتنی رقم تیرے پاس آتے ہی تیرے لئے رشتوں کی بھرمار ہو جائے گی تم اپنی پسند سے شادی کر کے گھر سالیہ۔“

”سارہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔“ شیلا نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”تم اپنی گڑیا اس نمائش میں رکھنے کے لئے کیوں ہتھیار رہی ہو؟ صرف تین گھنٹے کے لئے رکھنا ہوگا تین دن کے لئے نہیں۔ یہ نمائش صرف آج ایک دن کے لئے ہے۔“

”اگر ایسی بات ہے تو میں چلتی ہوں۔“ چاندنی بادل خواستہ بولی۔

”اگر میری گڑیا کو انعام مل گیا تو پھر ہم تینوں کسی برفضا مقام پر سیر و سیاحت اور تفریح کے لئے چلیں گی۔ مجھے امید ہے کہ میری گڑیا رانی پہلا انعام حاصل کر لے گی۔“

”تم جلدی سے اس گڑیا کو پیک کر دو۔“ شیلا بولی۔

”جلدی سے تیار ہو کر چلو تاکہ نمائش شروع ہونے سے قبل منتظرین سے بات کریں کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جانے سے مقابلہ میں شریک ہونے سے رہ جائیں۔“ چاندنی نے الماری پر رکھا ہوا ڈبا اتارا جس میں آئی نے پیک کر کے دیا ہوا تھا اس نے دودھ ڈبا بھی تک کسی وجہ سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا چاندنی نے خالی ڈبا شیلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”تم گڑیا کو اس ڈبے میں پیک کر دو میں اتنی

دیر میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔“

چاندنی نے الماری سے ایک جوڑا نکالا اور لمبی غسل خانے میں کپڑے بدلنے لگی پھر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

”مجھے تو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ بات مان جائے گی؟“ شیلا نے بڑی حیرت سے کہا۔

”مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”دراصل وہ پانچ لاکھ کی رقم کے قریب میں آ گئی ہے۔“ مونانے کہا۔

”پانچ لاکھ کی رقم کا سنتے ہی اس کے منہ میں پانی آ گیا..... وہ شادی کا پسند دیکھنے لگی۔“

”تم نے اس کی کم زوری سے خوب فائدہ اٹھایا۔“ سارہ ہنس پڑی۔

”چونکہ میں نے کہا تھا کہ اس رقم سے تمہاری شادی من پسند جگہ ہو جائے گی.....“

”اس سے پہلے کہ یہ کمپنی کپڑے بدل کر باہر آئے ہمیں یہ گڑیا لے کر نکل جانا چاہئے اسے جلدی سے پیک کر دو۔“ شیلا نے کہا۔

مونانے تیزی سے لپک کر غسل خانے کی کنڈی باہر سے لگادی۔ سارہ تیزی سے کالرس کی طرف بڑھی جس پر گڑیا رکھی ہوئی تھی اس نے فاتحانہ نظروں سے گڑیا کو دیکھا اور اسے اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اس کے ہونٹوں پر زہر خند سکرہٹ پھیل گئی اس نے گڑیا کو اٹھانے کی کوشش کی اسے اٹھانا تو درکنار وہ جنبش تک نہ دے سکی۔ وہ بہت بھاری اور کسی چٹان کی طرح منوں وزی گئی۔

شیلا اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی اور بولی۔

”تم گڑیا کو اٹھا کیوں نہیں رہی ہو؟ دیر مت کرو۔“

”یہ گڑیا اس قدر بھاری ہو رہی ہے کہ اسے اٹھانا تو دور وہ بل کر تک نہیں دے رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ جم گئی ہو۔“ سارہ نے جواب دیا۔



”میں نے اپنا پورا زور لگا دیا ہے اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اسے اٹھایا ہلا سکوں۔“

”چلو ہنو۔۔۔۔۔ ایک طرف ہو جاؤ، میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔“ شیلانے کہا۔

”دیکھتی ہوں کہ یہ گریا کیسے نہیں اٹھتی ہے؟ ایک فٹ اور اڑھائی کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر وہ پتھر کی ہوئی تو بھی اتنی بھاری نہ ہوتی۔“

”سارہ ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی تو شیلانے آگے بڑھی پھر اسے گڑیا کو اٹھانے کے لئے اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے پلاسٹک کا کوئی کھلونا ہو مگر گڑیا بلی تک نہیں اپنی جگہ سے۔۔۔۔۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی گڑیا پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا پھر اس نے اپنی ساری طاقت کو یکجا کیا اور سارا زور لگا دیا اس کی یہ کوشش بے سود رہی۔ گڑیا اپنی جگہ چٹان کی طرح جمی رہی۔

”ایسا لگتا ہے کہ چاندنی نے گڑیا کو کسی ایسی چیز سے چپکا دیا ہے کہ ہٹنے کے نام نہیں لے رہی ہے؟“ شیلانے بے بسی سے کہا۔

”ایسا تو نہیں لگ رہا ہے؟“ مونانے قریب ہو کر بغور گڑیا کو دیکھا۔

”یہ تو کائنات پر رکھی صاف نظر آرہی ہے۔ تم اور قریب ہو کر اسے غور سے دیکھو۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟“ سارہ نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ چٹان کی طرح کیوں ہو گئی؟“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اس گریا پر چاندنی نے کوئی ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے جس سے گڑیا چٹان بن گئی ہے۔“ شیلانے بولی۔

”ایسا کرو کہ چاندنی کو آنے دو۔“ مونانے کہا۔

”اسے پیک کرنے دو جب وہ گڑیا لے کر مکان سے باہر آئے گی تو ہم اس سے گڑیا کو چھین لیں گی اس کے علاوہ کوئی اور صورت مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ تم جلدی سے جا کر کنڈی کھول دو۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ سارہ نے کہا۔

پھر وہ تیزی سے آگے بڑھی اس نے غسل خانہ کے باہر کی کنڈی کھول دی چند لمحوں کے بعد چاندنی غسل خانے سے باہر آت ہوئی شیلانے اس سے کہا۔

”تم جلدی سے گڑیا کو پیک کر دو۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔“

”تم لوگوں نے ابھی تک گڑیا کو پیک نہیں کیا۔۔۔۔۔ اتنی دیر تک کیا کرتی رہیں؟“ چاندنی نے تنک کر کہا۔

”اصل بات یہ ہے کہ یہ گڑیا تمہاری دل کی رانی ہے اور تم اس کی دیوانی۔۔۔۔۔ اس لئے اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ شیلانے بولی تو چاندنی جس پڑی اس نے فراموش کر دیا گڑیا کو اٹھایا ان تینوں نے حیرت سے چاندنی کو دیکھا وہ اسے حیرت سے گڑیا کو پیک کرتی ہوئی دیکھنے لگیں چاندنی نے گڑیا کو ڈبے میں پیک کرنے کے بعد کہا۔

”تم تینوں نیچے چلو۔۔۔۔۔ میں اتنی بجھا اور کمرہ بند کر کے آتی ہوں۔“

وہ تینوں تیزی سے نیچے آ گئیں تاکہ بھٹنا جلد ہو سکے رفو چکر ہو جائیں۔

”دیکھا تم لوگوں نے۔“ شیلانے بولی۔

”چاندنی نے اس گڑیا کو اس طرح اٹھالیا جیسے وہ کوئی پھول ہو۔“

”میں نے نہیں کہا تھا کہ اس نے گڑیا پر ایسا کوئی منتر پڑھ کر پھونکا ہے کہ کوئی دوسرا اسے اٹھا نہیں سکتا۔“

”لیکن اس کے منتر جتنے ہمارے کسی منتر کو چلنے نہیں دیا جبکہ ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا ہے؟“ سارہ نے کہا۔

”اب ہمارا منتر چلے گا۔ اس گھر سے باہر آتے ہی اس کا منتر ناکارہ ہو جائے گا۔“ شیلانے نفرت سے بولی۔

”ہم نے آج تک کسی سے شکست نہیں مانی۔“ مونانے بھی بڑے غرور سے کہا۔

”میرا دل تو چاہ رہا تھا اس کہنی کو بھسم کر دوں۔“

”ہم سے یہ کہا گیا تھا کہ اس گڑیا کو کیلئے آؤ۔۔۔۔۔ حکم نہیں دیا کہ چاندنی کو موت کی نیند دلا دیا جائے۔“ سارہ بولی۔

”وہ شاید ذرا رہی ہے۔“ شیلانے بولی۔

”وہ جیسے ہی قریب آئے گی میں اس سے ڈبا ہین لوں گی مونانے ایسا کرنا کہ تم اس کی آنکھوں پر ایسا کوئی منتر پڑھ کر پھونک دینا کہ وہ کچھ دیر تک دیکھنے اور سوچنے بجھنے کے قابل نہ رہے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو جائے۔ پھر وہ غش کھا کر گرے اور بے ہوش ہو جائے

”ہم یہ گڑیا پہنچائیں گی تو منہ مانگا انعام ملے گا۔“ مونانے خوشی سے بولی۔

مونانے مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ چاندنی مکان سے باہر آئی اس نے ڈبا شیلانے کی طرف بڑھایا۔ شیلانے فوراً ہی ایک منتر پڑھا اور غیر محسوس انداز سے چاندنی پر پھونکا اس وقت چاندنی کا سر پھلکیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے دھندلی چھائی۔ اس کے ہاتھ سے پرس اور چابیاں چھوٹ کر فرش پر گر پڑیں اگر وہ دروازے کا ہمارا نہ لیتی تو گر پڑتی اس نے کچھ کہنا چاہا تو اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی اس نے اپنا سر دروازے پر ٹک دیا پھر اس نے تھوڑی دیر بعد محسوس کیا کہ اس کی حالت قدرے سنبھل گئی ہے۔

اس نے مڑ کے دیکھا اس کی تینوں سہیلیوں میں سے کوئی تھا اور نہ ہی وہ ڈبا تھا جس میں اس نے گڑیا کو پیک کا تھا اس کی تینوں سہیلیاں گڑیا سمیت گدھے کے سمر کے جنگ کی طرح غائب تھیں۔

چاندنی کو اپنی سہیلیوں کی خود غرضی اور اس حرکت پر نفرت غصہ آیا اس نے دل میں نفرت کی شدید لہر اٹھی۔

اس نے سوچا کہ وہ پانچ لاکھ کے انعام کے لالچ میں اس سے گڑیا کو لے لیں قریب دبا کتنی گھٹیا اور بچ کرمت کی۔۔۔۔۔ اب وہ کیا کرے؟ کہا اسے بھی اسی دل پر پہنچ جانا چاہئے؟ جہاں گڑیاؤں کی نمائش ہو رہی

ہے لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ ان میں سے کسی نے اسے نام سے مقابلے میں شرکت کا اندراج کر لیا ہوگا؟ نمائش کے منتظمین اس کی کوئی بات اور غور نہیں سنیں گے اس گڑیا پر کوئی انعام ملا تو وہ آپس میں بانٹ لیں گی اور اس کا انتظار نہیں کریں گی انعام ملنے کے بعد وہ اس کی گڑیا لاکر واپس کر دیں گی اس لئے اس کا اس نمائش میں اور ہوش میں جانا فضول ہوگا وہ ان کی واپسی کا انتظار کرے اس کے لئے سب سے بڑا انعام اس کی گڑیا کا دوبارہ مل جانا ہوگا۔

پھر وہ سب کچھ سوچ کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے سارے جسم میں فضا ہٹ سی آ گئی۔ وہ چند قدم چل کر آئی تھی تو اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ ایک ایک قدم اس کے لئے منوں بھاری ہو گئے تھے۔ وہ حیران کی حالت میں اس قدر کم زوری اور فضا ہٹ کیسے پیدا ہو گئی۔ وہ بستر پر کئی پتنگ کی طرح گر گئی۔ اس نے سوچا کہ چند لمحوں کے بعد وہ سوچے آن کر دے گی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور وہ جتنا مناسب اور بے حجاب کی حالت میں پڑی تھی اس میں اتنی ہمت اور سکت نہیں تھی کہ اپنا لباس درست کرے وہ سوچتی ہی رہ گئی اور نیند نے اسے دبوچ لیا۔

☆.....☆.....☆

سون لال جوہلی کے سب سے بڑے خوب صورت اور کشادہ، روشن اور ہوادار کمرے میں موجود تھی جس کی آرائش وزینائش کسی شاہی محل کے کمرے سے کم نہ تھی۔ ایک کونے میں بہت بڑی مسہری تھی اور اس پر نہایت آرام دہ اور گداز بستر بچھا ہوا تھا اس کی تختیلیں چادر پران کت تختیں تھیں جو گزرے رنگین لمحات کا فسانہ بنا رہی تھی۔

ایک طرف شاہی تخت تھا جو وہ مصر کے ایک قدیم شاہی محل سے چرا کر اور غائب کر کے ایک موہل کی مدد سے لائی تھی۔ اس وقت وہ بڑے کرفور اور شاہانہ انداز سے اس شاہی تخت پر ممکن تھی۔ قلو پتھر جیسا نامناسب



اور مختصر سا لباس اس کے حسین بدن پر تھا اور اس کے ایک انگ سے مستی ابل پڑتی تھی جو بلی کے اندر جوش تھا وہ اس میں نہا کر آتی تھی نہانے کے بعد پانی نے اس کا سر میں بدن آتشیں بنا دیا تھا جس سے بے پناہ حسن اور دل کشی پیدا ہو گئی تھی چہرے پر کھار آگیا اور ایسی جاذبیت اور کشش بول رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو قلو پلٹہ سمجھ رہی تھی۔

اس ہال جیسے کمرے کے وسط میں پانچ نوجوان اور حسین رقعاتیں ناچ رہی تھیں ان کے بدن لباس سے بے نیاز تھے وہ تھری، پگتی اور بل کھائی تو فضا اور نگین اور خواب ناک ہو جاتی تھی سورن کے ہتھ میں جام تھا جس میں انسانی خون جیسی شراب تھی وہ اس جام کو اس طرح پی رہی تھی جیسے وہ کوئی شرین شربت پی رہی ہو۔

اسے بڑی بے تابی، بے چینی اور شدت سے اپنی تین سہیلیوں کا انتظار تھا جنہیں اس نے گڑیا لانے کے لئے چاندنی کی سہیلیوں کے روپ میں بھیجا تھا اس نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ چاندنی کو کسی طرح فریب دے کر بے وقوف بنانا ہے اس نے اپنی سہیلیوں سے وعدہ کیا تھا کہ گڑیا مل جانے کے بعد اس خوشی میں تینوں کو انعام سے نوازے گی، یہ ایسا انعام اور لالچ تھا کہ وہ ہر کسی لڑکی کو نہیں دیتی تھی اس دہن گڑیا کا حصول اسکے لئے بہت بڑی فتح تھی جو اس گریا کی تلاش میں نہ جانے کتنے برسوں سے خوار ہو رہی تھی اس نے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا تھا وہ ہندوستان، آسام، بنگال اور افریقہ کا چہرہ چہرہ مارا اور کسی بدروح کی طرح بھٹکتی رہی تھی لیکن وہ اس گڑیا کی گردنک نہ پاسکی اتفاق سے اسے ایک بدروح نے بتایا تو تپا چل گیا تو وہ اسے لانے لگی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ بڑی آسانی سے اسے لے آئے گی لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی وہ خالی ہاتھ اور نامراد لوٹ آئی تھی۔

اسے اپنی اس ناکامی اور نامرادی پر جس قدر غصہ آیا تھا وہ خود ہی جانتی تھی پھر اس نے سوچا تھا کہ اسے

کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے اب وہ اسے نہیں سکتی تھی اس کے ذہن میں ایک تدبیر اس نے اپنی تین ناگن سہیلیوں کو آمادہ کیا جو ہر جان دار کا بہروپ بھر سکتی تھیں انہیں تھوڑا بہت جادو منتر آتا تھا وہ بہت ذہین، چالاک اور عیار داری تھیں ایک صحرائی لومڑی سے کہیں زیادہ انہوں نے کبھی بھی کسی مہم میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

جب وہ تینوں سہیلیاں گڑیا لانے کے لئے روانہ ہوئیں تو وہ آئینہ لے کر بیٹھ گئی تھی پھر اس نے ایک منتر پڑھ کر اس آئینے پر پھونکا تھا اسے سب کچھ نظر آنے لگا وہ شروع سے آخر تک ڈراما دیکھتی رہی تھی جب اس کی سہیلیاں وہ ڈبا لے کر چاندنی کے یہاں سے گئیں تو اس نے آئینہ ایک طرف رکھ دیا پھر وہ ان کا بے آب مائی کی طرح انتظار کرنے لگی اس نے ان رقعاتوں کو رخصت بند کرنے کا حکم دیا پھر اس نے ایک باندی کو آواز دے کر بلایا جو دوسرے کمرے میں تھی ان سے کہا کہ وہ ان رقعاتوں کو تہہ خانے میں لے کر جا کر بند کر دے اور وہ سناؤں کو پھر سے پر مامور کر دے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کے چہرے خوشی سے دھک رہے تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں جس ناگن نے شیلا کا بہروپ بھر ہوا تھا اس نے آگے بڑھ کر وہ ڈبا جس میں گڑیا تھی سورن کے ہاتھ تھما دیا۔

”شاباش“ سورن نے اس کے ہاتھ سے ڈبا لیا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر آغوش میں لیا اور اسے بے تحاشہ چومنے لگی جذبات کا طوفان گزر گیا تو وہ بولی۔

”تم تینوں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے آج کی رات ہم جشن منائیں گے تم تینوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔“

”آپ کی بتائی ہوئی تدبیر نے جو کام کیا وہ کسی بھی جادو سے برہ کر تھا۔“ مونا بولی۔

”وہ کمینہ ایک دم سے ہمارے دام میں آگئی۔“

”وہاں کوئی جادو نہیں تدبیر ہی چل سکتی تھی۔“ سورن کے لہجے میں سرشاری تھی۔

”اس کے سوا کوئی اور صورت بھی نہ تھی۔“

”اچھا..... اب آپ یہ بتائیں کہ ایسی کیا بات ہے جس کے حصول کے لئے آپ بہت بے چین، پریشان اور دیوانی تھیں۔“ سارہ نے کہا۔

”اس میں شک نہیں کہ یہ گڑیا جتنی پیاری، حسین ہے اتنی ہی دل کش اور موٹی تھی۔ اس پر کچھ بچے پریوں کی رائی کا لگانا ہوتا ہے۔“

”میں ابھی کچھ بتا نہیں سکتی اور نہ ہی کسی وجہ سے بتانا چاہتی ہوں۔“ سورن نے جواب دیا۔

”اس کے لئے کچھ عرصہ صبر اور انتظار کرنا ہوگا۔ پھر میں سب کچھ بتا دوں گی۔“

”اچھا بتائیں کہ یہ کیا پیر ہے کہ ہم تینوں نے باری باری اس گڑیا کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح جمی رہی مضبوط اور اٹل..... ہم نے اسے بہت ہلایا، زور لگایا، منتر جنت بھی پڑھے کالا جادو بھی کیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا؟“ شیلا بولا۔

”یہ ایک زبردست جادو کے زیر اثر تھی..... اس جادو کے آگے تم تینوں کا جادو بے اثر ہو گیا اور تمہاری فطرت بھی کام نہ آ سکی۔“

”لیکن..... چاندنی نے تو اسے اس طرح اٹھا کر ڈبے میں پیک کر دیا جیسے وہ کوئی پھول ہو؟“ سارہ نے کہا۔

”دراصل چاندنی کو اس جادو کے اثر سے دور رکھا گیا ہے اس لئے وہ جانتی نہیں ہے کہ یہ گڑیا ہے کیا؟“ سورن نے بتایا۔

”ہم نے آپ کا کام بری کام یابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔“ شیلا نے کہا۔

”اب ہمیں ہمارا انعام ملنا چاہئے جس کا آپ نے ہم سے وعدہ کیا۔“

”تم تینوں کو انعام ضرور ملے گا.....“ سورن کے گداز ہونٹوں پر مغرورانہ ہنس ابھری۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اس گڑیا کا ایک بارو بیدار کر دیں۔“ شیلا بولی۔

”اسے ایک بار کیا دیکھا دل بے قابو ہو رہا ہے، ہم تینوں کا دل کر رہا ہے کہ اسے جی بھر کے چومیں اور ہم مائی بے آب کی طرح ترپ رہی ہیں۔“

”میں نے اپنی زندگی میں بھی ایسی پیاری گڑیا نہیں دیکھی؟“ مونا بولی۔

”کاش ایہ سچ کج کی گڑیا ہوتی جو بولتی، ہنستی اور مسکراتی ہوئی۔“ سارہ نے کہا۔

”میں تم تینوں کی یہ آرزو تمنا اور خواہش پوری کئے دیتی ہوں کیوں تم نے اسے یہاں بہ حفاظت پہنچا دیا۔“ سورن کہنے لگی۔

”لیکن اس شرط پر کہ آئندہ اس کا خیال دل میں نہ لانا اور نہ ہی اسے دیکھنے کی خواہش کرنا اور نہ ہی کسی کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ گڑیا میرے پاس ہے۔“

”آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ شیلا بولی۔

”لیکن کیا میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ اسے دنیا والوں سے کیوں چھپا کر رکھنا چاہتی ہیں؟“

”میں اس کے متعلق ابھی کچھ بھی نہیں بتاؤں گی؟ یہ بات ابھی میں تم تینوں سے کہہ چکی ہوں لہذا لگا پھرا کے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔“ سورن کا لہجہ تنبیہ ہو گیا۔

سورن نے شیلا کی بات کا جواب دے کر ڈبا کھول دیا۔

”جیسے ہی اس کا ڈھکن کھلا اس میں سے سیاہ رنگ کا ایک خوف ناک قسم کا موٹا اور خون خوار بلانورائی اچھل کر باہر آ گیا اور رانے لگا۔ اور انگاروں جیسی آنکھوں سے کھورے لگا۔“

”وہاں چاروں بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگیں انہیں جیسے یقین نہیں آیا سورن نے بھی آئینے میں دیکھا تھا کہ چاندنی نے گڑیا کو پیک کیا تھا اس میں سے





یہ خوفناک واقعہ پندرہ اپریل کو اس وقت پیش آیا جب ہمارے دسویں جماعت کے امتحانات ہو چکے تھے اور ہم فارغ ہی تھے بذات خود میں اکٹھا ہٹ میں لہذا اس کے تین ایک پروگرام مرتب کر کے میں نے سب سے پہلے اپنی جگہ پہلی صدف سے رابطہ کیا۔ وہ میرا پروگرام سن کر فرط مسرت سے اچھل پڑی۔ اس کے بعد میں نے انشاء اور شافعیہ کو ہم خیال بنایا۔ ہم تینوں دوست اپنے اسکول پہنچیں اور اپنی طواہش کا اظہار کر دیا۔ میڈم اور دیگر اسٹنٹس تو گونگنیں اٹھا ہو گئیں مگر مس ریحانہ اور مسر کلثوم نے فی الفور میری خواہش کو تسلیم کر لیا۔ گھر پہنچتے ہی ہم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ فرزانہ، صائمہ اور نازیہ کو جب علم ہوا تو وہ بھی ہماری ہم خیال ہو گئیں۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن سمیرا اور چچا زاد بہن سبین اور سینی سندس کو بھی ہم خیال بنالیا تھا کہ عین وقت پر ہمیں الوداع کا رنہ کر دیں۔ پھر تیرہ اپریل کو میں نے ابو کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ سب عادت پند و بصحت کے بند باندھے رہے اس کے بعد انہوں نے اجازت دے دی۔ سواری کے لئے ہمیں کوئی پریشانی اس لیے نہ اٹھانی پڑی کہ ہمارے ہی پڑوس میں اس کا محل موجود تھا۔

گڑیا برا آمد ہونے کی بجائے سیاہ رنگ کا خوف ناک ملا باہر نکل آیا تھا۔ اس میں گڑیا نہیں تھی خالی ڈبہ منہ چڑا ہوا تھا۔

سورن نے انجان بن بگڑ کے برہی سے پوچھا۔  
”اے..... کیا..... اس میں بلا پیک کر کے لائی ہو؟ میں نے گڑیا لانے کے لئے کہا تھا۔“  
”نہیں۔“ شیلانے حیرت سے سر ہلایا۔

”ان دونوں سے بھی پوچھ لیں چاندنی نے ہم سب کے سامنے اس ڈبے میں گڑیا ہی کو پیک کیا تھا۔“  
”کیا یہ گڑیا ہے؟“ سورن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ راستے میں تم تینوں کی نیت میں فوراً آ گیا ہو کہ اس گڑیا کو جو ان لڑکی کے بہرہ وپ میں لا کر تم تینوں اس سے کھیلیں؟ دیکھو مجھے بے وقوف نہ بناؤ اور دھوکا نہ دو۔“

”ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ یہ گڑیا آخر ہے کیا؟ اس میں صرف ایک خوبی ہے کہ یہ بڑی سندرا اور موٹی ہے جان گڑیا ہے اس کے بارے میں ہم سے کوئی نہیں جانتا۔ صرف اتنا جانتی ہیں کہ اس میں ایسی کوئی انہونی بات ہے کہ اسے لانے کے لئے تم نے ہماری خدمات حاصل کیں اور انعام کا لالچ دیا ہم تینوں چاندنی کی سہیلیوں کا بہرہ وپ بھر کے لگیں اسے تمہاری تدبیر پر عمل کر کے اسے لائیں اس گڑیا کا اس ڈبے سے

پراسرار طور پر غائب ہو جانا ناقابل یقین اور حیرت کی بات ہے ہم پھر تم بلاوجہ شک و شبہ کر رہی ہو۔“ شیلانے کو بھی غصہ آ گیا اس لئے اس نے سورن کو آپ کی بجائے تم سے مخاطب کیا تھا وہ ایک ہی سانس میں بولی تو اس کا سینہ دھڑک اٹھا تھا اور سانسوں کا زریو بم بچھو لے کھانے لگا اور چہرہ سرخ ہوتا گیا۔

بلاوجہ ایک طرف کھڑا ہوا غرار ہوا دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جسامت ایک شیر کی مانند ہو گئی وہ تینوں سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں سورن فوراً ہی چاب کرنے لگی اس کا چاب جیسے مکمل ہوا اس نے اس بلے

”یہ میں نہیں جانتا کہ یہ کسی کی حرکت ہے؟ میں خود بھی حیران ہوں کہ میرے ساتھ یہ کیسا مذاق ہے! کس نے کیا؟ کیوں؟“

(جاری ہے)



## کم نیندر موٹاپے کا خطرہ

کنگز کالج لندن کی تحقیق کے مطابق جب انسان تھکاوٹ اور غموگی کا شکار ہوتا ہے تو غذا کے لیے اس کی اشتہا بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس سے قندِ شکر کی سطح میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ نیندر کی کمی موٹاپے اور ذیابیطس ٹائپ 2 کا خطرہ بڑھاتی ہے مگر یہ پہلی بار ہے کہ کم سونے اور زیادہ کھانے کے درمیان تعلق کو دریافت کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کے دوران 18 سے 50 سال کے 172 مرد و خواتین کا جائزہ لیا گیا۔

(حنا ناصر - چنیوٹ)

دیکھتے ہی ہم سب ہڈیاں انداز میں چیخ پڑیں۔

ہائے میری بچیاں..... مس کلثوم دونوں ہاتھ اپنے سینے پر مارتے ہوئے رو پڑیں۔

”ریحانہ..... اور..... سکندر، عظیم.....“ وہ بے تحاشہ چلانے لگیں جبکہ میں نے شدید خوف کے باوجود

صاف اور افشاں کو لپٹا لیا وہ یہ بھی کہ ان کے چہرے اور ہاتھ خون سے لٹ پٹ تھے ان پر ہڈیاں سا طاری تھا

میری بہن حیران صرف وہ واحد لڑکی تھی جو نہ تو خوفزدہ نظر آئی نہ ہی ہراساں تھی وہ یقیناً کچھ نہ کچھ پڑھنے میں

مصروف تھی جبکہ میری کزن بین اور بیٹی سندس سمیت شاف، فرزاد، صائمہ اور نازیہ بالکل سکتے میں مبتلا

تھیں۔

”کیا ہوا صدف، افشاں بتاؤ کیا ہوا۔ کہاں چوٹ لگی.....“ میں اپنے حوصلے پر قابو پاتے ہوئے

بولی۔

جواب میں دونوں ہی صرف گھٹکیاتی رہیں ان کے حلق سے صرف غوغا ہی نکلتی رہی۔

میں نے دونوں کو چھوڑ دیا اور شرر..... شرر پانی گرنے کی آواز پر ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

مس کلثوم بڑی تیزی سے اپنی حالت پر قابو

سکندر بھائی اور عظیم چونکہ بہت اچھے تیراک تھے اس لئے وہ پہاڑ جیسی بلند موجوں پر ابھرتے،

ڈوبتے بہت آگے تک جا چکے تھے۔

حالانکہ مس ریحانہ اور مس کلثوم چیخ کر انہیں واپس آنے کو کہہ رہی تھیں، شدید غصے کا اظہار بھی کر رہی

تھیں مگر مخالف سمت کی ہوا اور لہروں کا شور تیرنے والوں تک ہماری آواز پہنچنے نہیں دے رہی تھیں۔

جھلا کر مس ریحانہ نے ہمیں ہٹ میں چلنے کا حکم دیا ہم نہ چاہتے ہوئے بھی ہٹ میں چلے گئے۔ دستر

خوان بچایا، کھانا پناہ اور کھانے بیٹھے ہی تھے کہ سکندر اور عظیم بھی آگئی پھر توس ریحانہ اور مس کلثوم نے انہیں

وہ جھاڑ پانی کی ہم سب پر سنا سنا چھا گیا۔

تین بجے تک ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر دریاں پر لیٹ گئے اور لیٹے لیٹے ہماری آنکھ لگ گئی۔

سب سے پہلے میری ہی آنکھ کھلی اور بے پناہ اندیشہ اور کچھ میری ٹوٹی گم ہو گئی ہے تحاشہ چیختے لہجے

میں، میں نے صدف اور افشاں وغیرہ کو آوازیں دیں۔

ڈراما میں ہم سب بیدار ہو گئیں مس ریحانہ اندھیرے میں ٹٹوتے ہوئے سوچ بوری تک پہنچ گئیں۔

روشنی ہوتے ہی ہمارے جسم میں جان آئی۔

”اوہ لڑکیوں آٹھ بج رہے ہیں۔ چلو جلدی جلدی سامان سمیٹو۔ کم بخت ڈرائیور بھی شاید نہیں پہنچا

حالانکہ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ سات بجے تک یہاں سے چل دیں گے۔“ مس ریحانہ

پر ہنستے ہوئے باہر نکل گئیں۔ ہم تیزی سے سامان سمیٹنے لگیں جبکہ صدف اور افشاں ہاتھ منہ دھونے کے لئے

ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

ابھی ہم نے سامان سمیٹ کر ایک طرف رکھا ہی تھا کہ اچانک صدف اور افشاں کی چیخوں نے ہم سب

سمیت مس کلثوم کو بھی تھر تھرا کر رکھ دیا۔

پھر اس سے پہلے کہ مس کلثوم ہاتھ روم کی طرف

پھٹیں صدف اور افشاں ملیریا کے مریض کی طرح تھر تھر

کا پتی ہوئی ہاتھ روم سے برآمد ہوئیں۔ کہان کی ابتدا

حاصل کلام ہم چودہ اپریل کی صبح آٹھ بجے ٹیکہ منانے کے لئے سینس پت روانہ ہو گئے۔ ہماری تعداد نو

لڑکیوں پر مشتمل تھی۔ حالانکہ مس ریحانہ بھی لڑکی ہی ہیں لیکن چونکہ ان کا شارٹ نیچر زمیں ہوتا ہے اس لئے میں نے

انہیں ان کے ذاتی وقار کے عین مطابق مسز کلثوم کے زمرے میں شامل کر لیا تھا۔

سوزو کی کپشتی سیٹوں پر ہمارے ساتھ میرا ایک کزن ایس سکندر بیٹھا تھا اور اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے

ساتھ صدف کا بھائی عظیم بیٹھا تھا۔

یہ دونوں لڑکے سچے غیر مسلح ہماری مس ریحانہ بھی نہ تھیں لیکن اس وقت مجھ سمیت کسی لڑکی کو ان کے

مسلح ہونے کا علم نہ تھا ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سینس پت پہنچ گئے۔ سوزو کی ڈرائیور نے مزید دس منٹ

صرف کر کے سوزو کو دو دیوڑیوں کے درمیان پارک کیا اور ہٹ ہی کے مغربی سامان خانے تلے درجی بچھا کر بیٹھ گیا۔

دس بجنے والے تھے اور سینس پت کا پورا ریگستان دھوپ کی لپیٹ میں تھا۔ جیسا کہ سینس پت کا ریگستان

سرمنی تھا اس لئے تیز ہوا کے دباؤ سے سرمنی بالو ہمارے لیے تکلیف کا باعث بنی ہوئی تھی۔ ابھی تک ہم نے

سوزو کی سے کھانے پینے کا سامان نہیں اتارا تھا۔

مس ریحانہ کا خیال تھا کہ چند گھنٹوں کے لئے کوئی بھی ایسا ہٹ حاصل کر لیا جائے جہاں نہانے وغیرہ

کا پانی ہو ڈرائیور تک روم اور ٹوائلٹ بھی ہو۔ سب سے اہم یہ کہ ہمارے کھانے کی اشیاء سرمنی بالو سے محفوظ رہ سکیں۔

جیسا کہ مس ریحانہ اور مسز کلثوم دونوں ہی سائنس نیچر تھیں اس لیے بہت زیادہ احتیاط کی قائل تھیں۔

فی الوقت دونوں نیچرس اور ہم سب لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑے بڑے ہٹ کے برآمدے نما

سامان خانے تلے کھڑی ہو گئی تھیں۔ تاکہ دھوپ کی حدت سے محفوظ رہا جاسکے۔

میرا چچا زاد بھائی سکندر، صدف کے بھائی عظیم

تھے۔

ہماری نظروں کے سامنے چند گز کے فاصلے پر ٹھائیں مارنے سکندر کی دیو پیکر اور پھری ہوئی موجیں

ایک شور مچا رہی تھیں ساحل سے ٹکراتیں اور آڑھے کی مانند بہت اوپر تک ساحل کو نہلاتے ہوئے لوٹ

جاتیں۔ جس طرف ہم نظر اٹھتی سفید سفید جھاگ اڑاتی، ڈوٹی لہرائی لہروں سے ایک روح پرور سماں سا

بندھا ہوا تھا۔ بہت ہی لطف آ رہا تھا میں اپنی سیٹیوں کے ساتھ سکندر کی پھری ہوئی موجوں میں جانے کے

لئے بے چین تھی۔

اس وقت میری خواہش کی انتہا نہ رہی جب سکندر بھائی اور عظیم بھائی نے ہٹ ملنے کی اطلاع دی۔ ہٹ

کا چکیدار بھی ان کے ساتھ تھا لمبا ترنگ اور مضبوط تن و توش رکھنے والے چکیدار کا نام ہاشم جت تھا۔ وہ سینس

پت کی قریبی بستی جس میں کاربنے والا تھا۔ اردو زبان بالکل اہل زبان کی طرح بولتا تھا انتہائی مہذب اور

ساکھ لب و لہجہ کے باعث قابل احترام سمجھا گیا۔

ویسے بھی ہر لڑکی کو بیٹی بنی کہہ کر ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتا۔ عمر کے لحاظ سے وہ چالیس سے کچھ زیادہ

لگ رہا تھا۔

جو کچھ بھی تھا، ہم آدھے گھنٹے کے اندر ہٹ میں شفٹ ہو گئے ہاشم نے خود سکندر، عظیم اور سوزو کی

ڈرائیور کے ساتھ مل کر ہمارا تمام سامان اٹھوا کر ہٹ تک پہنچایا تھا۔

سوزو کی ڈرائیور تھوڑی ہی دیر بعد ماہی گیروں کی بستی جس میں اپنے چچا کے گھر چلا گیا تھا اور ہاشم بھی

کہیں نہ کہیں جا چکا تھا۔

دن کے دو بجے تک ہم نے آزادانہ ماحول میں خوب انجوائے کیا۔ آزادانہ اس لئے کہ چھٹی یا تہوار کا

دن تو نہیں تھا کہ ساحل تفرقہ پسندوں کی آماجگاہ بنا رہتا۔ کچھ لوگ دائیں بائیں کافی فاصلے پر نظر آ رہے

تھے۔



پانگیں اور صدف و افشاں کو اپنی پانہوں میں سمیٹ کر  
بقیہ لڑکیوں کے سامنے..... دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔  
قطع نظر ان کے میں روشن ہاتھ روم میں داخل  
ہو گئی۔ دونوں نکلے کھلے ہوئے تھے اور بے تحاشہ پانی  
بہہ رہا تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے دونوں نکلے بند کئے اور  
پورے ہاتھ روم پر گہری نظر ڈالی نہ تو کہیں خون کا ایک  
قطرہ دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی غیر معمولی بات محسوس  
ہوئی۔ میں مطمئن ہو کر جوہی مڑی، میری بہن حمیرہ  
میری پشت پر موجود تھی اس کے ہونٹ بدستور مل رہے  
تھے۔

”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے حمیرہ“ کہتے ہوئے  
میں ہاتھ روم سے نکلی اور یہ دیکھ کر قدرے پرسکون ہوئی  
کہ مس کلثوم اپنے دوپٹے سے صدف اور افشاں کے  
چہرے صاف کر چکی تھیں ان کے نہ تو چہروں پر کوئی زخم تھا  
اور نہ ہی ہاتھوں پر۔ وہ اب بھی صرف مبہوت سی بنی ہوئی  
مجھ ہی کو تک رہی تھیں۔

بدقت تمام صدف اور افشاں نے بتلایا کہ ہاتھ  
مندھو رہی تھیں کہ اچانک ہی واش ٹین پر لگے ہوئے  
آئینے میں کسی مرد کی مثبت ناک صورت نظر آئی۔  
اس کا چہرہ تو انسانی تھا، مگر نقوش کسی خونخوار  
درندے کی طرح بھیما تک تھے پھر وہ جو گھبراہٹ میں  
مڑیں تو پشت پر کوئی موجود نہ تھا اور دونوں منکوں سے  
پانی کی بجائے خون بہہ رہا تھا۔

میں صدف اور افشاں کی باتیں تو سن رہی تھی مگر  
میرا ذہن مس ریحانہ، سکندر اور اعظم میں الجھا ہوا تھا  
کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ تینوں کہاں چلے گئے، مس  
کلثوم نے اس قدر چیخ کر انہیں پکارا تھا اس کے  
باوجود نہ کوئی پہنچا اور نہ ہی جواب ملا۔

”مس.....“ میں نے مس کلثوم کو مخاطب کیا۔  
”کیوں ناں ہم ہٹ سے باہر نکل کر مس ریحانہ، سکندر  
اور اعظم کو آواز دیں.....“  
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ذکیہ..... ویسے ہمارے جسم

پیسے سے شرابور ہو چکے ہیں یہاں تو جیسے دم گھٹ رہا  
ہے.....“

”ہاں مس آپ صحیح کہہ رہی ہیں تو پھر چلیے.....“  
کہتے ہوئے میں دروازے کی طرف بڑھ گئی بقیہ لڑکیاں  
بھی حرکت ہو گئیں پھر میں جیسے ہی کھلے ہوئے  
دروازے سے قریب ہوئی اچانک ہی کٹناک کی سماعت  
شکن آواز سے دونوں کو از بند ہو گئے ایسے ہی بے ساختہ  
میرے لیوں سے ایک طویل چیخ نکل گئی۔ یکبارگی میرا  
دل اچھل کر میرے حلق میں آٹکا۔ یہی کچھ دیکر کے  
ساتھ بھی ہوا بلکہ چیخ و پکار کا نہ تھمتے والا طوفان سا کھڑا  
ہو گیا۔ ہمارے ذہن ڈوبنے لگے۔ دل اس شدت سے  
بھڑپڑانے لگا کہ کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

نہ پائے مانند نہ جانے رفتن۔ پانچ دس منٹ بعد  
مس کلثوم نے حوصلہ پکڑتے ہوئے ایک پر زور پکچر دیا  
انہوں نے تاریخ کی چند نامور خواتین کی بہادری کے  
چند واقعات اس موثر انداز میں ہمیں سنائے کہ ہمارے  
دل دماغ سے خوف کے سائے بڑی حد تک چھٹ  
گئے۔

ایسا ہونے کے بعد میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے  
ساتھ میری بہن حمیرہ اور صدف، افشاں و شافہ بھی اٹھ  
کھڑی ہوئیں۔ ”کیا ارادے ہیں بچیوں.....“  
”مس کلثوم مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔  
”کچھ نہیں مس، میں دروازہ کھولنے کی کوشش

کرتی ہوں، اور آپ لوگ دونوں کھڑکیوں سے مس  
ریحانہ، سکندر اور اعظم کو آواز دیں۔ چونکہ کیدار چاچا  
ہاشم کو بھی آواز دیں ساتھ ہی ڈرائیور کو.....“  
”جتنے  
کے آخری الفاظ میرے حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔  
صرف مجھ ہی پر کیا موقوف تھا، مس کلثوم سمیت  
ہر لڑکی بے جان مجھے کی طرح اپنی اپنی جگہ ساکت و جامہ  
ہو گئی۔

وجہ یہ تھی کہ بند دروازے اور کھلے پٹ سلاخوں  
دار دونوں کھڑکیوں سے بے جسم نقوش و نگار انسانی قد  
واعضاء سے مطابقت رکھتے ہوئے ہیوے نمودار ہونے

شروع ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر کی لہریں  
ایک کے بعد ایک ساحل کی ریت پر رینگ رہی ہوں۔  
ایک ہیولہ نمودار ہوتا تو ایسی دہشت ناک آواز  
ہوتی جیسے پتھر ہوا تیل بھنکارا ہو وہ ہاتھ روم میں داخل  
ہوتا اور پھر گیس بھرے غبارے کی طرح یا سینکڑوں فٹ  
کی بلندی سے پیرا شوٹ بنے جہاز سے زمین کی طرف  
چھلانگ لگائے والے فوجی کی طرح ڈولتا ہوا چھٹ سے  
چپک جاتا۔

ایک کے بعد ایک کر کے آٹھ انسانی ہیولے  
صحت سے چپک گئے یوں لگا جیسے کسی مصور نے سرخی  
رنگ سے انسانی جسامت کے ہیولے پرنٹ کر دیئے  
ہوں۔

اسی طرح ایک ایک کھڑکی سے چار چار ہیولے  
نمودار ہوئے اور دیواروں سے چپک گئے۔

اب وہ کوئی حرکت نہیں کر رہے تھے مگر سولہ کے  
سولہ ہیولوں کے غرض کی آواز بدستور رکوں میں خون  
منجمد کئے دیے رہی تھی یوں لگتا ہمیں سولہ خونخوار  
بھیڑیوں نے گھیر لیا ہوئی دم گزرتا ہے کہ وہ ہم پر ٹوٹ  
پڑیں گے اور ہماری تلہ بونی کر دیں گے۔

مجھ سمیت کوئی لڑکی کچھ سوچ رہی تھی۔ جیسے ہماری  
سوچ ہمارے ذہن عمل تنویم کے عامل نے اپنے قبضے  
میں لے لئے ہوں۔ ہم کوئی حرکت ہی نہیں کر پار ہے  
تھے ساکت و جامہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی تھیں۔

نہ جانے کتنی دیر گزرتی کہ اچانک ایک انسانی  
سایہ اپنی پائیں پھیلائے میری طرف بڑھا..... بڑھتا  
بڑھتا..... اور بڑھتا ہی رہا پھر جیسے ہی مجھے دیکھنا چاہا  
ایک اچانک ہی زمین و زمان کو لرزادینے والی ایک آواز  
آئی۔ یوں لگا جیسے ساروں کی گھنگھور گھٹائیں گرج پڑیں  
ہوں۔

چھپاک سے دروازہ کھل گیا اور مجھے دیکھنے والا  
سایہ حرف غلط کی طرح مٹ گیا۔  
صرف اسی ایک پر کیا شخصہ تھا سارے ہی سائے  
کڑا کے دار کانوں کے پردے چھڑ دیئے والی

آوازوں سے غائب ہوتے گئے۔  
چونکہ دروازے کے دونوں کواڑ کھل چکے تھے اور  
وسط دروازے میں ہٹ کا چونکدار ہاشم کھڑا ہوا تھا اس  
کے باوجود سمندری ہوائیں ہٹ میں دل داخل ہو کر  
میرے پیچھے ہوئے جسم کو گدگداتے ہوئے کمرے میں  
پکڑنے لگیں لہروں کے نغے سنائی دینے لگے مگر میں  
بلکہ مس کلثوم و ساری لڑکیاں محرومہ انداز میں چاچا ہاشم  
کو تک رہی تھیں۔

وہ ہاشم جو دن میں شفیق اور بے پناہ محبت کرنے  
والے باپ کی طرح ہمیں ملا تھا لیکن اس وقت وہ شعلہ  
جوالہ بنا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں سے  
چنگاریوں کی بجائے شعلے سے برس رہے تھے اس کے  
خند و خال اس قدر بھیما تک تھے کہ میں نے جھرجھری سی  
لے کر اپنی نظریں پھیر لیں۔

ممکن ہے یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم رہتی کہ  
اچانک ہوا کے دوش پر بہہ کر آنے والی زندگی بخشے والی  
آواز سن کر میرا انگ انگ جھوم اٹھا۔

”بابا.....“ میں شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا  
بے تحاشہ ہنسی میرے پیچھے حمیرہ بھی پاپا کر کے دوڑی،  
سین تانناؤ تانناؤ اور سندس دادا ابو کہہ کر نکلیں، صدف بھی بابا  
بابا کہتی ہوئی لپکی۔

غرض یہ کہ ذرا سی دیر میں ماحول اس قدر خوشگوار  
ہو گیا کہ گزشتہ واقعات محض ایک خواب کی طرح محسوس  
ہوئے۔ خواب تو پھر بھی ذہن پر اثرات چھوڑ جاتے ہیں  
مگر میرے ابو کے غیر متوقع طور پر پہنچ جانے سے خوف  
کے اثرات بھی باقی نہیں رہے تھے اب کی موجودگی کے  
باعث مس کلثوم بھی مس ریحانہ سے کچھ نہ کہہ سکیں صرف  
چیخ کر لڑکیوں سے دیکھتی رہیں۔

جی ہاں مس ریحانہ، سکندر اور اعظم بھی ابو کے  
ساتھ تھے جبکہ سوزی کا ڈرائیور ہٹ سے باہر ریجنرز  
کے چارخ اور شیردل جوانوں کے ساتھ موجود تھا۔  
نصف گھنٹے بعد ہم اپنے سامان سمیت ریجنرز کی  
گمرانی میں روانہ ہو گئے میرے پاپا اور سکندر ریجنرز کی



موبائل میں سوار تھے۔ آگے آگے ہماری سوزوکی تھی، پیچھے ریجنر ز کی موبائل تیرتی چلی آرہی تھی ریجنر ز موبائل کی ہیڈ لائٹس سے ہماری سوزوکی میں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے چہرے پر آسانی دیکھ سکتے تھے۔

”ہاں اب بتاؤ تم کہاں غائب ہوئی تھیں۔۔۔۔۔“ سکون پاتے ہی مس کلثوم نے مس ریحانہ سے پوچھا۔ ان کے لہجے میں ترشی اس لئے تھی کہ مس ریحانہ اور میری دوست صدف کی سنگی چھوٹی بہنیں تھیں۔ آپا، جب میں لڑکیوں کو سامان سمیٹنے کا کہتے ہوئے ہٹ سے نکلی تو ساحل پر بلکہ پورے ماحول پر اندھیرے کی چادری تنی ہوئی تھی۔ ماسوائے سفید جھاگ اڑتی لہروں اور ان کے شور کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں سکندر اور اعظم کو آوازیں دیتے دیتے تھک گئی میرے حلق میں خراشیں سی پڑ گئیں۔ میں اس قدر روہاکی ہوئی کہ دل چاہتا تھا ہی منہ بوجھ لوں۔ یقین چاہیے آپا سکندر اور اعظم مجھے اس وقت مل جاتے تو میں ان کی خوب پٹائی کرتی۔ اچانک میری نظریں ساحل کی طرف اٹھ گئیں کہ ہر سرت اندھیرے کی حکمرانی تھی مگر ستاروں کی روشنی یا سکندر کی دودھیا لہروں کے باعث یا پھر شاید اس لیے کہ مسلسل اندھیرے میں رہنے کے باعث میں کچھ کچھ فاصلے کی چیزیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے دو ہیولے سے گیلی ریت پر پڑے دیکھ لئے میرادل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ میرا دماغ گویا تاریک فضاؤں میں قلابازیاں سی لگا تارہ گیا۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔“ بے ساختہ میرے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی۔

”کہیں یہ۔۔۔۔۔ یہ ہیولے سکندر اور۔۔۔۔۔ اور اعظم۔۔۔۔۔“ اس سے آگے میں سوچ ہی نہ سکی۔ میرادل ڈوب سا میری آنکھیں پھر آنکھیں میں دیوانہ وار دوڑتی ہوئی ان ہیولوں کے قریب پہنچی اور یہ دیکھ کر میری آنکھوں کے گرد لاتعداد چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں

کہ پڑی۔۔۔۔۔ وہ سکندر اور اعظم ہی تھے مگر میں اس وقت قطعی بھول گئی کہ وہ صرف اندر اور باہر آستین یعنی سینڈو بنیان پہنے ہوئے تھے جس وقت کہ پڑے ہوئے تھے۔ میں بالکل بالکل کی طرح دائیں بائیں ہلنے لگی کہ شاید کوئی مددگار مل جائے۔ میں دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک ہی سکندر اور اعظم کمر بستہ ہوئے اٹھ بیٹھے۔ فرط سرت سے یکبارگی میرادل بیہوش اچھلنے لگا۔ یہ جان کر میں شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا ہوئی کہ وہ دونوں زندہ ہیں فرط جذبات سے بے خود ہو کر میں نے دونوں لڑکوں کو اپنی ہاتھوں میں سمیٹ لیا۔ کچھ دیر بعد، تینوں ساحل پر چڑھتے چلے گئے۔

”مس۔۔۔۔۔“ سکندر مجھ سے مخاطب ہوا۔ اگر آپ رحمت محسوس نہ کریں تو سامنے والے ہٹ تک چلیں، ہمارے لباس دہیں رکھے ہیں۔ ”ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن بھی ذرا جلدی کریں۔۔۔۔۔“ میں نے خندہ پیشانی سے کہا، ”یہ میں اپنے تئیں فیصلہ کر چکی تھی کہ اپنے ہٹ میں بیچ کر دونوں لڑکوں کو ان کی نافرمانی کی سزا ضرور دوں گی پھر اتفاقاً میری نظریں ان کے سروں اور جسم پر پڑیں ان کے سر سے مسلسل دھار والے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے ان کے جسم اس قدر گیلیے تھے جیسے ابھی ابھی سکندر میں غوطہ لگا کر نکلے ہوں۔

ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پائی تھی معا میری نظریں ہٹ کے دھبے کے قریب دوسرے دھبے پر پڑیں میں نے صاف محسوس کیا کہ دوسرا دھبہ سوزوکی جیسا ہے۔

آپا آپ تو جانتی ہیں کہ نہ میں بزدل ہوں اور نہ ہی میں جن بھوت سے ڈرنے والی ہوں۔ میرا تھا ٹھکانا، میری چٹھی جس نے خطرے کی گھنٹی بجائی۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اعظم اور سکندر کا لباس

تو ہمارے ہٹ میں پڑا ہے اور یہ کہ دونوں لڑکے سلیپنگ پانجامہ پہنے ہوئے تھے بنیان بالکل بھی نہیں پہنی تھی اور یہ کہ سکندر کے گلے میں تعویذ بھی تھا۔

”کون ہو تم۔۔۔۔۔“ میں ٹھٹھک کر ڈک گئی میرے لہجے میں ایک ٹھنڈاؤ تھا دونوں لڑکے جو مجھ سے دو تین قدم آگے تھے رک گئے۔

”بتاؤ۔۔۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔۔۔“ میں اپنے چہرے تلے جیسے ہوئے ٹی ٹی کو نکالتے ہوئے جنگلی گلی کی طرح غرائی۔

وہ دونوں ڈرامائی انداز میں مڑے۔ ان کے قد از خود بڑھ گئے اور رنگت بھی گولڈن ہو گئی۔

جیسے ہی ان کے چہرے پر میری نظر پڑی۔ میرا ٹی ٹی پتول والا ہاتھ شاخ برسط کی طرح کانپ اٹھا خوف کی ایک تیز لہری میرے وجود میں دوڑتی چلی گئی۔ دھبے بھی محسوس تھے ان کی آنکھیں گہری تھیں اور جلتے ہوئے کونکے کی طرح سنگ رہی تھیں ان کے چہرے بالکل مردے کی طرح تھے اور جگہ جگہ سے اوجڑے ہوئے تھے، نیچے پھیلویں نے انہیں کاٹ لیا ہو۔

ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور ہر ایک کے دو اوپری دانت کسی بھیڑیے کی طرح مڑے ہوئے تھے۔ بالکل غیر ارادی طور پر میری آنکھیں گارڈز مگر پر بڑھ گیا۔ پورا ویرانہ ساعت شکن دھماکوں سے گونجنے لگا۔ میں خوف سے کانپتے ہوئے پیچھے ہٹتی گئی اور وہ میری طرف بڑھتے رہے میری ٹی ٹی پتول کی گولیوں کا ان پر گولی اڑاؤں ہوا تھا۔

اچانک دونوں بھیا تک انسان رک گئے میں بھی رک گئی اور پھر جیسے ہی میری نظریں ریتی زین کی جانب جھکیں ایک عجیب سا منظر دیکھ کر میں انگشت بدندان رہ گئی۔

میں نے دیکھا ایک سچوے بہت ہی پھیلی ہوئی جسامت والا کچھو اس کی لمبی گردن آگئی ہوئی ہے اور دونوں بھیا تک انسانوں کو یا پھر شیطانوں کو بیروں کی جانب سے

اپنے غار جیسے بھیا تک منہ میں لئے نگل رہا ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں شیطانوں کو نگل گیا۔ ٹھٹھک اسی لمحے میں ہٹس کی جانب روشنی ہوتے دیکھی اور پھر پھر جونہی زمین کی طرف دیکھا کچھو غائب تھا اور اس کی جگہ چاچا ہاشم جو کیدار کھڑا ہوا سکرا رہا تھا۔

”ریحانہ بیٹا۔۔۔۔۔ میرے پاس وقت نہیں ہے میں تمہاری بہن اور لڑکیوں کی مدد کے لئے جا رہا ہوں۔ یہ روشنی گھنٹی ریجنر ز کی گاڑی کی ہے اور ہاں اس ہٹ سے سوزوکی ڈرائیور، سکندر اور اعظم کو رہا کروا دینا وہ چھت کے ساتھ لائے لٹکے ہوئے ہیں۔

آپا جی۔۔۔۔۔ اس طرح ہاشم چاچا نے میری مدد کی، ریجنر ز کے جی دار جوانوں نے ہٹ کا دروازہ توڑ کر تینوں لڑکوں کو آزاد کروا دیا۔ میں ڈیکہ کے ابا اور میرے منہ بولے بابا کو ریجنر ز کے ساتھ دیکھ کر جہاں حیران ہوئی وہیں بے انتہا سرور بھی ہوئی۔

اور جب ریجنر ز کے جوانوں کو میں نے اپنی پٹا سنائی تو فوراً ہی آپ لوگوں کی طرف مدد کے لئے لپکے تھے ریجنر ز ہی کے سپاہی بابا کو بتلا رہے تھے کہ جس ہٹ سے اعظم وغیرہ کو رہائی دلائی گئی تھی اس میں کچھ عرصہ قبلہ دو اگھر بڑ ٹھنڈے ہوئے تھے بہت اچھے تیراک ہونے کے باوجود ڈوب گئے تھے آج تک ان کی لاشیں بھی نہیں مل سکی تھیں اس لئے وہ ہٹ سہل کر دیا گیا تھا۔

اور جس ہٹ کو ہاشم چاچا نے ہمارے لئے منتخب کیا تھا وہ ہاشم چاچا کی ملکیت تھا اور یہ کہ ہاشم چاچا کو مرے ہوئے سات برس ہو چکے ہیں لیکن ریجنر ز کے جوانوں اور بہت سے سیر و تفریح کے لئے جانے والے انسانوں نے انہیں باقاعدہ گھومتے پھرتے اور ڈوبتے لوگوں کی مدد کرتے دیکھا ہے۔

البتہ یہ معذہ ہم جمل نہیں کر سکتے کہ ہاشم چاچا کے ہٹ میں ہمارے ساتھ پر اسرار واقعات کیوں پیش آئے اور لڑکیوں کی مدد کرنے کے بعد ہاشم چاچا اچانک غائب کیوں ہو گئے۔

☆



## اپر ادھی

سکندر حبیب گجر۔ گجرات

ملہوڑا کو ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ بیتے ماضی کی فلم اس کے سامنے چل چکی تھی اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا جس لڑکی کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مار کر پانی میں پھینک دیا تھا وہ زندہ کیسے ہو گئی۔

**ڈی** کے ملہوڑا کا نام شہر کے بڑے بزنس میٹوں میں شمار ہوتا تھا فاسٹ فوڈ کا وہ اندیش کے کوٹے کوٹے میں بکچی چکا تھا اس کی انتھک کوششوں اور اچھے روپے نے اس کا نام شہر کی بلند یوں تک پہنچا دیا یہی وجہ تھی کہ اسے آئے دن زیادہ سے زیادہ آرڈر موصول ہونے لگے۔

بزنس زیادہ بڑھ گیا تو مصروفیت مزید بڑھنے لگی دولت کی ریل چیل اور لکشی گھر کی چوکھٹ چومنے لگی۔ اتنے بڑے کاروبار کو اکیسے سنبالنا اس کے لئے کھن ہوا جارہا تھا کافی سے تک و چار کرنے کے بعد ایک دوست کے مشورے پر اس نے ایک پرسنل اسسٹنٹ ساتھ رکھنے کا فیصلہ لے لیا۔

اگلے ہی دن اس نے دلش کے چند نامور مشہور اخبارات میں پی اے (P.A) کا ایڈ وے دیا آنے والے ہفتے کو اس کے آفس میں بے شمار نو جوان لڑکوں اور لڑکیوں کی لائن لگ گئی اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے اس لڑکے کا انٹرویو لے کر جب اس نے اسے باہر جانے کو کہا تو لڑکا بولا۔

”آپ کی بڑی کرپا ہوگی اگر آپ یہ جاب مجھے دے دیں۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔“ اس لڑکے نے باقاعدہ ہاتھ باندھ دیئے۔ ملہوڑا نے پہلی بار نظر بھرا اس لڑکے کی طرف دیکھا پھر بڑے آرام سے بولا۔

”اس میں کرپا والی کوئی بات نہیں مہاشے اسی بہت سے لوگ پیچھے ویٹ کر رہے ہیں سب کا انٹرویو ہونے کے بعد ہی فیصلہ لیا جائے گا کہ کون پوری طرح اس جاب کا حق دار ہے آپ باہر جا کر بیٹھ جائیں۔“ لڑکا مایوسی کے انداز میں ہفٹکس بول کر باہر چلا گیا۔ ملہوڑا نے دروازے کے پاس کھڑے ملازم کو آواز دی کہ وہ دوسرے اسٹور وار کوانڈر بیج دے۔ اتنا کہہ کر وہ کسی فائل کو کھول کر دیکھنے کا بلکا سا دروازہ کھلا اور کوئی اس کے رو برو آ کر کھڑا ہو گیا مگر وہ آنے والے کو نظر انداز کر کے فائل میں ہی گم رہا۔

”ہیلو.....“ اگر آپ کی آگیا ہو تو میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔“ ایک نسوانی شیریں اور مترنم آواز نے اس کی توجہ فائل سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس نے نظریں اٹھا کر سر تاپاؤں اپنے سامنے لڑکی کو بھرپور طریقے سے دیکھا۔

زندگی میں اب تک اس نے اتنی سندر ناری نہ دیکھی تھی جس کے رخساروں پر روتازہ پھول کھلے دیکھائی دے رہے تھے گلابی ہونٹوں پر بھی بے آہنگ مسکراہٹ میں سارے جہاں کی رونقیں سمی نظر آرہی تھیں کھلے بالوں کی کالی سیاہ زلفیں کسی مست ناگن کی طرح جھوم جھوم کر دلوں کو ڈسنے کے لئے بے چین تھیں۔

ملہوڑا کی عمر اس وقت تیس سے تباؤ کر چکی تھی



پدمنی نے پارٹی میں خود کو کافی حد تک سنجیدہ رکھا وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا تو دور ہائے بیڑو بھی کرنا گوارہ نہیں سمجھتی تھی لمبوترے کے دوستوں نے کہا وہ ہمیں لفٹ نہیں کرواتی تو وہ مسکرا کر بات ٹال دیتا پھر وہ چاہتا بھی یہی تھا پدمنی اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچے ہی نہ۔

اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی ناری کے بارے میں اس کی سوچ ہمیشہ مٹی رہی اس نے عورت کی محبت سے خود کو دور رہی رکھا تھا مگر آج اس سندر لڑکی کو دیکھ کر اس کے دپار پل بھر میں بدل چکے تھے وہ جوانی کی محبت سے فرار رہتا تھا اب اس کی قربت میں رہنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔



دیدنی اور جیاجی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتی ہوں۔ ہم اس سنسار میں صرف وہی نہیں ہیں۔ ماں اور باپ جی کا چار ماہ پہلے ایک حادثے میں دیہانت ہو گیا تھا۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں غمی جھرائی۔ مہوڑا سے اس کی روہائی صورت برداشت نہ ہو سکی۔

”ادو..... بہت دکھ ہوا یہ سن کر۔ ہے بھگوان یہ سنسار تو بے ہی دکھ کی غمری۔ بھگوان ان کی اتنا کوشاقتی دے خود کو کیا صامت سمجھنا میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔“ وہ تو اندر سے تڑپ ہی گیا تھا اور اس کا دکھ بانٹنے کی پوری کوشش کرنے لگا۔

پدمنی نے کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ پھر اس کے اشارے پر مہوڑا نے بڑی سڑک چھوڑ کر گاڑی اس راستے پر ڈال دی جو ایک ویران علاقے کی طرف نکلتا تھا یہ سارا علاقہ بھوانی نگر کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اور اس علاقے کے متعلق مشہور تھا یہاں بھوت پریت اور آتما نہیں رہتی ہیں۔ وہ پہلے یہاں بھی نہ آیا تھا اس لئے اسے کچھ عجیب لگنے لگا۔

”تمہارے جیاجی کو یہی جگہ ملی تھی گھر بنانے کو۔“ وہ ہیزاری سے بولا۔

”ادو بھگوان کیسا ویران علاقہ ہے۔“ اس کی بات بھی ٹھیک تھی یہاں انسانی آبادی کم ہی تھی صرف چند ایک مکانات دکھائی دے رہے تھے۔

”ہاں..... ہمارے لئے یہی سوگ ہے ورنہ اتنے بڑے شہر میں کہاں سر چھپانے کو ملتا ہے اس مہنگائی میں تو لوگ دو وقت کی روٹی کو ترس جاتے ہیں مکان کی تو بات ہی دور ہے۔“ بات کرتے ہوئے وہ کہیں کھوسی گئی۔

گاڑی اب آبادی میں داخل ہونے کے بعد ایک گلی سے گزرتی ہوئی ایک پختہ اور کشادہ مکان کے آگے جا کھڑی ہوئی۔

”بس..... یہی ہمارا گھر ہے۔“ پدمنی نے اس مکان کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ اندر تشریف لائیے دیدنی اور جیاجی سے

مل لیں اور چائے تو لازمی پی کر جائیے گا۔“ وہ گاڑی سے باہر نکل گئی۔

مہوڑا نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو منزلہ مکان کا جائزہ لیا ایک عجیب سی دشت اور ویرانی مکان پر چھائی ہوئی تھی اس کا دل لرزا تھا مگر وہ پدمنی کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”بہت دھن داڑا پدمنی جی پھر کبھی یہی میرا خیال ہے کہ اتنی رات کو آپ کی دیدنی اور جیاجی کو تنگ کرنا مناسب نہیں، ہو سکتا ہے برا مشقوں کر جائیں۔“ وہ بات تو اس سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں اس مکان پر لگی ہوئی تھیں۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔“ پدمنی نے ہاتھ ہلایا اور اس مکان کے داخلی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

مہوڑا نے ہاتھ ہلانا بھی مناسب نہ سمجھا اور گاڑی آگے بھاگادی۔

☆.....☆.....☆

بڑا آرڈر ملنے کی یاد اس میں تمام اشاف کی سیلری بڑھ چکی تھی پدمنی کا چہرہ خاص و عام کی زبان پر تھا۔ بڑا آرڈر اس کی سر ہون منت تھا مہوڑا اندر سڑی آسان کی بلندیاں چھونے لگی خود مہوڑا ابھی اس کے بنا خود کو تنگ سمجھنے لگا تھا۔ اس کی موٹی صورت اس کے دل میں اتر چکی تھی شاید دل کے کسی کونے میں اس کے پیار کا پودا پروان چڑھنے لگا وہ بہانے بہانے سے اسے آفس بلاتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اسے اپنے پاس بیٹھانے رکھنے کی خوب ایکٹنگ کرتا۔

پدمنی اس کے تیور اور اشارے کنایے اچھی طرح سمجھ رہی تھی وہ جانتی تھی اس کا پاس اسے پنہ کرنے لگا ہے اور شادی کے لئے بھی اپنی آمادگی ظاہر کرے گا مگر وہ صرف مسکرا کر رہ جاتی۔ شاید اس کے پاس ایسی صورت حال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد مہوڑا اپنے لان میں جا بیٹھا اور سے نوش شروع کر دی۔ وہ کبھی کبھار ہی

اگر تھکا مگر آج اس کا دل چاہا خوب ہے۔ اس کے دل و دماغ پر پدمنی کا جو بھوت سوار ہوا تھا اس کی ہفت لپٹا جاتا تھا۔

ایک پیگ چڑھا کر جب اس نے سامنے دیکھا تو پدمنی دکھائی دی جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”پدمنی.....“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مخاطب کیا۔ مگر وہ غائب ہو چکی تھی وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا اپنی گھر کا دھوکہ سمجھ کر جب اس نے دوسرا پیگ چڑھا مگر دوسری طرف دیکھا تو وہ وہاں کھڑی دلغریب انداز میں مسکرا رہی تھی۔

”پدمنی تم میری آواز کیوں نہیں سن پارہی۔“ وہ ڈرگائی آواز میں چلایا۔

”کیا ہوا صاحب۔“ اس کے ایک ملاز نے آکر پوچھا۔

”مجھے..... مجھے کیا ہوا ہے۔“ وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔

پھر اس نے اسے اس نے خود کو شرمندہ محسوس کیا۔

”تم جاؤ یہاں سے۔“ اس نے ملازم کو اشارہ کیا۔

وہ جان چکا تھا پدمنی کی بہت اس کے دل کے ہاتھ خالوں میں اتر چکی ہے جس سے کو خاص کر وہ اس کے بس میں نہ تھا وہ دل و جان سے اس کے سین میں جوا کیلئے بیٹوں کے آگے ہار چکا تھا اب خود اس کے بنا ہاتھ خالوں میں اتر چکا تھا اس نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا چاہے کچھ بھی ہو جائے اسے دل کی آزادی سنائے گا وہ رات اس نے کھن کھن میں گزرائی۔ سڑی کے وقت بمشکل اس کی آنکھ لگی لہذا وہ اس کی لپٹ سے بچا۔ جب وہ آفس پہنچا تو فوراً اس نے پدمنی کو اپنے پاس بلالیا۔

وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کے سامنے آکر بیٹھ گئی اسے قیاس تھا کہ پاس کام کے متعلق کوئی بات کرے گا لہذا اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل اس کے آگے رکھنا چاہی مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے

فائل واپس رکھنے کو کہا۔

”پدمنی.....“ ایک لمحہ تاسف کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا۔

”پتہ نہیں مجھے یہ بات کہنی چاہئے یا نہیں مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک بات کا کہنا چاہتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

”بولئے..... میں سن رہی ہوں۔“ پدمنی کا من چاہا بات پوری ہو۔

”میرا خیال ہے یہ بات یہاں کرنا ٹھیک نہیں۔“ چاکلیک ہی وہ کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا شام کو کہیں ملتے ہیں اس نے بات کا پائسا پلٹا تو پدمنی حیرت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”سر اسب ٹھیک تو ہے نا.....“ وہ بے چینی سے بولی۔

”ہاں، ہاں سب ٹھیک ہے۔ چٹا کی کوئی بات نہیں۔ شام کو مون لائٹ رہنٹورنٹ میں ملتے ہیں۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”ادو کے میں غائم پر آ جاؤں گی اب آ گیا دیجیے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے جاؤ تم مگر یاد رکھنا ٹھیک چھ بجے۔“ مہوڑا کے چہرے پر رونقیں اٹھ آئیں۔

وہ سیدھی اپنے سین میں آگئی کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی جب کے وہ کرسی سے ٹپک لگائے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔

شام چھ بجے مہوڑا رہنٹورنٹ میں پہنچ چکا تھا اپنی دانست میں وقت کا جائزہ تھا مگر پدمنی ابھی تک نہیں آئی تھی کافی دیر بیٹھنے کے بعد اس نے گھڑی کی طرف دیکھا سے پتا چار ہاتھ اب وہ مسلسل گھڑی کی طرف دیکھنے لگا کچھ دیر کے بعد اس نے پدمنی کا موبائل نمبر ملایا تو آگے سے وہ بھی سوچ آف جا رہا تھا۔

”یہ پدمنی کا نمبر کیوں آف جا رہا ہے اور وہ ابھی



## موبائل فون میں گم

بیجنگ موبائل فون استعمال کرتے وقت انسان کو اپنے ارد گرد سے چوکنا رہنا پڑتا ہے اور صارفین کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ چلتے ہوئے یا دوران ڈرائیونگ موبائل فون استعمال نہ کریں کیونکہ ان کے ایسا کرنے سے وہ کسی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں کچھ ایسا ہی چین میں ایک خاتون کے ساتھ بھی ہوا۔

حال ہی میں سوشل میڈیا پر بیجنگ کے ایک شاہنگ مال میں نصب سی سی ٹی وی کیمروں سے ریکارڈ ہونے والی ایک ویڈیو آپ لوڈ کی گئی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ شاہنگ مال میں ایک خاتون واک کے دوران اپنے موبائل فون پر ایس ایم ایس کرنے میں اس قدر کھو جاتی ہے کہ اسے یہ دھیان نہیں رہتا کہ وہ کدھر جا رہی ہے اور اس کے سامنے کیا آرہا ہے اور اچانک وہ شاہنگ مال کے صحن میں بنے فوارے پر جو پانی سے بھرا ہوتا ہے میں جا گرتی ہے۔

اس ویڈیو کو اب تک ہزاروں افراد دیکھ کر نہ صرف افسوس بلکہ پسند کا بھی اظہار کر چکے ہیں اور کہا ہے کہ موبائل استعمال کرتے وقت ارد گرد کا بھی خیال رکھنا چاہیے ورنہ ایسا کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

(انس شوکت۔ فیصل آباد)

مجھے بتاؤ میں تمہارے بنا کیسے رہوں۔ میرے پاس ہنگوان کا دیا سب کچھ ہے تو کرپیں، گاڑیاں ہیں بڑا پولس اور دولت ہے کسی چیز کی نہیں، ہاں میں نے کی محسوس کی تو صرف تمہاری..... بولو پڈنی کیا تم جیون بھر میرا ساتھ دینے کو تیار ہو۔“

وہ بولتا جا رہا تھا اور وہ شانتی سے سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی پھر اس کے خاموش ہوتے ہی وہ بولی۔ ”ملہوڑا صاحب! میں نہیں جانتی آپ کو مجھ میں ایسا کیا دکھائی دیا مگر شادی بیاہ کا فیصلہ لینا کوئی عام بات نہیں۔ بہت دچار کے بعد یہ قدم اٹھانا پڑتا ہے آپ کی اور میری حیثیت میں ہنگوان نے بہت دوریاں رکھ دی ہیں جن کو آسانی سے بھانڈنا بہت مشکل ہے آپ جیسے جیون ساتھی کا ساتھ تو قسمت والوں کو ملتا ہے مگر میں سوچ کچھ کر آپ کو اپنی رائے سے آگاہ کروں گی مجھے کچھ دنوں کا وقت چاہئے۔“

”سوچو ضرور سوچو مگر میں یہ آشا کر سکتا ہوں تمہارا جواب میری ہی جھولی میں گرے گا۔“ وہ یقینی انداز میں بولا۔ ”اکی اس بارے میں کوئی لفظ نہیں کہنا چاہتی۔ مجھے اپنے جیجائی اور پدیلی سے بھی پوچھنا ہے۔“ وہ حتی انداز میں بولی۔

”یہ تمہارا حق ہے ان سے مشورہ کرنا میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔“ اس نے بل ادا کیا اور دونوں باتیں کرتے ہوئے کار پارکنگ کی طرف آگئے۔ ملہوڑا نے گاڑی میں بیٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

”نہیں میں چلی جاؤں گی آپ چلے جائیں۔“ وہ پٹیکے سے انداز میں بولی۔

”کیسی بچل جیسی باتیں کر رہی ہو۔ بیٹھو گاڑی میں۔“ اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی ملہوڑا نے اسے زبردستی گاڑی میں بیٹھالیا۔ گاڑی بڑے روڈ پر دوڑنے لگی۔

”پڈنی! جانتی ہو۔ آج میں بہت خوش ہوں جب تم نے مجھے سر کے بجائے نام لے کر پکارا تو میں

تک آئی کیوں نہیں۔ میں نے تو اسے وقت پر ہی آنے کو کہا۔“ وہ اپنے تئیں بولا۔ ایک بار پھر اس نے نمبر ملانے کی کوشش کی مگر نمبر بند اور سنڈس موصول ہوا اس سے پہلے وہ غصے سے موبائل ٹھیل پر پٹ پٹ پٹ سے آتی دکھائی دی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے اور آنکھیں مسرت سے جھپکنے لگیں وہ ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اس کی نظریں دروازے پر جمیں اس نے اس بیرے کی مٹی گرم کر دی تھی جس نے اس کے ٹھیل کو خوب سچایا تھا۔

پڈنی کو پانی طرف آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا آج اس کی مستانہ چال میں بجلی بھری ہوئی تھی جیسے سب کو جلا کر رکھ کر دے گی وہ اس کے قریب آ جلی گئی ایک بار پھر وہ اس کی سندرتا میں کھو گیا۔

آج بھی اس نے گلابی ساڑی پہنی ہوئی تھی ماتھے پر بھی بندیا نے اس کے روپ کو اتنا نکھار دیا تھا کہ ملہوڑا کے لئے آنکھیں جھپکنا بھی دشوار ہوا جا رہا تھا۔ ”میں معافی چاہتی ہوں..... دراصل وہ رکشہ کچھ لیٹ ملا تھا اس وجہ سے دیر ہوئی میں ایک بار پھر شا چاہتی ہوں۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ارے دیوی جی! کوئی بات نہیں ایسا اکثر ہو جاتا ہے اور جی پوچھئے تو اس میں قصور وار میں ہوں مجھے خود نہیں اپنی گاڑی میں لے کر آنا چاہئے تھا یا کم از کم کسی کو بھیجنا چاہئے تھا تمہیں لے آتا..... خیر چھوڑو اس بات کو بھٹو۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ دونوں آسنے سامنے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

”اچھا باتی باتیں بعد میں ہوں گی پہلے یہ بتاؤ کیا کھانا پسند کر دو گی؟“ اس نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

دھن دھن دھن بھوک نہیں ہے میں مگر سے کھانا کھا کے آئی ہوں۔ آپ کوئی ضروری بات کرنا چاہتے تھے۔“ وہ بولی۔

نہیں کچھ تو لینا ہوگا۔ میں تو گھر سے کچھ نہیں کھا کر آیا۔ سن تھا تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھاؤں۔“

ساتھ ہی اس نے ایک بیرے کو اشارہ کیا اگلے ہی لمحے ایک موبیل بیرا ان کے پاس کھڑا تھا ملہوڑا نے اتنا لمبا پوڑا آؤر دیا کہ پڈنی کے ساتھ بیرا حیران رہ گیا۔ بیرے نے ایک اچھتی سی نظر اس پر ڈالی اور سر جھکا کر چلا گیا۔

”سر..... آپ مجھ پر اتنا بڑا ظلم مت کریں۔“ پڈنی شاید خود کو اس کے سامنے شرمندہ سمجھنے لگی تھی۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اور یہ کیا..... سر لگا رکھا ہے۔ مجھے“ تم“ کہو اگر نام لے کر پکارو تو اچھا ہوگا۔ زیادہ نہیں تو چار سال تم سے بڑا ہوں گا۔“ وہ مسکرایا۔

”لیکن سر.....“ اس نے اگلی بات کرنا چاہی مگر ملہوڑا نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کر دیا۔ ”کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔“ بہر حال اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

کچھ دیر بعد بیرے نے پوری میز پر گرما گرم کھانا چن دیا۔

”پڈنی کھانا شروع کرو اس کے بعد دوسری بات کریں گے۔“ وہ کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگا پڈنی کو بھی بادل خواستہ اس کا ساتھ دینا پڑا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ملہوڑا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جس میں بے شمار سوا کا سمندر موجزن تھا۔

”پڈنی اتم سوچ رہی ہوں گی میں نے نہیں اچانک یہاں آنے کا کیوں کشت دیا۔ یقین مانو جب میں نے تمہیں پہلے دن اپنے آفس میں دیکھا تو دل نے فوراً کہا یہ وہی چہرہ ہے جس کی جنم جنم سے مجھے تلاش تھی میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا ہنگوان نے اس سنسار میں اتنی سندرتا ہی بھی بنا رکھی ہے میں نے آج تک شادی جیسی چیز سے فرار ہوتا رہا مگر تمہیں دیکھ کر میری تمام تر سوچیں بے بنیاد اور کھوکھلی ثابت ہو گئیں مجھے اپنی سوچ اپنے احساسات بدلنے پڑے نا جانے وہ کون سی ڈور ہے جو مجھے تمہاری طرف پھینکی آ رہی ہے تمہارا چہرہ نہ دن کو سکون نہ رات کو چین لینے دیتا ہے



کو بڑی شائقی ملی۔“ وہ گاڑی تو چلا رہا تھا مگر بار بار اس کی نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

پدمنی نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

سامنے جی ہیں وہ بولتا رہا اپنے اور اس کے جیون کے بیچے سنا سنا رہا آنے والے کل کا ایک حسین گل سجا کر اس کے سامنے رکھ دیا لیکن ایک آدھ شہ کے علاوہ اس نے بولنا گوارہ نہ سمجھا۔ شاید اسے اپنے سو بھائیہ پر رشک آ رہا تھا اتنا بڑا آدمی اس کی سندرہ اور شخصیت کے سامنے اپنا دل پارہ بیٹھا ہے اسی اثناء میں پدمنی نے اسے احساس دلایا کہ اس کا کھڑا چکا ہے ہاتھوں ہاتھوں میں اسے احساس ہی نہ ہوا وہ اس کے گھر کے سامنے کیسے پہنچ گئے آج بھی پدمنی نے اصرار کیا وہ دیدی اور جیجائی سے مل کر جائے یا کم از کم چائے تو لازمی ہے۔ مگر اندھیرے کی چادر میں ایسا تو اس عجیب سے مکان کو دکھ کر اس کے اعصاب پر ایک ان دہشتی دہشت سی طاری ہو گئی لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ گاڑی سے اتر کر اندر نہ جاسکا مکان کے بیرونی دروازے پر چلتے بلب اسے کسی بھوت کی آنکھوں جیسے لگ رہے تھے۔

”پدمنی یہ مت سمجھنا مجھے تمہارے گھر میں آنا اچھا نہیں لگتا یا تمہاری دیدی اور جیجائے ملنا گوارا نہیں مجھے تمہاری ہر چیز سے پیار ہے مگر نہ ناجانے کیوں مجھے تمہارے اس مکان سے ڈر لگتا ہے اسے دیکھتا ہوں تو عجیب سی دہشت محسوس کرنے لگتا ہوں خیر تمہیں جلد ہی یہاں سے لے جاؤں گا۔ اور تمہاری دیدی اور جیجائے سے بھی کسی ہوش میں بلا کر بات کروں گا۔“ وہ بولا۔

”جیسے آپ کی اچھا۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر گاڑی آگے بڑھا دی وہ وہیں کھڑی ہو کر اسے جاتے دیکھتی رہی۔

آفس میں کافی روز تک کام کا وہی معمول رہا ملہو ترانے اس سے کوئی بات نہ کی اور پدمنی نے کوئی لفظ بولنا گوارہ نہ کیا وہ ہر روز اس کے آفس میں ایک آدھ پتھر ضرور لگاتی لیکن کام کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ ہوتی۔ دن اسی طرح تیزی سے گزرنے لگے ملہو ترانے

اندھری اندر چلتے لگا اس نے تو پدمنی کو صرف چند روز ہی دیکھے تھے وہ اپنا فیصلہ سنا دے مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا اس بات کی خبر پورے اسٹاف کو ہو چکی تھی ڈی کے ملہو ترانے اپنی بی اے کو پسند کرنے لگے ہیں اور جلد ہی اس سے شادی کرنے پر تیار چکے ہیں ملہو ترانے اندھری اندر ہی فیصلہ کر لیا اگر پدمنی اسے کوئی جواب نہ دے گی تو وہ خود ہی اس سے بات کرے گا اس کا حوصلہ بونے لگا تھا پھر اگلی دو پہر اس نے خود ہی اسے بات کرنے کے لئے اپنے پاس بلایا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا۔ پدمنی نے اسے خود ہی کہہ دیا۔ وہ آج شام اسے اسی ہوش میں ملنا چاہتی ہے اس کو شواش ہو گیا پدمنی اس سے شادی کے لئے مان گئی ہے لہذا وہ پورے ٹائم پڑوں میں چلا گیا اور وہ دونوں ایک بار پھر آئے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

”ملہو ترانے صاحب! میں نے بہت سوچے سمجھے کے بعد آپ سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ بولنے لگی۔

”دیدی اور جیجائی تو مان ہی نہیں رہے تھے ان کا وچار تھا اتنا بڑا آدمی جسے کب قبول کر پائے گا دولت کے نشے میں مست بڑے بڑے لوگ صرف لڑکیوں کے جسم کے بھوکے ہوتے ہیں انہیں آتما سے کوئی پیار نہیں ہوتا لیکن میں نے دیدی اور جیجائی کو صاف بتا دیا ملہو ترانے صاحب بہت اچھے انسان ہیں مجھے ان سے شادی کرنے پر کوئی وقت نہیں وہ ہر حال میں مجھے خوش رکھیں گے اور میں ان سے ہر حال میں شادی کروں گی۔“ بات کرتے ہوئے وہ کچھ شرماسی گئی اور لگا ہیں جھکا لیں۔

”یعنی کے تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو گئی ہو۔“ ملہو ترانے کے چہرے پر خوشیاں رقص کرنے لگیں، مجھے شواش ہی نہیں ہو رہا پیاز پدمنی ایک بار پھر کہو۔“

”میں آپ سے شادی کے لئے تیار ہوں ملہو ترانے صاحب۔“ وہ دوبارہ بولی۔

اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر اس کا

ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔ پدمنی نے چہرے کی ناکام کوشش کی مگر ہاتھوں کے مضبوط پھیرے سے ملل کی چڑیا نکلتا ناممکن تھا۔

آفس میں جب دونوں کی شادی کی خبر پھیلی تو پورا اسٹاف ہی انہیں مبارکباد دینے آ گیا ملہو ترانے سب کو پیغام دے دیا آنے والے ہفتی وار کو اس کی شادی ہے اور چار دن کی چھٹی کا اعلان کر دیا کیونکہ سارا انتظام اسی نے ہی کرنا تھا اس نے پدمنی کو اپنے پاس بلایا تاکہ اس کی دیدی اور جیجائی کو کسی ہوش میں بلا کر شادی کے بارے میں آگاہی دے۔

”دیدی اور جیجائی تو گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ جیجائی جی کے کسی دور کے رشتہ دار کا دیہات ہو گیا ہے وہ کافی عرصے بعد گاؤں گئے ہیں ہو سکتا ہے کافی دنوں بعد ہی ان کی واپسی ہو۔“ وہ رنجیدہ سے انداز میں بولی۔

”بہت افسوس ہوا یہ سن کر.....“ ملہو ترانے اس سے سر ہلایا۔

”میں تو سوچ رہا تھا ان سے ایک پارل لوں چاہے شادی کا سارا انتظام مجھے ہی کرنا ہے ان سے رائے لینا بھی ضروری تھا وہ تمہارے بڑے ہیں۔ مجھے امید ہے وہ اچھی ہی رائے دیں گے۔“

”میں شادی کا فیصلہ دے چکی ہوں ان کے آنے یا نہ آنے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا آپ شادی کی تیاری کیجیے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی کہنہ کی اسٹاف کے علاوہ ملہو ترانے کی جان پہچان والوں نے بھی شادی میں شرکت کی بڑے بڑے لوگوں کی بھرپور موجودگی میں مقدس آگ کے سات چکر لگا کر وہ پتی پتی کے مشروط مہمن میں بندھ گئے ساتھ ہی اس نے پدمنی کے گلے میں منگل سوت بھی پہنا دیا۔ یہ منگل سوت اس نے خاص طور پر ایک منگلے سار کی دکان سے بنوایا تھا۔

”رات کافی بیت چکی تھی ملہو ترانے کے دوستوں نے اسے بتایا آج اس کی سہاگ رات ہے لہذا وہ اپنی پتی

کو لے کر اپنے بیڈ روم میں چلا جائے اس نے شادی کے جوڑے میں لدی پھندی دلہن سے کہا۔

”اب ہمیں کمرے میں چنا چاہئے۔“ اس نے فوراً ہاں میں سر ہلادیا وہ شاید تھک چکی تھی اور وہ اپنی منزل میں ان دونوں کے لئے ایک کمرہ خوب سجایا گیا تھا وہ دلہن کا خوب صورت ہاتھ تھا اسے اوپر لے آیا گلاب کی پتیوں سے مزین اور آراستہ بیدر استہ سجائے پتنگ پر اس نے پدمنی کو بیٹھا دیا۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا موبائل نیچے رہ گیا ہے وہ پدمنی کو بتائے بغیر جلدی جلدی نیچے آیا اور موبائل اٹھا کر اوپر چلا گیا اس کا موبائل میز کے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا موبائل جب میں ڈال کر جب وہ اوپر کمرے میں آیا تو پدمنی اپنے بیڈ پر تھکی۔

”یہ پدمنی کہاں گئی؟“ وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا تب ہی اس کی نظر ایک طرف دیوار پر پڑی پدمنی وہاں منہ دوسری طرف کھڑی تھی۔

”ارے جانو تم وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ ادھر آؤ نا۔“ اس نے بڑے پیار سے پکارا۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”یہ کیا مذاق ہے پدمنی ادھر آؤ نا۔“ وہ اس کے قریب چلا گیا وہ اب بھی اسی طرف منہ کئے کھڑی رہی۔

”لگتا ہے سرکار آج خوب ستانے کے چکر میں ہیں۔“ اس نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جب اپنی طرف کیا تو..... جیسے آسمان سے بجلی گری اور ہوا کے کئی جھوکے کمرے میں گھس کر پدمنی کے ارد گرد دھونے لگے وہ کئی فنٹ اچھل کر پشت کے بل جاگرا۔ جیسے ہزاروں بجلی کا جھکا اس کے سر پر لوگاہو۔ اس کی آنکھیں جرت سے پٹی کی پٹی کی جھریں چہرے پر بیسنے کی روانی تھیں ہوتی تھیں اندر لے جانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا پدمنی کی جاکوئی اور کھڑی تھی جس کی آنکھیں چلتے چلتے کی طرح دھک رہی تھیں اور ہوا کے جھوکوں سے کھلی زلفیں ادھر ادھر لہرائی تھیں۔

”تنت..... تم ابھی زندہ ہو۔“ وہ لیٹے لیٹے ہنسنے لگا



انتہائی بول پایا۔

”ہاں میں ابھی زندہ ہوں اور تیری موت بن کر آئی ہوں۔“ وہ اس قدر گرجی کہ ملبہوتا کو اپنے کانوں کے پردے پہننے محسوس ہوئے۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو خود تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھائی میں گرایا تھا تم جی کیسے نکلیں۔“ اس نے بولنے کی سر توڑ کوشش کی۔

”یہ سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے جو اس نے تم جیسے راکھ کش کوڑک میں جھونکنے کے لئے نیا جیون دان کیا ہے۔“ وہ چلائی۔

”تمہارے جیسے عالم اپراڈی منٹ کو اس سنسار میں رہنے کا کوئی عدد کار نہیں تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہے جو پھل نہیں سکنا یاد کرو اس وقت کو جب تم نے میرے ساتھ کتنا بڑا پاپ کیا تھا میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی رہی روٹی رہی چلاتی رہی مگر تم نے میری ایک نہ چلنے دی۔“ اس لڑکی کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے۔

لڑکی کی باتیں سن کر ملبہوتا کسی گہری سوچ میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

دلوکار اور اس کا دوست اندرو ما ایک رات ایک بڑی پارٹی سے ہو کر گھر آ رہے تھے یہ ان دونوں کی بات ہے جب دلوکار نے بڑسن میں ابھی نئے نئے پیر جمائے تھے اندرو ما اس کے ساتھ ایک پارٹی میں نکلایا اور گہرا دوست بننے کے ساتھ پارٹنر بھی بن گیا ہر بڑی میٹنگ یا پارٹی میں دونوں ایک ساتھ ہی جاتے مسٹر ڈانے اس رات بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تو ان دونوں کو بھی انوائٹ کر لیا۔ دونوں نے خوب ڈرنک لی مگر اندر نے کچھ زیادہ ہی لی تھی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتا لہذا دیو کو اسے کھلے جانا ہی پڑا۔

اس رات موسم بہت خراب تھا طوفانی بارشوں اور اوپر سے چمکتی آسمانی بجلی نے ماحول بڑا خوف ناک

”صاحب! مجھ غریب پر دیا کیجیے میری ماں بہت بیمار ہے اسے اسپتال لے کر جانا ہے اگر آپ اسے اپنی گاڑی میں جگہ دے دیں گے تو سارا جیون آپ کی

اُمہاری رہوں گی۔“ لڑکی ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔

”ماں بیمار ہے۔“ دیو نے اسے اوپر سے لے کر نیچے تنک ہون بھری نظروں سے دیکھا۔

”کہاں ہے تمہاری ماں۔“

”وہ رہی صاحب! بیڑ کے نیچے۔“ اس نے درخت کے نیچے اشارہ کیا۔

وہاں ایک عورت موجود تھی شاید وہ بہت زیادہ تکلیف میں مبتلا تھی۔

”صاحب جلدی کیجیے بہت درد ہو رہا ہے کہیں میری ماں کو کچھ ہونا جائے۔“ ایک دفعہ وہ پھر رونے لگی۔

”ہاں چلو۔ وہ دونوں گاڑی سے اتر کر اس لڑکی کے ساتھ اس درخت کے نیچے آ گئے جہاں ایک بڑھیا درخت کی وجہ سے کراہ رہی تھی ان دونوں نے اسے اٹھایا اور گاڑی تک لے آئے دفعتاً دیو نے اندر کو اشارہ کیا۔

جو وہ فوراً کچھ کیا اس بڑھیا کو آگے دیو کے ساتھ بیٹھا دیا اور خود اندر چلی سیٹ پر اس لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا گاڑی چل پڑی تیز بارش کچھ چمک کے ساتھ بدستور جاری تھی کچھ دیر بعد گاڑی اس روڈ پر چھوڑ کر ایک چھوٹے مگر پختہ ویران سے روڈ پر دوڑنے لگی۔

”صاحب! یہ آپ گاڑی کس طرف لے جا رہے ہیں اس طرف تو کوئی بھی اسپتال نہیں۔“ پچھل سیٹ پر بیٹھی لڑکی نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہنے پورا در دیا۔

”تر چنان کرو، ہم تمہاری ماں کو اس اسپتال میں لے کر جا رہے ہیں جہاں ان کو کوئی کثت کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ دیو نے سختی سے انداز میں مسکرا کر کہا۔

لیکن لڑکی کو چین نہیں آ رہا تھا وہ بار بار اطراف میں دیکھ رہی تھی کچھ دیر بعد گاڑی ایک برساتی نالے کے قریب جا کھڑی ہوئی بارش کی وجہ سے وہاں کافی طغیانی رواں دواں تھی تیز بہتے پانی کی آواز دور دور تک ملانی دے رہی تھی۔

دیو دروازہ کھول کر باہر آ گیا پھر اس نے دوسرا دروازہ کھول کر اس بیمار بڑھیا کو باہر نکالنے لگا۔

”آپ لوگ یہ کیا کر رہے ہیں..... میری ماں کو کہاں لے جا رہے ہیں۔“ اندر بیٹھی لڑکی اچھلی تو اندر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے بری طرح قابو کر لیا لڑکی باہر نکلنے کے لئے پوری طرح زور آزمائی کرنے لگی۔ اس نے چلانا چاہا مگر اندر جیسے مضبوط انسان کے ٹھیکے نے اسے چڑیا کی طرح بے بس سا کر دیا۔

دیو نے درو سے تڑپتی بڑھیا کو باہر نکالا اور اس کے سر پر سیدھا ہاتھ اس انداز میں مارا کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑی۔ اس کے منہ سے آہ نکلتی تھی اس نے بڑھیا کو کندھوں پر اٹھایا اور پل کے کنارے پر لے گیا پھر اگلے ہی لمحے ایک پل کی تاخیر کے بغیر اس نے بڑھیا کو کسی نوزائیدہ بچے کی طرح تھما کر بہتے پانی میں پھینک دیا بڑھیا کا سر بڑھتا ہوا کافی دور تک چلا گیا دیو کے ہونٹوں پر سفاکی مسکراہٹ پھیل گئی وہ گاڑی کی طرف واپس آ گیا۔

لڑکی خود کو چھڑانے کی کوشش میں اندر سے نبرد آزما تھی اندر اس پر پوری طرح حاوی تھا لڑکی کی چیخنے چلانے کی کشتی اندر ہی اندر دم توڑنے لگی دیو اپنے کپڑوں سے ہاتھ صاف کرتا ہوا گاڑی کی پیچلی جانب آیا پھر اس نے دروازہ کھول کر دیا ہی ہاتھ لڑکی کے سر پر مارا اگلے ہی ساعت لڑکی بے ہوش ہو کر سیٹ پر پڑی ہوئی تھی۔

”سالی..... بہت گرمی دکھا رہی تھی ابھی جا کر اس کی گرمی دور کرتا ہوں۔“ اس نے حقارت سے تھوکا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی واپس گھمادی۔

لڑکی کو ہوش آیا تو وہ ایک بڑے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی اس نے آنکھیں کھول کر جب سامنے دیکھا تو دیو اور اندر اس کی طرف دیکھ کر مسخرانہ انداز میں مسکرا رہے تھے معاً جب لڑکی کی نظر اپنے شیر پر پڑی تو اس کے شیر سے سارے کپڑے غائب تھے اس نے زور سے چیخنا چلا نا چاہا۔



”چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بے بی یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“ دیو نے اس کا مذاق اڑایا۔  
”تم لوگ منٹھ نہیں رہو راکھشش ہو راکھشش.....“  
لڑکی چلائی۔ ”بھگوان تمہیں بھی شہ نہیں کرے گا تم نے میری ماں کو پانی میں بہا دیا۔ اس کا بہت برا انجام ہوگا۔“

”ابھی بھگوان کو چھوڑو..... خود کو بچاؤ چپ چاپ اپنی گرم جوانی سے نہیں مزے لوٹنے دو..... اپنے سندر شریر سے ہمیں اپنی پیاس بجھانے دو۔“ اندر بولا۔  
پھر دونوں نے اپنی اپنی شرتیں اتار چھینیں۔

”دیکھو! میرے قریب مت آنا ورنہ میں تم دونوں کو جان سے مار دوں گی۔“ لڑکی غرائی۔  
مگر اس کی دھمکی ان دونوں کے سرے کے اوپر سے گزرتی۔ انہوں نے جست لگا کر اسے بھوکے بھیڑنے کی طرح دیو بچ لیا پھر بارش کی گرج چمک میں اس لڑکی کی چپٹیں دبے لگیں لڑکی کی عزت لٹ چکی تھی اور وہ بستر پر بے ہوش پڑی تھی ان دونوں نے کپڑے پہن کر سرگرمی سے لگائے۔

”اب اس چھوڑی کا کیا کرنا ہے۔“ اندر نے لمبا کش لگا کر پوچھا۔

”اٹھا کر اسی نالے میں پھینک آتے ہیں جہاں اس کی ماں کو پھینکا تھا دونوں ماں بیٹی ایک ساتھ سورگ میں جائیں گی۔“ دیو کی بات پر دونوں نے بلند قہقہہ لگایا پھر پیاس جزی ہوئی چادر سے اس کے وجود کو پلیٹ کر گاڑی کی طرف آئے بارش جوں کی توں گرج چمک کے ساتھ جاری تھی اس کی شدت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا لڑکی کو کچھلی سیٹ پر پھینک کر دونوں آگے بیٹھ گئے دیو نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہی گاڑی بڑے گیٹ سے اپنی حویلی نما مکان سے باہر نکال لی۔ گاڑی بڑے روڈ پر دوڑنے لگی جہاں پر صرف اکا دکا گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔

جلدی وہ اس نالے کے پاس پہنچ گئے۔  
”اندر اسے اٹھا کر پھینک دو۔“ دیو نے اس کے

کندھے پر ہاتھ مارا۔

”مم..... میں۔“ اندر گڑ بڑایا۔

”ہاں جاؤ جلدی کرو، اور شیر کی طرح بہادر بنو بکری کی طرح میں میں مت کرو۔“ دیو نے دروازہ کھول کر اسے باہر کی طرف دھکا مارا۔ بادل خواستہ اندر نے دروازہ کھول کر اسے کندھوں پر اٹھالیا اور پل کے کنارے اس جگہ لے آیا جہاں دیو نے اس کی ماں کو پھینکا تھا۔

ایک پل کو اندر گڑ بڑا اور دروازے لڑکی کے شریر سے خوف آنے لگا تھا مگر دیو کی موجودگی میں اس نے دل کو مضبوط کیا اور اسے بپتے پانی میں پھینک دیا۔ پل کی چمک میں اسے لڑکی کا وجود دھکا دھکا دکھائی دیا بارش کی دہ سے اس کے کپڑے تکیے ہو چکے تھے مگر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے ماتھے سے پسینہ بہہ رہا ہو۔ اسی اثناء میں دیو نے ہلکا سا ہارن بجایا اور اسے گاڑی کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ شریر نے بے چارے ہی گاڑی واپسی کے لئے مڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

لمہوڑا کو ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ بیٹے ماضی کی فلم اس کے سامنے چل چکی تھی اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا جس لڑکی کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مار کر پانی میں پھینک دیا تھا وہ زندہ کیسے ہوئی۔

”سب کچھ یاد آ رہا ہے ناں..... کہنے۔“ ظالم۔“ لڑکی نے آگے بڑھ کر ایک بھر پور پھٹسراں کے گال پر رسید کر دیا۔ وہ ایک سمت جا کر اور اس کے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔

”ہاں..... سب کچھ یاد آ گیا۔ مگر وہ نالہ تو پانی سے بھرا ہوا تھا تمہیں تو مر جانا چاہیے تھا مگر تم زندہ کیسے بچ گئی۔“ اس کی آنکھوں میں دہشت کے علاوہ حیرانگی بھی تھی۔

”میں کیسے بچ گئی۔ سنو حرام زادے جب تم لوگوں نے اٹھا کر مجھے اس نالے میں پھینکا تو میری آتما شریر سے نکلنے کے لئے بے چین تھی میرا شریر ڈوبتا ڈوبتا

بہت دور چلا گیا یہاں تک کہ ایک کنارے کے ساتھ جا لگا۔ اس کنارے ایک بہت بڑے سادھو کی کنیا تھی وہ پانی کے اندر کھڑے ہو کر اشان کر رہے تھے اچانک ان کی نگاہ میرے شریر پر پڑی جو چادر میں لپٹا ہوا تھا سادھو مہاراج نے اپنے شیشوں، چیلوں کو آواز دی انہوں نے پھر اشریر پانی سے نکالا۔ سادھو مہاراج نے میری کلائی دیکھی تو مجھ میں زندگی کی کچھ سانسیں ابھی باقی تھیں انہوں نے مجھے اٹھایا اور پانی کنیا میں لے آئے۔

سادھو ہری رام بہت بڑا شریر ہونے کے ساتھ لادھیا کھلتیوں کا مالک بھی تھے بہت سے جنت منتر اور آتما تیں ان کے قبضے میں تھیں انہوں نے مجھے پہانے کی پوری کوشش کی مگر میری آتما میرے شریر کا ساتھ چھوڑ گئی سادھو مہاراج نے اپنی کھلتیوں سے میری آتما کو اپنے دھ میں کر لیا ان کے کھیتوں نے میرا شریر جلا دیا میرا آتما کوشاقتی نہیں مل رہی تھی تم دونوں کو مارنے کے لئے بے چین تھی۔

ایک رات سادھو مہاراج نے مجھے اپنے پاس بلایا اور تمام رام کہانی پوچھی۔ میں نے سب کچھ بتا دیا شریر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے مجھ سے کہا۔ رام! تم ہی ان دونوں سے بدلہ نہیں لے سکتی وہ یہاں سے کوسوں میل دوری پر ہیں تمہاری آتما بھی ان تک پہنچ نہیں سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”مہاراج کوئی اپائے کیجیے میری آتما کوشاقتی نہیں مل رہی جب تک ان کو نرک میں نہ جلا دوں میں کھٹکتی رہوں گی۔“

مہاراج بولے۔ ”تمہیں اور مجھے بڑی سنگت دکھا کر پیڑے کی تختے تمہارے لئے ایسی کنواری کنیا شریر چاہئے جو اناؤس کی رات پیدا ہوئی ہو اور اسی رات اس کی مرتی ہو جاتی ہو۔“

”مگر مہاراج! ایسا شریر ملنا بہت مشکل ہے۔“ میں نے غیر یقینی انداز میں کہا اور واقعی ایسا شریر ملنا مشکل تھا جس کی نشانیاں سادھو ہری رام نے بتائی تھیں۔

”تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں کہیں سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا۔ میری بندی آتما میں مجھے بتا دیں گی مگر اس کے علاوہ مردے کی راکھ چاہئے جو ذات کا بتلی ہو اسے بکرے کا خون اور ایسے منٹھ کی کھوپڑی جو تمہاری عمر کا ہو۔“

”مہاراج یہ سب کام تو بہت مشکل ہے کیا یہ سب چیزیں مل جائیں گی۔“ میری بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔

”کیوں نہیں ملیں گی ڈھونڈنے سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے یہ تو بہت معمولی چیزیں ہیں میں سب کچھ یہاں پیدا کر کے رہوں گا۔“ سادھو پورے یقین سے بولے۔

”ٹھیک ہے مہاراج، لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔  
”میں تمہیں ایک منتر بتاتا ہوں، تمہیں وہ منتر سورج اگنے اور ڈوبنے کے سے پڑھنا ہوگا کچھ آتما تیں اچھی اور کچھ بری ہوتی ہیں وہ تمہیں یہ کہیں گی اس منتر کو چھوڑ دو اور نئے شریر کو پانے کا دھار اپنے من سے نکال دو مگر تمہیں ان کی باتوں میں بالکل بھی دھیان نہیں دینا اور منتر ڈوبتے چاند تک مسلسل پڑھتے رہنا ہوگا۔“

سادھو نے پوری بات سمجھا دی۔  
”مگر مہاراج میں خود ایک آتما ہوں ایسے منتر کی ادھیلتا تو زندہ انسانوں کو ہوتی ہے مجھے کیوں ہے۔“ میں نے انہیں کریدنا چاہا۔

”تم یہ بھید نہیں سمجھ پاؤ گی تمہیں اپنے لئے اگر وہ شریر پانا ہے تو ضروری ہے تم مجھ سے زیادہ برسن (سوال) نہ پوچھو۔“ شاید ان کو میرا زیادہ بولنا ٹھیک نہیں لگا تھا۔

”میں شہ چاہتی ہوں آئندہ کوئی بھی سوال نہیں کروں گی۔“ میں نے فوراً شہ چاہی۔

سادھو مہاراج نے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے چیلوں کو ہلکا کچھ خاص خاص باتیں سمجھائیں پھر دروازے کے علاقوں میں بھیج دیا۔ میں نے سادھو سے منتر سیکھا اور مقررہ سے میں



پڑھنے لگی صبح جب سورج اگتا اور شام کو جب ڈوبتا پوری توجہ سے پڑھتی تھی کانی دن ہو گئے منتر پڑھتے ہوئے اس دوران کئی بھگی ہوئی آتما میں میری توجہ ہٹانا چاہیں مگر میں اپنے مقصد میں ڈٹی رہی ایک روز سادھو کے چیلے ایک لڑکی کا شریر اٹھا کر لے لائے میں بھی وہاں موجود تھی مردہ لڑکی کا شریر بہت سندر تھا۔

”کہاں سے اٹھا کر لائے اسے..... یہ کئی بات ہے نا..... یہ لڑکی اماؤس کی رات پیدا ہوئی ادراوی رات مرتیہ.....“ سادھو نے اپنے چیلوں سے پوچھا۔

”جی کرو جی یہ لڑکی جھکے والا گاؤں کی ہے ہم نے لوگوں سے اچھی طرح پوچھ کر ہی ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسے اٹھا کر لائے ہیں۔“ اس کا نام پدمنی ہے۔“ چیلوں نے جواب دیا۔

”بہت اچھے۔“ سادھو مہاراج خوش ہو گئے۔

”جاؤ اب یہ پتہ کرو کہیں کوئی تیلی مرا ہے اگر وہ مرے تو اس کی فگر میں رہو۔ جب اس کی چتا کو آگ لگنی جائے تو تم لوگ وہیں کہیں چھپ جانا اور کسی بھی طرح اس کی راکھ اٹھا لینا کیونکہ لوگ تیلی کی راکھ اٹھانے نہیں دیتے۔ اس سے بہت سارے جادو منتر کھکے جاسکتے ہیں۔ جاؤ جلدی کرو۔“ چیلے وہاں سے چلے گئے پدمنی کے شریر کو سادھو مہاراج نے کوئی تیل نما میز پر رکھ کر ایک بڑے تابوت میں چھپا دیا اس کے بعد انہوں نے مجھے ایک اور منتر بتایا جسے دو گھنٹے تک پڑھنا تھا میں اس کا چاپ کرنے لگی تیسرے دن سوریا کے ڈھلنے ہی میری ماں کی آتما میرے پاس آئی اور بولی۔

”راما! یہ تم کس پتھر“ میں پڑ گئی چھوڑو یہ جنت منتر اور میرے ساتھ سورگ میں چلو۔ میں وہاں بہت خوش ہوں۔“

میں نے ماں سے کہا۔ ”مجھے ہر حال میں ان سے بدلہ لینا ہے اور میری آتما کو شافی اس سے تک نہیں ملے گی جب تک ان راکھشوس کی اپنے ہاتھوں سے بتیانہ کرلوں۔“ ماں مجھے کانی دیر تک سمجھاتی رہی مگر میں ان جاپ میں مرکوز رہی اس کے علاوہ کئی آتما میں بھی

پڑے تھے مگر میرے اہل ارادے کے آگے بے بس رہیں۔

تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ چیلے مردے کی راکھ اور کالا لکڑی لے آئے اس دن سادھو مہاراج بہت خوش تھے اور میرا منتر پورا ہونے والا تھا چاند ڈوبنے میں چند دن رہ گئے تھے سادھو مہاراج نے مجھے بتایا اب بہت جلد تمہاری آتما کنیا شریر بننے والا ہے تم ان اپرا دھیوں سے آؤں بدلہ لے سکو گی میں بھی خوش ہو گئی۔

اس رات چاند ڈوب چکا تھا سادھو مہاراج اپنی کنیا میں آلتی پاتی مارے کوئی منتر لاپ رہے تھے۔

پدمنی کا شریر ان کے سامنے پڑا تھا مردے کی راکھ اور بکرے کا تازہ خون انہوں نے اپنے آگے رکھ لیا۔ میں ایک کونے میں کھڑی ایک منتر پڑا رہی تھی میرے ہاتھ میں انسانی کھوپڑی تھی۔ سادھو کے کہنے پر مجھے سامنے رکھی تھی۔

کچھ دیر بعد سادھو مہاراج نے مردے کی راکھ پدمنی کے شریر پر ڈالنا شروع کر دی۔ شریر سے سفید دھواں اٹھنا شروع ہو گیا اور اس میں انترش پیدا ہو گئی۔ سادھو مہاراج نے بکرے کا خون خورا اس کے اوپر اٹھل دیا اب وجود کو جھکے گئے گئے۔ جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگا جا رہا تھا۔

”راما جلدی سے اس شریر میں داخل ہو جاؤ۔ دھواں بند ہونے سے پہلے تمہیں اس کے اندر داخل ہونا ہے مگر پہلے تمہیں اپنے ہاتھ میں کھڑی ہوئی کھوپڑی کو توڑنا ہوگا۔“ سادھو مہاراج بلند آواز میں بولے۔

میں نے سامنے دیوار پر کھوپڑی دے ماری جو اگلے ہی لمحے پاش پاش ہو کر کھڑی تھی ایسا محسوس ہوا جیسے میری آتما شریر کی طرف منتقلی ہو جا رہی ہو پھر مجھے جھکنا سا لگا اور میری آتما دھیرے دھیرے پدمنی کے شریر میں پیوست ہونا شروع ہو گئی۔

سادھو مہاراج بلند آواز میں منتر پڑھنے لگے میری آتما پوری طرح شریر میں داخل ہو گئی مجھے شریر محسوس

ہونے لگا پھر اگلے ہی لمحے میں اٹھ کھڑی ہوئی مردے کی راکھ اور بکرے کا خون میرے شریر سے غائب ہو گیا اپنا شریر پا کر میں بہت خوش ہوئی سادھو مہاراج بھی خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

”پدمنی! آج سے تمہارا یہی نام ہے۔“ سادھو مہاراج مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”راما ختم ہو چکی ہے اب تو جہاں چاہے جاسکتی ہے آسکتی ہے تمہارے اندر ایسی شکلیاں ہیں جو عام منٹس میں نہیں تمہارا ایک شترو (دشمن) دیو نکار اب ڈی کے ملبوڑا بن گیا اور اندر..... اندر جیت و رما کے نام سے جانا پچھانا جاتا ہے۔“

میں نے اٹھ کر سادھو مہاراج کو پرنام کیا اور چرن چھولے انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آشر بادیا اور میں وہاں سے غائب ہو کر اندر کے گھر آ گئی کیونکہ سادھو مہاراج نے مجھے کہا تھا پہلے مجھے اندر کو مارنا ہوگا۔

وگھر میں نہیں تھا میں اس کے بیرونی گیٹ پر ظاہر ہوئی اور ایک خوب صورت لڑکی کا روپ لے کر اس کے بوم گاؤں سے اس کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ وہ ایک شادی میں گیا ہوا ہے اور آج رات آجائے گا میں نے اس کا پتہ نہیں معلوم کیا اور وہاں چلی گئی شادی والے گھر میں گھر میں نے اسے باتوں میں ایسا لگایا کہ وہ میرا دیوانہ ہو گیا اور مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے پر یقین ہو گیا میں بھی تو یہی چاہتی تھی

رات دس بجے کے قریب اس کی گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر آئے تھی راستہ بھر میں اسے اپنے قریب آنے کا پتہ پور موقع دیا میں نے اسے فحش انداز میں آنکھ ماری تو اس کاوصلہ مزید بڑھ گیا۔

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

ہم کس علاقے سے زور رہے تھے یہ سارا پہاڑی علاقہ تھا یہاں ٹرانک کی آمدورفت کم تھی ایک کھائی کے قریب سے گزرتے ہوئے اچانک میں نے اپنی شکل اتنی ڈراؤنی اور کریمہ کر لی کہ اس کے تعلق سے ایک عجیب بلند ہوئی اسی بدحواسی میں گاڑی اس سے بے قابو ہو گئی اور سیدھی کھائی میں جا گری۔ میں جب تک اس کے پاس

کھڑی رہی جب تک اس کی آتما نے اس کے شریر سے ناظمہ ٹوڑا، پھر میں چیل بن کر وہاں سے اٹھی۔

پولیس نے اس کیل کو ایکسٹنٹ سمجھ کر کیس پر مٹی ڈال دی اس کے بعد میں تمہارے آفس میں آ گئی اور تم پر اپنے حسن کا جادو چلا کر اپنا گرویدہ کر لیا تم بھی مجھ پر بری طرح مر گئے۔

”بے وقوف آدمی کیا تم نے ایک پل بھی نہ سوچا ایک انجان لڑکی تم سے یک دم شادی کرنے پر کیسے آدمہ ہو گئی اور جہاں میں تمہیں لے کر جاتی رہی ہوں وہاں منٹس تو کیا کوئی پرندہ بھی نہیں رہتا۔ میری کوئی دیدی نہیں کوئی جیبا نہیں میں تو صرف تمہاری موت ہوں موت۔“ وہ چلائی۔

”مگر ایک کام تم نے بہت اچھا کیا کبھی گاڑی سے اتر کر میرے ساتھ میرے گھر نہیں گئے۔ ورنہ تجھے ایسی موت دیتی کہ ہر دیکھنے والے کی آتما کانپ کر رہ جاتی پھر من میں خیال آیا تجھے کوئی خوش دکھا کر مارنا چاہئے کیونکہ اس سے تیری آتما ایسے ترسے گی جیسے قصائی زندہ جانور کی چمڑی اڑی رہا ہے لیکن تو فکر مت کر اس سے بھی بھیا تک موت آج میں تجھے یہاں

دولں گی۔“

”مجھے شاکر دو پدمنی میں واقعی تمہاری اپرا دھی ہوں مگر بھگوان کے لئے میری جان چھوڑ دو۔“ اس نے ہلکے سہاتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔

”خاموش کئے! اپنی گندی زبان سے بھگوان کا پوتر نام مت لے تو نے اپرا دھ کیا ہے اور اپرا دھ، اپرا دھ ہوتا ہے کوئی غلطی نہیں۔ اس کا ڈنڈ تجھے ضرور ملے گا۔“ پدمنی چلائی۔

”مجھے اس بات کا احساس ہے انجانے میں مجھ سے اپرا دھ ہوا ہے مگر میں بھگوان کی سونگند کھاتا ہوں آئندہ کبھی ایسا اپرا دھ نہیں کروں گا۔“ ملبوڑا نے باقاعدہ سر زمین پر ٹیک دیا۔

”آج تجھے بھگوان بہت یاد رہا ہے مگر اس گھڑی کو بھی یاد کرو اپرا دھی میں نے بھی تمہارے آگے اسی

خوفناک کہانیاں 99 مئی 2018ء

خوفناک کہانیاں 99 مئی 2018ء

خوفناک کہانیاں 99 مئی 2018ء

خوفناک کہانیاں 99 مئی 2018ء



## انتقام



میری زندگی میں بہت سے ایسے مکر یہ ایک ہی نوعیت کا تھا اور یہ پہلا کیس تھا جس پر مجھے کوئی میڈل بھی نہیں ملے گا مگر میں مطمئن تھا اور میرے ضمیر کی داد میرے لیے کسی میڈل سے کم نہیں تھی۔

میرا فرانسفر اٹھ سالوں میں واقع ایک بہت بڑے قصبہ بہہ مانی میں ہوا تھا۔ مجھے آج بارہ بجے بہہ مانی جانا تھا چنانچہ اسی لئے میں آج سویرے بہت جلدی اٹھ گیا میں نے اپنے روزمرہ کے استعمال کی چیزیں اور کپڑے رات کو ہی بیک کر لیے تھے۔ صبح کو جلدی سے ناشتہ کرنے کے بعد میں پولیس اسٹیشن چلا گیا وہاں پر ضروری کوائف مکمل کرنے کے بعد میں گھر واپس آیا سامان اٹھایا اور بہہ مانی جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔

”میں انتقام لوں گی۔۔۔ میں انتقام لوں گی۔۔۔“

میں بہہ مانی والوں سے انتقام لوں گی۔ بہہ مانی والوں کا انت میرے ہاتھوں ہوگا میں سب کا ناش کروں گی۔

طرح ہاتھ جوڑے تھے چچی تھی چلائی تھی مگر تم نے میری ایک نئی میری زندگی خراب کر دی اپنی ہوس کی آگ کو بجھانے کے لئے میرے شریر کوکتوں کی طرح جھجھوڑا میری پیاری ماں جن کی گود میں، میں ٹھیلی پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی میری آنکھوں کے سامنے جیتے جی اسے پانی میں بہا دیا سوچا اس سے میری حالت کیا ہوگی کسی کے سامنے اگر اس کی ماں کو زندہ پانی میں پھینک دیا جائے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی۔“ پدمنی بول رہی تھی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

”نیکا ایک ملہوڑا کا دھیان دروازے کی طرف گیا۔ جو کھلا ہوا تھا اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ پدمنی اسے دیکھ چکی تھی اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل چکی تھی۔

وہ جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا وہ خود بند بند ہو گیا ملہوڑا نے اسے کھولنے کی بہت کوشش مگر لگتا تھا یاہر سے کسی نے لاک کر دیا ہے یہ دروازہ کیوں نہیں کھل رہا وہ دروازے سے کھڑکی کی طرف بڑھا مگر اس کے پٹ بھی بند ہو گئے پدمنی کا بلند قہقہہ کمرے میں گونجا اور ملہوڑا نے پٹ کھولنے کی بہت کوشش کی مگر کسی انجانی شہتی نے اسے قابو کر رکھا تھا پدمنی کے بلند قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے۔

”بھاگو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ موت سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔ آج تک موت سے بچ کر کوئی نہیں بھاگ سکا۔“ پدمنی چلائی۔

وہ بھاگ کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔

”دیکھو۔۔۔ میں ایک منٹ ہوں اور منٹ سے غلطی ہو جاتی ہے بھگوان کے لئے مجھے شاکر دو۔“ اس نے اس کے پیروں پر ہاتھ رگڑنا شروع کر دیا۔

”تم کوشش کہنا بھی، منٹ کے نام پر وہ ہے۔“

”کتے۔“ پدمنی نے اس کی پیلیوں میں بھر پور ٹھوکر مار دی ٹھوکر اس قدر بھر پور تھی کہ وہ سیدھا دیوار سے ٹکرانے کے بعد فرش پر آگرا۔ جیسے کسی انجانی شہتی کے چپو۔ نے بچے کی طرح اٹھا کر دیوار پر پٹھا ہو۔



جب لوگوں کو جنرل کی اصلیت معلوم ہوئی تو انہوں نے جنرل کو وہاں سے نکال دیا اور اس کی جتنی کوئی نکال دیا۔ وہ دونوں پتی بہہ مائی سے دور ایک غلیظ مکان میں رہنے لگے جنرل نے شیطان کی پوجا کرنی شروع کر دی۔ ایک دن جنرل نے شیطان کے کہنے پر مندر میں جا کر بھگوان رام کی مورتی کو نقصان پہنچا دیا گاؤں والوں نے اشتعال انگیز ہو کر جنرل کو زندہ جلا دیا اور شوہا کو گاؤں سے نکال دیا۔ شوہا گاؤں والوں سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

میں تھانہ بہہ مائی میں گیارہ بج کر بندہ منٹ پر پہنچا۔ ابھی میں پہنچا ہی تھا کہ تھانے میں کھلی جچی ہوئی دکھائی دی۔ میں تھانے کے اندر گیا اور کاشییل سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو کاشییل نے جواب دیا۔ ”جناب قصبے میں خون ہو گیا ہے“ میں نے جلدی سے ضروری کوائف مکمل کیے تھے کا چارج سنبھالا اور سپاہیوں کے ساتھ قصبے میں قتل ہونے والے کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا قتل ہونے والا ایک فرنیچر شاپ کا مالک تھا۔ میں جگہ واردات پر پہنچا اور جب لاش کو دیکھا تو میرے منہ سے ہلکی سی سسکاری نکل گئی قتل ہونے والے کا منہ ہلدی کی طرح زرد تھا اس کی آنکھوں سے بے پناہ دھشت تھی اور اس کا منہ بھی کھلا ہوا تھا اس کے علاوہ ایک خاص بات یہ کہ مقتول کے جسم پر کہیں بھی زخم کا کوئی نشان نہیں تھا سوائے گردن میں گھلے کے درمیان ایک سوراخ کے اور دوسری جیران کرنے والی بات یہ تھی کہ مقتول کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا میں اپنی چھ سالہ سروں میں پہلی مرتبہ اس طرح کے انوکھے کیس سے دوچار ہوا تھا میں نے پورے کمرے کی اچھی طرح سے چھان بین کی مگر کوئی بھی ایسی چیز نہ ملی کہ جس سے قاتل کا تھوڑا بہت سراغ ملتا۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی اور مقتول کی جتنی سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ قتل ہونے والا بہت ہی سیدھا سادا اور اس پند تھا اس کا نام گوپال ناتھ تھا گوپال ناتھ کی بیوی پاروتی کا رورو کر برا حال تھا میں نے اسے بہت تسلی دی اور اس سے پوچھا لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔

وہاں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد میں اسپتال پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لینے چلا گیا جگہ وارہ اس پر نہ تو قدموں کے نشانات تھے اور نہ کوئی فنگر پرنٹ اور نہ ایسی کوئی مشکوک بات تھی کہ جس سے قاتل کا کوئی سراغ ملتا۔ سنا پتی طرز کا بہت ہی انوکھا اور انتہائی پیچیدہ کیس تھا میں اسپتال پہنچا اور ڈاکٹر بھائیہ کی طرف چلا گیا ڈاکٹر بھائیہ سے ملنے کے بعد میں نے اپنا تعارف کر دیا اور پوچھا کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ رپورٹ تو بالکل سیدھی ہے قاتل کیس سے تاحیرت کی بات یہ ہے کہ ڈیڑھ باؤں برسی کا کوئی دن نہیں ہے سوائے گردن پر سوراخ کے۔ شاید قاتل مقتول کے جسم سے خون نکالنا ہو۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ایک سوراخ کے ذریعے پوری باؤں خون کیسے نکالا جاسکتا ہے میں نے حیرت سے پوچھا ڈاکٹر نے کہا ہو سکتا ہے قاتل نے اپنی ہوشیاری کے ساتھ اس اوزار استعمال کیا ہو کیونکہ اگر نہ درندہ بھی یہ حرکت کرتا تو کم از کم ناخون کے نشانات ضروری ہوتے۔

میں اس کیس پر کافی دیر تک ڈاکٹر بھائیہ بحث کرتا رہا اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گیا کیونکہ گہری ہو رہی تھی میری قیام گاہ ایک سرکاری کونویں بالکل عام طرز کی بنائی گئی تھی کوئی پر ایک مڑمٹا ہوا اس نے اپنا نام بابو راؤ بتایا تھا۔ اس نے کہا تا نکار کھانا کھانے کے بعد میں بیڈروم کی طرف روانہ ہوں بستر پر لیٹنے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی مگر نیند نہ آنکھوں سے کوسوں دور تھی میرا ذہن ابھی تک اس طرف الجھا ہوا تھا میں نے اس کیس کے متعلق جتنی سوچا میں اتنا الجھتا گیا۔ میرا ذہن مکمل طور پر مافوق ہو چکا تھا میں نے کب تک کیس کے متعلق سوچا اور پھر بچانے کب نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا میں تھانے میں پہنچا تھا کہ میرا کاشییل رشی دوڑا ہوا آیا اور آتے ہی بوکھلاتے ہوئے کہا۔ ”اپنا صاحب قصبے میں ایک اور خون ہو گیا ہے بالکل

مرح جس طرح گوپال ناتھ کا ہوا تھا۔“ میں جلدی سے اٹھا اور روانگی کے لئے تیار ہو گیا میں بارخون نارائن شکر کے گھر ہوا تھا اور نارائن شکر کو بھی بالکل اسی طرح سے قتل کیا گیا تھا جس طرح سے گوپال

میں نے انتہائی باریک بینی کے ساتھ جگہ بہ جگہ کا جائزہ لیا مگر کوئی بھی ایسی بات نہ دکھائی دی کہ جس سے قاتل کے متعلق تھوڑا بہت پتہ لگا سکتا۔ انتہائی کوشش کے باوجود میں ناکام رہا۔ نارائن شکر کے گھر پر بھی ویسا ہی سوراخ تھا جس کے ذریعے کسی اوزار کی مدد سے خون نکالا گیا ہوگا۔ میں نے کمرے کی ہر چیز کو ٹھٹھا ڈالا مگر کوئی بھی ایسی چیز نہ ملی کہ جس سے قاتل کا تھوڑا بہت سراغ مل سکتا مسز نارائن نے بھی ہم کو بہت حیران کیا انہوں نے کہا کہ میں نیند کی بہت رسیا ہو جب میری بیوی ہوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سو جاتی ہوں انہوں نے کہا کہ رات بھی وہ حسب عادت جلد سو گئی اور صبح سویرے اسی تو اپنے شوہر کی لاش کو دیکھا میں نے مزید انکوارزی کی مگر کوئی بھی ایسی بات منظر عام پر نہ آ سکی کہ جس کے ذریعے قاتل تک تھوڑی بہت رسائی مل سکتی۔ میں تو اس کیس میں الجھ رہا تھا۔

اس سے اگلے دن ٹھیک اسی طریقے سے جس طرح دو افراد کو مارا گیا تھا اسی طرح سے دوسرا کیس موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور پھر اس سے اگلے دن کیا لاش ناتھ کے چھوٹے چھوٹے درمیاں اور پھر اندرائے کو بھی ایک کے ایک کر کے قتل کر دیا گیا تھا قصبے میں کہرام مچ گیا لوگ اس بات سے اب تک اٹھ کھڑے ہو چکے تھے اور قاتل کا ہن تک نہیں مل سکا تھا بہہ مائی میں تو کیا اس بات نے میرے بھارت کو بلا دیا تھا رات کو لوگ ارٹ ہو کر سوتے مگر اس کا نام کمر گزرتا۔ دلی، ممبئی اور بھارت کہاں سے جس آفسر زوری ہوئی آئی آفسر زورے کو بھی قاتل کا سراغ نہ لگا سکا میں خود بھی بہت پریشان تھا ہر کوششوں کے باوجود میں ابھی تک ناکام تھا۔

مگر ان تمام مرزور کیسز میں ایک بات سے میں

چونکے بغیر نہ رہ سکا وہ یہ کہ جتنے بھی افراد جن کا اب تک مرزور ہو چکا ہے وہ سب جوان العمر تھے ان کی شادیوں کو سال سے زیادہ کا عرصہ نہ ہوا تھا اور دوسری بات جو زیادہ چونکا دینے والی تھی کہ مرنے والوں کی پتیاں سے تھیں مگر یہ کوئی ثبوت یا کوئی شہس بات نہ تھی کہ جو میں اعلیٰ حکام کے سامنے پیش کرتا کیونکہ ابھی تک تو میں خود اندھیرے میں تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک اتفاق ہو۔

آج چاند کی چودہ تاریخ تھی چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا رات کے تقریباً ڈیڑھ بج رہے تھے میں گھر جانے کے لئے روانہ ہو گیا تقریباً چاند منٹ کے بعد میں گھر پہنچا بابو راؤ اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا فریج میں کھانا رکھا ہوا تھا مگر مجھے ہوک نہیں تھی میں نے فریج میں سے برائڈی کی بوتل نکالی اور پینا شروع کر دی۔ ایک بوتل پینے کے بعد مجھے کمرے میں محسوس ہونے لگی میں نے دوسری بوتل نکالی اور بیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا میں نے ایک طرف رکھی ہوئی کرسی اٹھائی اور چاند کی طرف کر کے بیٹھ گیا اور برائڈی پینی شروع کر دی ابھی بیٹھے ہوئے مجھے تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی ہوگی کہ مجھے نیچے کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں میں چونک کر سیدھا ہوا میں نے دیکھا تو مجھے ایک انسانی ہیولہ دکھائی دیا غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ میرا ملازم بابو راؤ تھا پھر اس کے بعد میں نے ایسا منظر دیکھا کہ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا میں نے دیکھا کہ بابو راؤ کی آنکھوں سے سرخ رنگ کی روشنی نکل رہی تھی اور نیچے زمین کی طرف جذب ہونے لگی اس طرح کہ جیسے زمین پر کوئی نا دیدہ ہستی درویش اپنے اندر جذب کر رہی ہو میں نے آنکھیں میچاؤ میچاؤ کر زمین پر موجود انجان ہستی کو دیکھنے کی کوشش کی مگر شراب کے نشے میں چور میری آنکھیں بار بار جھپک جاتیں میں جلدی سے نیچے آیا اور بھگتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں بابو راؤ کھڑا تھا میں نے زمین کی طرف دیکھا وہ انجان ہستی فرا ہو چکی تھی میں بابو راؤ کے پاس گیا اور اسے گریبان سے پکڑ لیا اسے دو کئے رسید کئے اور پوچھا۔



”بتا یہاں کون تھا۔ بتا دے۔“  
 ”میں نہیں بتاؤں گا۔“ بابوراؤ نے جواب دیا۔  
 میں غصے سے بے قابو ہو گیا میں نے باؤراؤ کو مارنا شروع کر دیا اور جب میں تھک گیا تو میں نے اس کو دوبارہ گریبان سے پکڑ لیا اور ہانپتے ہوئے کہا۔  
 ”بتا دے ورنہ میں تجھے جیل لے جاؤں گا پھر جب تجھ پر تھوڑا ڈگری استعمال ہوگی پھر تو تو کیا تیرے فرشتے بھی بتائیں گے۔ تیری بہتری اسی میں ہے کہ تو بتا دے کہ تو کیا شیطانی کھیل کھیل رہا تھا یہاں کون تھا۔“

بابوراؤ نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں دو فٹ دور جا گرا اور پیچھے پڑا ہوا گلا میرے سر پر چالگا اور میرے سر سے خون نکلنے لگا۔

بابوراؤ چلایا۔ ”تو تو کیا اگر پورا بھارت بھی جا بے زور لگالے تو وہ شوہا دیوی کا بال بھی بھیکا نہیں کر سکتے وہ اماؤس کی آخری رات کو قیامت کو وجود میں لائے گی اماؤس کی آخری تاریخ کے بعد قیامت آئے گی قیامت جس کا پہلا نشانہ بہہ ماہی اور یہاں کے رہنے والے ہوں گے پھر وہ بھارت اور آخر میں ساری دنیا کو فنا کر دے گی۔ تو مجھے جیل لے جانے کا وہاں تھوڑا ڈگری کا استعمال کرے گا تو تو کیا کرے گا زیادہ سے زیادہ مار دے گا نا مجھے تو میں ابھی مر جاتا ہوں کیونکہ ویسے بھی میرا کام ختم ہو چکا ہے پھر تم پوچھتے رہنا میری لاش سے۔“

یہ کہتے ہی بابوراؤ نے اپنے آستین میں سے خنجر نکالا اور چنچنے ہوئے کہا۔ ”جے مہا کالی میری بلیدان کو سوئی کار کرنا میں تیرے لیے اور تیری پجاریں شو بھا کے لئے ملی دے رہا ہوں میں تیرے پاس آ رہا ہوں جے مہا کالی۔“ یہ کہتے ہوئے بابوراؤ نے خنجر اپنے سینے میں گھونپ لیا خون کا فوارہ اس کے سینے میں سے نکلنے لگا میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا اس سے زیادہ نہیں کیونکہ میرے سر سے خون بہت بہہ چکا تھا میں نے ایک کراولی اور بے ہوش ہو گیا۔

میری آنکھیں کھلی تو میں نے خود کو اسپتال میں پایا میرے دائیں طرف ڈاکٹر بھائیہ ڈرپ میں کچھ

”رشی کافی دیر خاموش رہا اور پھر وہ بولا۔ ”سر آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے تمہارے میں کام بہت بڑھ گیا تھا کام ختم کرتے ہوئے مجھے دیر ہو جاتی ہے میں رات بارہ ایک بجے تک گھر کی طرف روانہ ہوتا ہوں۔“

کل رات کام کچھ زیادہ تھا میں کافی دیر کے بعد گھر جانے کے لئے روانہ ہوا میں نے دیکھا کہ میرے پچازاد درم کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا میرا ہاتھ لٹکا میں سائیکل سے اتر کر گھر کے اندر گیا۔ میں نے دیکھا کہ درم اپنے بیڈروم میں مرا پڑا ہے اور اس کی پتی پر موصوفی ہوئی ہے اس طرح کہ جیسے وہ بے ہوش ہو میں گھبرا گیا اور جلدی سے باہر آ گیا مجھے دھکا کہ کہیں لوگ مجھے نہ دیکھ لیں کیونکہ میرے چچا کے ساتھ ہماری لڑائی ہے میں بھی سائیکل پر سوار ہو رہا تھا کہ مجھے خون کی ایک لکیر سامنے کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی میں نے سوچا کہ مجھے دیکھنا چاہئے کہ یہ لکیر کہاں تک جاتی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح قاتل کا کوئی سراغ مل جائے میں احتیاط کے ساتھ اس خون کی لکیر کی پیروی میں جنگل میں کافی دور ایک بہت بڑے قلعہ نما کمرے کے سامنے جا پہنچا قلعہ نما کمرے کے سامنے ایک بڑا فولادی کالے رنگ کا دروازہ تھا میں چونک کر ایسا تھا اس لیے میں نے ایکشن نہیں لیا میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے وہ قاتل اسی کمرے میں رہتا ہو اور میں صبح کو پوری دوسرے کے ساتھ ایکشن لوں گا میں جونہی واپسی کے لئے مڑا مجھے حیرت کا شدید جھکا لگا میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ لکیر جس کی پیروی میں یہاں تک آیا تھا اس کا کوئی نام و نشان نہ تھا میں نے جنگ کر زمین پر غور سے دیکھا مگر مجھے کچھ نہ دکھائی دیا میں گھر واپس آیا میں ساری رات سوئیں سکا مجھے پتہ چلا کہ آپ ہوش میں آچکے ہیں تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کو بتا دوں کیونکہ یہ بات ایسی ہے کہ میرا کوئی دوش اس بھی نہیں کرے گا۔ رشی نے ساری بات تفصیل سے بتادی اور خاموش ہو گیا میں نے ساری باتیں سننے کے بعد رشی سے پوچھا۔ ”رشی آج اماؤس کی قتل رات ہے۔“ رشی حیرانگی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔

”کیوں سر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ رشی نے پوچھا۔ ”تم بتاؤ تو سہی۔ اماؤس کی آخری رات کب ہوگی۔“ میں نے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

”سر اماؤس کی آخری رات کل ہوگی۔ مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“ رشی نے پوچھا تو جواب میں میں نے بابوراؤ کی بھی ہوئی ساری باتیں بتادیں جن کو سننے کے بعد رشی اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا اور کہنے لگا۔

”یعنی یہ ساری کارستانی شو بھا کی ہے۔“  
 ”شو بھا کون ہے۔“ میں نے حیران ہو کر رشی سے پوچھا۔ رشی نے مجھے بتایا کہ شو بھا جندال کی پتی تھی اور جندال شیطان کا پجاری جندال لوگوں کو آپس میں بھڑکایا کرتا تھا لوگوں کو جب اس کی اصلیت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس کو گاؤں سے نکال دیا اور اس کی پتی کو بھی نکال دیا تھا۔ پھر ایک دن جندال نے شیطان کے کہنے پر بھگوان کی مورتی کو مندر میں جا کر توڑ دیا تھا لوگوں نے غصے میں آکر جندال کو جلا دیا اور اس کی پتی کو قصبے سے نکال دیا تھا اور اب شو بھا انتقام لینے کے لئے واپس آ گئی ہے۔ سر آپ جلدی سے کچھ کریں کیونکہ ہماری باتوں کا اعلیٰ حکام تو بالکل یقین نہیں کرے گی کیونکہ لوگ چاند پر بھینچ چکے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور آخری سانس تک رہوں گا۔ پلیز آپ بہہ مانی کو اس عذاب سے نجات دلا دیں۔“

رات کو میں اور رشی ہم دونوں جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔ رشی مجھے اس جگہ تک لے گیا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ وہ واقعی ایک قلعہ نما کمرہ تھا کہ جس میں داخل ہونے کے لئے ایک فولادی کالے رنگ کا دروازہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے کے ایک طرف ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے ایک ملی آسانی سے گزر سکتی تھی میں ارد گرد سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھل گیا اور روشنی باہر نکلنے لگی میں اور رشی ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ چلو اندر چلتے ہیں۔ ہم دونوں جیسے ہی اندر گئے لائٹ ایک دم بند ہوئی اور دروازہ بند ہونے کی زور سے آواز



سنائی دی۔ ہم دونوں نے لاشعوری طور پر پیچھے کی طرف دیکھا۔ تو یکدم کمرہ روشنی سے نہا گیا۔ اچانک روشنی آنے کی وجہ سے ہم دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں اور جب دیکھتے دیکھتے قابل ہوئے تو ہمارے سامنے ایک انتہائی خوبصورت عورت کالے رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوئے کھڑی تھی وہ عورت کالے لباس پہن انتہائی خوبصورت لگ رہی تھی اس کے گلے میں کالے رنگ کا لاکٹ تھا جو کہ سنہری رنگ کی زنجیر میں تھا۔

”آؤ..... آگے آؤنا..... رک کیوں گے۔“ اس عورت نے ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے انتہائی زہر خند لہجے میں کہا۔ میں اور رش آگے بڑھے میں نے کمرے کا جائزہ لیا کمرہ بہت وسیع تھا اور روزمرہ کی آرائش سے مکمل بھرا ہوا تھا ایک طرف شیطان کا بہت ہی بھیانک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ عورت بولی۔ ”تم دونوں میرا منت کرنے آئے ہو۔ رش تم تو جانتے ہو میں شیطان کی پجاری ہوں یہ جانتے ہوئے بھی تم اس نابکار کو یہاں لے آئے اور خود بھی“ اس نے رش سے کہا۔

”اور تم انکسپرتم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ریوالور کی گولیوں کا نشانہ بن کر ختم ہو جاؤں گی نہیں کبھی نہیں۔ میں نہیں مر سکتی میں امر ہوں میں چنڈال ہوں میں اماؤں کی آخری رات کے بعد امر ہو جاؤں گی۔ میں نہیں مر سکتی شوہم نے خوفناک انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”سن اے چنڈال سن، یہ تیرا منت بہت برا ہوگا تو نہ کہ میں جائے گی۔“ رش نے بگڑے ہوئے انداز میں کہا میں جو باگلوں کی طرح ان دونوں کی گفت و شنید سن رہا تھا اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنی دونوں آنکھیں شوہما کے سینے پر جمادیں میرے اس اچانک حملے کا شاید شوہما کو خیال بھی نہ تھا اس لئے وہ دور جاگری وہ جیسے ہی گری اس کا لباس اوپر اٹھ گیا اور اس کا عریاں پیٹ صاف دکھائی دینے لگا۔ میری نظر اس کے پیٹ پر پڑی تو میں چونک اٹھا کیونکہ شوہما کا پیٹ پھولا ہوا تھا گویا شوہما امید سے تھی۔

”ذلیل..... کتے..... کینے..... میں ابھی تم

دونوں کو سردناش کردوں گی۔“ یہ کہتے ہی شوہما نے اپنے گلے میں بڑے کالے لاکٹ کو ہاتھ میں لے لیا اور زور زور سے منتر پڑھنے لگی لاکٹ میں سے بجلیاں نکلیں اور میرے اور رش کے جسم سے ٹکرانے لگیں ہم دونوں زور سے چلانے لگے۔ پھر ایسے لگا کہ ابھی میری آتما میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دے گی اور میری سانسیں رک جائیں گی اور رش کی کندہ پن کی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ پھر اچانک میرا سانس رکنے لگا اور پھر میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

آہستہ آہستہ تاریکی میرے ذہن سے چھٹنے لگی اور میرا شعور جاگنے لگا میں نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ میں نے دیکھا کہ میں گھاس پھوس کے بستر پر لیٹا ہوا ہوں میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا یہ کوئی بہت بڑا جھوپڑا تھا رش اور گرد و کھنیں نہ دکھائی دیا دائیں طرف ایٹور بھگوان کی بہت بڑی مورتی رکھی تھی اور ایک بوڑھا اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ ہاتھ میرا سر اور جسم دیکھنے لگا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں میں رش کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے کیا وہ مر گیا ہے۔ فی الحال تو مجھے اپنا بھی پتہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں مگر انشور کی مورتی دیکھنے کے بعد اطمینان ہو گیا کہ میں شیطان کے چنگل سے نکل آیا ہوں میں کافی دیر سوچتا رہا اور چرتا رہا کب مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔

”عبداللہ..... عبداللہ..... اٹھو عبداللہ جاگو یہ وقت سونے کا نہیں عبداللہ۔“ بالک جلدی اٹھو۔ جونہی میں نے یہ آواز سنی میں نے اپنی آنکھیں جھٹکے سے کھول دیں میں نے دیکھا کہ سامنے وہی بوڑھا آ دی بیٹھا ہے اور اس کے ہاتھ میں دودھ کا پیالہ ہے۔

”آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ وہ بوڑھا ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔ ”یہ میں بعد میں بتاؤں گا پہلے یہ دودھ پی لو۔“ میں نے دودھ کا پیالہ اس کے ہاتھ سے لیا اور تین گھنٹوں میں ختم کر لیا۔ دودھ پینے کے بعد میرے جسم میں توانائی کی لہر دوڑنے لگی۔ ”بالک میں تمہارے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔“

میں بوڑھے نے کہا۔ ”مگر میں تو آپ کے متعلق کچھ نہیں جانتا میں تو آپ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں تم مجھے نہیں جانتے۔ تم مجھے سنو ش بابا کہہ کر لاسکتی ہو۔ تم پر بھگوان نے کراپا کی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”مگر میں یہاں کیسے آیا میں تو شوہما کے سامنے تھا پھر یہاں کیسے آ گیا اور آپ مجھے کس طرح جانتی ہیں۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا تو سنو ش بابا نے کہا۔ ”بالک زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے مجھے تمہارے اور تمہارے والد کے متعلق پوری جانکاری ہے تم کو اور تمہارے والد کو شوہما نے مردہ سمجھ کر باہر پھینک دیا تھا مجھے بھگوان نے آگیا دی کہ میں تم کو بچاؤں وہ اس لیے کہ شوہما چنڈالک بن چکی ہے اور اگر آج رات تک اس کا انت نہ کیا گیا تھا وہ قیامت کو جو جس لے آئے گی اور تم کو اس لئے بچایا گیا ہے کہ شوہما کا انت تمہارے ہاتھوں لکھا ہوا ہے۔ تمہارے والد کو میں نے اس کے گھر پہنچا دیا ہے۔ تم اس کے متعلق بے فکر رہو۔“

میں نے جب یہ بات سنی تو میں اور زیادہ حیران رہ گیا۔ میں نے کہا ”میں شوہما کو کس طرح مار سکتا ہوں وہ تو بہت شگفتی شالی ہے۔ اگر آپ ٹھیک سے پڑھتے تو وہ تو مجھے بھی مار چکی ہوتی۔“

سنو ش بابا نے کہا۔ ”بالک تم گھبراؤ نہیں تم اس میں اس چنڈالک کے خاتمے کے بارے میں نہیں جانتے ہو میں تم کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔ دراصل راما سن میں لکھا ہے کہ شوہما کا خاتمہ آج اماؤں کی رات کو ضرور ہونا چاہیے اگر آج رات نہ مری تو اتھ ہو جائے گا۔ کیونکہ شوہما پھر کبھی نہیں مری گی۔ اور اگر شوہما نہ مری تو ایسی قیامت مچے گی کہ خود شیطان بھی نہ اٹھائے گا۔“

”کیوں آج اماؤں کی آخری رات کو کیا ہوگا۔“

میں نے پوچھا۔ ”عبداللہ۔ خاموشی سے ساری بات سنو بعد میں بولنا۔ اب اگر تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں بتا دی

دوں۔ آج اماؤں کی آخری رات کو شوہما ایک بچے کو جنم دے گی وہ بچہ شیطانیت کا منہ بولتا نمونہ ہوگا۔ اس بچے کا سر تو ایک ہوگا مگر اس کی آنکھیں تین ہوں گی۔ چہ باجھ چار پاؤں ہوں گے اس کی ناک بائیں کی سونڈ کی طرح ہوگی چنڈالک شوہما کے بچے کے منہ پر ہلا کی خباثت ہوگی وہ دُشت بچہ بہت منحوس ہوگا۔ وہ پیدا ہوتے ہی نحوست پھیلا دے گا وہ منج تک جوان ہو چکا ہوگا اور پھر وہ پورے بھارت کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا ناش کر دے گا اس لیے شوہما آج رات ہر حال میں مارنا ہوگا کیونکہ اگر وہ بچہ پیدا ہو گیا تو وہ کبھی نہیں مر سکے گا۔ اس کو بھی موت نہیں آئے گی کیونکہ اس بچے کی چنڈال ماں نے ایک تو شیطان کی خاص پوچا کی ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے آنتیں ایسے جوان مردوں کا خون مرغوں کے کچے گوشت کے ساتھ کھایا ہے جو باپ بننے والے تھے۔ اس وجہ سے وہ بچہ مر نہیں سکتا ہے۔“

”کیا؟ مرغوں کے گوشت کے ساتھ کھایا ہے؟“ میں باوجود کوشش کے آخر کار بول ہی پڑا۔

”ہاں مرغوں کے گوشت کے ساتھ کیونکہ شوہما ایک عورت ہے اور تم تو جانتے ہو کہ عورتیں کتنی بزدل ہوتی ہیں وہ چنڈالک اپنے اپنی کی تھمیا کا بدلہ لینے کے لئے بنی ہے۔ شیطان نے اس سے کہا کہ وہ ایسے بچے کو جنم دے جو کہ سب کا سردناش کر سکے اور ایسے بچے کو جنم دینے کے لئے اس کو تین نو جوان مردوں کا خون پینا ہوگا اگر وہ ایسا نہ کرے گی تو وہ کبھی بھی شگفتی شالی بچے کو جنم نہ دے سکے گی۔“

شوہما نے کہا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تو شیطان نے اپنی دیکاری کو استعمال کرتے ہوئے ایسا راستہ اختیار کیا کہ انسانی شکل حیران رہ جائے۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ اس نے بابور او کو بہکا لیا اور بابور او کا رہنا شیطان نے منحوس شگفتی کی شعاعیں بابور او کی آنکھوں میں ذخیرہ کر دوائیں۔ بابور او بازار سے روزانہ ایک مرغ خرید لاتا اس کو دانڈا لے کر بھانے کی بجائے کتے بائلی کا خون پلاتا رات کو وہ شیطان کی دی ہوئی شگفتی شعاعیں مرے کی آنکھوں



میں منتقل کر دیتا وہ مرغا ایسے شخص کے گھر جاتا کہ جس کی جتنی امید سے ہو مرغا اس مورکھ کا خون پی لیتا اس کے بعد وہ مرغا شوبھا کے پاس جاتا اور کمرے میں داخل ہونے کے لئے دروازے سے نہیں بلکہ دروازے کے ساتھ چھوٹے سے سوراخ کے ذریعے کمرے میں جاتا وہاں پر شوبھا شیطان کی پوچا پاٹ سے فارغ ہو چکی ہوتی۔ وہ مرغے کو کچا کھا جاتی ہے اب تک وہ آتیس مرتبہ کھا چکی ہے۔ آج وہ آخری مرغا کھانے کے بعد شیطانی بچے کو جنم دے گی اگر وہ بچہ پیدا ہو گیا تو اس کا مرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ مجھے عبدالحجید ناممکن ہے۔“

ساری تفصیل سننے کے بعد میرے ذہن میں آنندھیاں چلنے لگیں وہ قاتل جس کی تلاش میں پورا بھارت ناکام ہے پولیس والے اسے پاگل کہتے کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں جو آتیس جوان مردوں کو بغیر کوئی ثبوت کے چھوڑے ختم کر گیا وہ قاتل ایک مرغا ہے۔ ایک مرغا۔

میں نے خون آشام بھیڑیوں کے متعلق سنا ہے۔ خون آشام درندوں کے بارے میں پڑھا ہے یہاں تک کہ خون آشام بلیوں کے بارے میں جانتا ہوں مگر خون آشام مرغے۔ مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ قاتل جس نے میری راتوں کی نیندیں اچاٹ کر رکھی ہیں وہ مرغا ہے اگر تمام حالات میرے سامنے نہ ہوتے تو میں کبھی مرگ بھی یقین نہ کرتا۔ میرا ذہن مکمل طور پر ماؤف ہو چکا تھا کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے ناممکن۔ ناممکن۔

عبدالحجید ہماری پاس زیادہ سے نہیں ہیں جلدی کرو وہ چنڈا لکھ شیطان کی پوچا کر رہی ہوگی۔ مرغا کھانے کے بعد وہ بچے کو جنم دینا شروع کر دے گی۔“ سنوٹی بابا نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اس کا خاتمہ کیسے کروں گا۔“ میں نے پوچھا۔

سنوٹی بابا نے کہا۔ ”وہ چنڈا لکھ ایک عورت ہے

جادو کرنی نہیں ہے اس کی ساری ہنستی اس کے گلے میں بڑے کالے لاکٹ میں ہے جو تم دیکھ چکے ہو۔ شیطان نے وہ لاکٹ اسے اپنی رکھشا کے لئے دیا ہے تم سب سے پہلے پرساد لے جا کر اس کالے دروازے پر ڈال دینا دروازہ خود کھل جائے گا۔ پھر تم اس خنجر کے ذریعے اپنی کلائی پر دم کر لیتا جیسے ہی تمہاری کلائی سے خون رسنے لگے تم اپنے خون کی جگہ پر لیں اس لاکٹ پر ڈال دینا تو لاکٹ ٹوٹ کر بے اثر ہو جائے گا لاکٹ کے ٹوٹنے کے بعد تم الاؤ میں سے جو وہاں مل رہا ہوگا اس میں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لیں اور شیطان کے سامنے جھوک دینا شیطان کے سامنے آگ کی دیوار بن جائے گی اور وہ شوبھا کی کوئی مدد نہ کر سکے گا۔ پھر تم اس خنجر کی مدد سے شوبھا کا خاتمہ کر دینا۔ اب تم جلدی سے جاؤ کیونکہ میرے بہت کم ہے۔“ یہ کہہ کر سنوٹی بابا نے مجھے پرساد اور خنجر دیا۔ میں جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ سنوٹی بابا نے مجھے آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے پیروں کے نیچے زمین نہ ہو۔ پھر مجھے سنوٹی بابا کی آواز آئی۔ ”عبدالحجید آنکھیں کھول دو“ میں نے آنکھیں کھول دیں میں نے دیکھا کہ میں کالے دروازے کے سامنے کھڑا ہوں میں نے سنوٹی بابا کا دیا ہوا پرساد دروازے پر پھینک دیا تو ایک دھماکہ ہوا اور دھواں چھا گیا۔ جب دھواں چھٹا تو میں نے دیکھا کہ سامنے سے دروازہ غائب تھا اماؤں کی رات کافی گزر چکی تھی۔ اور اندھیرا بھی بہت گہرا تھا۔ جب دروازہ غائب ہو گیا تو اندر سے روشنی باہر آنے لگی میں جلدی سے اندر داخل ہوا مگر اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنی کلائی پر دم کر لیا تھا میں جو نبی اندر داخل ہوا میں نے ایسا منظر دیکھا کہ جس کو دیکھ کر مجھے اپنی آنکھیں بے اختیار بند کرنی پڑیں۔

میں نے دیکھا کہ شوبھا زمین پر عریاں حالت میں پڑی تپ رہی ہے اس کے ساتھ پڑی ٹرے میں مرغے کی کھال پڑی تھی یعنی کہ وہ آخری مرغا کھا چکی

☆

ہے اور اب بچے کو جنم دے رہی ہے یہ خیال آتے ہی میں بھاگتا ہوا آگے گیا اور اپنی کلائی سے رستے ہوئے طون کی پھینک شوبھا کے لاکٹ پر گرا دیں۔ خون کی پوندیں پڑنے ہی لاکٹ ٹوٹ گیا شوبھا زور سے چلائی اور پھر وہ شیطان کے جسمے کو امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی میں نے بجلی کی سی تیزی سے ساتھ بڑے الاؤ میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور شیطان کے جسمے کے سامنے لہرائی شیطان کی آنکھیں زندہ ہو چکی تھیں اور اس میں سے سرخ رنگ کی شعاعیں نکلیں مگر اس سے پہلے کہ وہ شعاعیں مجھ تک پہنچیں آگ کی دیوار قائم ہو چکی تھی۔

شوبھا نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تکلیف کی وجہ سے وہ اٹھ نہ سکی۔ وہ زور زور سے ہاتھ پاؤں مارنے لگی مین نے دیکھا کہ بچے کی ٹانگیں باہر آ چکی تھیں وہ ٹانگیں کالی سی تھیں وہ سیاہ ٹانگیں خود زور زور سے ہلنے لگیں اس طرح کہ جیسے وہ بچہ خود باہر آ رہا ہو۔ شوبھا نے ہاتھ پاؤں مارنا بند کر دیا تھے وہ میری طرف دیکھ کر سسکرائی مگر اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات عیاں تھے وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

”تھانے وار تم نے اچھا نہیں کیا مگر مجھے کوئی غم نہیں کیونکہ اب میرے بچے کو اس دنیا میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا میں نہیں بچوں کی عمر میرا میرا انتقام اور اپنے پتا کا انتقام ضرور لے گا۔ وہ اس بابا دیا کو ہی ختم کر دے گا کہ جس بابا نے دنیا کے رہنے والوں نے اس کے ماتا پتا پر ظلم کیا وہ ہمارے ساتھ ہونے والے اپنائے کا ضرور بدلہ لے گا۔“

انسان کہنے کے بعد شوبھا نے دائیں بائیں سر مارنا شروع کر دیا اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ بچہ آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

☆

خود انتظار کر رہا تھا۔

”نہیں..... نہیں.....“ ہرگز نہیں میں اس بچے کو اس دنیا میں ہرگز جنم نہیں لینے دوں گا۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔“ میں زور سے چلائی اور پھر میں نے خنجر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھاما اور بچے کے پیٹ پر جو کہ باہر آ چکا تھا گھونپ دیا جیسے ہی میں نے خنجر بچے کے پیٹ میں گھونپا، شوبھا نے زور سے چیخ ماری بچے کے پیٹ میں سے سیال چیز نکلنے لگی بچہ زور سے ترپنے لگا میں نے جلدی سے خنجر نکالا اور پھر گھوم کر شوبھا کے سر کے قریب پہنچ کر رک گیا شوبھا میرا منہ بٹکنے لگی اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے گڑ چکا تھا میں نے خنجر کا بھر پور وار اس کی گردن پر کر دیا اور شوبھا کا سر ایک کمزور کھوڑی کی طرح کٹ گیا۔ پھر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ شوبھا کا بچہ جو جنم لے رہا تھا وہ بھی ساکت ہو گیا تھا میرا سانس بری طرح سے پھولا ہوا تھا قدرے توقف کے بعد میں نے شوبھا کی عریاں ٹانگ کو پکڑا اور شوبھا کے جسم کو گھسیٹا ہوا الاؤ کے قریب لے گیا اور شوبھا کے جسمے کو آگ میں ڈال دیا۔ آگ اور تیز ہو گئی اور شوبھا کا جسم تیزی سے جلنے لگا۔ پورے ماحول میں انتہائی بری بدبو پھیل چکی تھی جس کی وجہ سے میرا دم گھٹنے لگا پھر پورا کمرہ لرزہ اور ٹوٹنے لگا میں نے جلدی سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ بروقت میں کمرے سے باہر آ گیا کیونکہ جیسے ہی میں باہر آ رہا تھا کمرے کی پوری چھت گر گئی تھی اور وہاں آگ لگ گئی میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پھر قصبے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سنوٹی بابا نے کہا تھا کہ شوبھا کے خاتمے کے بعد میں بہہ مانی جاؤں کیونکہ میرا اب اور کوئی کام نہ تھا کہ جس کے لئے میں سنوٹی بابا کے پاس جاتا۔

☆

☆



# جل پری

ساحل و عابجاری

قسط نمبر 5

اس کا بے جان ہاتھ سختی سے جکڑ لیا ہوا میں گویا ہزاروں پاگل بدرو میں شامل ہو گئی تھیں جو بلا کی اٹھا بیچ چائے جاتی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا گویا زلزلہ آ رہا ہو۔

**ساحل** پتھری ریت طلوع ہوتے سورج کی کرنوں میں چمک رہی تھی۔ اس ریت پہ ایک کیکڑا چل رہا تھا۔ پرسکون سمندر کے گہرے پانی سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ جس کی سرخی سمندر کی سطح پر پھیلی تھی۔ سورج دھیرے دھیرے اوپر کو اٹھتا گیا۔ اس کی سرخی ماند پڑ کر اب روپہلی زردی میں بدل گئی تھی۔ سطح سمندر پر ناچتی کرنوں کا رقص جاری تھا۔ ان کے چمکیلے وجود، آنکھیں خیرہ کئے دیتے تھے۔

”آ جاؤ کھانا کھاؤ۔“ رومان اسے بلانے آیا تھا۔ اس نے نگاہ سمندر کی سطح سے ہٹا کر اسے دیکھا اور اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ جیمز اور ڈیزی بھی چھلیاں بھون رہے تھے۔ اس نے تھوڑی سی پھلی کھائی اور اٹھ گئی۔ گھٹے درختوں کے نیچے سناٹا آنکھیں موندے سورہا تھا۔ عجیب رک رکی سی زندگی ہو گئی تھی۔ یہاں کھانے کے بعد لگتا کہ ان کے پاس ”سانس“ لینے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہا۔ سارا سارا دن جزیرے پر کھومتے رہنا یا پھر تھک کر ایک ہی جگہ بیٹھ رہنا، اس دوران کوئی ایک جہاز بھی وہاں سے نہیں گزر رہا تھا۔ اس لئے ان کی یہ امید بھی دم توڑ گئی تھی کہ کوئی مسافر جہاز ان کی مدد کرے گا۔

یہ جزیرہ بڑی سفر سے قطعاً ہٹ کر ہے۔ ورنہ اب تک کوئی نہ کوئی تو کھائی دیتا ہی۔“ جیمز کا لہجہ مایوسانہ تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کوئی ہماری مدد نہیں کرے

گا؟ ہم یہیں سڑ کر مر جائیں گے۔“ ڈیزی نے سختی سے سر جھٹکا۔

”کیسے کوئی مدد نہیں کرے گا؟ ہماری مدد کرنے والا موجود ہے۔ وہ.....“ رومان نے انگلی سے اوپر اشارہ کیا۔

”وہ ہمارے حال سے بخیر واقف ہے۔ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔“ اس کی بات پہ ان دونوں نے سر جھٹک دیا۔

”اگر اس نے ہماری مدد کرنا ہوئی تو ہم یہاں پھنستے ہی کیوں؟“ جیمز نے بھنویں سکیریں۔ درختوں سے چھن کر آتی سورج کی کرنیں براہ راست اس کے سر اور کندھوں پر پتھری تھیں۔ ایسی ہی کرنیں گھاس پہ بھی جا بجا پھنی تھیں۔

”ہو سکتا ہے اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہو۔“ رومان کو جیمز کا لہجہ پسند نہ آیا۔ وہ جواباً سر جھٹک گیا۔ تو رومان نے اپنی بات مکمل کی۔ ”اس کے ہر کام میں حکمت اور دانائی ہے۔“ وہ کہہ کر اٹھ گیا۔ جیمز نے یوں پرستہزائے مسکراہٹ سجائے ڈیزی کو دیکھا۔ وہ کھویا کھویا سا تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈوبتے سورج کی نارنجی، شعلہ بدن کرنوں کا رقص سمندر کے پاس پر بڑا ہیجان انگیز نظر آ رہا تھا۔ ان کا رقص اب جنوں کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ سارا سمندر ان



کے ہمراہ رقصاں تھا اور اس وقت ان ہی کے دنگ میں رنگا ہوا تھا۔ پانی بھی عجیب ہے۔ اپنا کوئی رنگ نہیں رکھتا۔ جس بھی شے میں ڈال دے، اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ اگر زندگی بھی یہی انداز اختیار کر لے تو کیا ہی اچھا ہو..... بلا غرکروں نے ناچتے ناچتے دم توڑ دیا۔ سورج سمندر کے گہرے پانی میں ڈوب گیا۔ افق پہ غالباً سورج کے لہو کی سرخی چھائی ہوئی تھی اور سطح سمندر پر کڑوں کے لاشے تیرتے پھرتے تھے۔ پورا سمندر لہو رنگ ہو رہا تھا۔ سارہ بے اختیار چوکی۔ وہ اس وقت پہاڑی کے دوسری طرف پتھری زمین پہ موجود تھی۔ ذرا آگے چند پودے تھے اور اس سے پرے ریتیلہ ساحل..... اس کے چوکے کی وجہ اس کے قدموں تلے پٹی زمین تھی۔ تو کیا زلزلہ آ رہا تھا؟ وہ بے ساختہ لڑکھرائی۔ زلزلہ چند لمحے جاری رہا، پھر ختم ہو گیا۔ اس کی نظر اپنے پیروں کے پاس پڑی اور وہ چونک گئی۔ وہاں گہرا شکاف تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کے پاس ڈیزی کی آواز ابھری۔  
”پتہ نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ اس شکاف سے سرخی دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ گاڑھا۔ کثیف دھواں..... پھر اس دھوئیں نے ایک وجود اختیار کر لیا..... دھوئیں پرچہ وہ وجود انہیں تحیر کر گیا..... میں صدیوں سے انتظار کر رہا ہوں۔“ اس سے ابھرنے والی آواز کسی مرد کی تھی۔

”کیا مطلب؟“ ڈیزی کی آواز حیرت کے زیر اثر تھی۔ ”مطلب..... کئی صدیوں سے ہم سب، اس بات کا انتظار کر رہے ہیں۔“  
”میں ابھی بھی نہیں سمجھا۔“ ڈیزی کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت تھی۔  
”میرے ساتھ آؤ۔ اور تم بھی..... کیونکہ ہمیں مذاب سے نجات دہی دلائی ہو۔“ اس کی عجیب و غریب بات نے سارہ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ”آ نکھیں بند کرو۔“ دھوئیں نے کہا تھا۔ ان دونوں نے

آ نکھیں بند کر لیں۔ خوف نام کی کوئی شے ان کے قریب نہ پہنچ سکی۔ دھواں ان کے گرد پکڑا یا۔ اگلے لمحے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ پہاڑی پر کھڑے جمز نے سر ہٹا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگیں۔  
☆.....☆.....☆  
اس کے حواس نے ہوش کی وادی میں قدم دھرا تو پہلا احساس درد کا تھا۔ سر پہ کسی نے گویا ساتوں آسمان رکھ چھوڑے تھے۔ سر اس قدر بوہل ہو رہا تھا کہ آنکھیں کھولنا بھی ماؤنٹ ایورسٹ کو ایک چھوٹا مارکر اڑا دینے کے مترادف تھا۔ ”خامران.....“ مینڈو نے تاب آواز اس کی سماعتوں میں اتری تھی۔ مگر اس نے اس کا ذہن تھارہ تارکیوں میں ڈوب گیا۔ نجانے بیہوشی کا یہ دورانیہ کتنا طویل تھا؟ بہر حال پھر احساس کا پہلا قدم چھوڑی اور وہ بڑبڑا تھا۔ اور دروے طرح تڑپ اٹھا تھا۔ یا پھر شاید وہ احساس تھا جو تڑپا تھا۔ لیکن اس سب سے جو بھی تڑپا تھا، اس نے ان کو بھی تڑپا دیا تھا۔  
”اب تم کیا سوچ کر رہے ہو؟“ سپیرا اس کی پیشانی پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھ کر رہا تھا۔  
”ٹھیک۔“ وہ ہنسی بول رہا تھا۔ اس کے وجود میں قناعت اور اذیت گھلے مل رہے تھے۔ ”لو.....“ مینڈو نے مٹی کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ پیالے میں بڑی مائل دودھیا عرق تھا۔ پہلا گھونٹ چلتی، معدے اور آنتوں کو گندھک کے تیزاب کی مانند جیرتا چلا گیا۔

شروع کیا۔ ”سفید ناگ کی تنبیہ کے باوجود ایک خطرناک سانپ نے تمہیں ڈس لیا تھا۔ دراصل تمہارے ہاتھ میں یہ جو انگلی ہے نا! اس میں کوئی طاقت پوشیدہ ہے۔ جب یہ ناگ کے جسم سے مس ہوتی تھی تو ناگ کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ آخری بار تو قریب تھا کہ ناگ مر جاتا، اور ایسا ہی ہونا تھا اگر وہ سانپ تمہیں ڈس نہ لیتا۔“ ثمران کی غیر ارادی نگاہ نے اپنے ہاتھ میں موجود ماہ شب کی دی ہوئی انگلی کو چھوا۔ جس میں نیلگوں مائل بنز چھوٹا سا پتھر مسکرا رہا تھا۔ ”ناگ نے اس سانپ کے حکم عدولی کے طور پر وطن بدر کر دیا ہے اور چونکہ تم اصولی طور پر مقابلہ جیت چکے تھے۔ اس لئے ناگ نے وہ موتی تمہیں دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ سپیرا بلا ٹکان بول رہا تھا۔ ثمران کی نگاہ کٹری بارے بیٹھے سفید ناگ پہ جا پھری۔ سفید ناگ اس کی جانب سر نہ لگا۔ اس کے پاس آ کر اس نے اپنا ”عقربیت“ سامنے کھولا۔ بو کا نواں بھبکا اس کی سانسوں سے مگر اب تو اس کا بی مٹلا گیا۔ ناگ نے ایک ہنکار کے ساتھ موتی بھر گھاس پہ اگلا، ایک نگاہ ثمران پہ ڈالی۔ وہ ایک ”مستطیل“ نگاہ تھی۔ پھر وہ پلٹا اور ریت گلتا ہوا غائب ہو گیا۔ ثمران کی سماعتوں میں سانپ کے مرنے سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ گونج رہی تھی۔ اس نے ایک ٹرانس کے عالم میں وہ سفید پتھر اٹھا لیا۔ پھر گرم تھا۔ مگر اسے ہاتھ میں لیتے ہی اسے اپنے اندر بے پناہ طاقت و قوت کا احساس ہوا۔ وہ فاختہ کے ایک

اندھے جتنا تھا۔ دودھیا پتھر سے دودھیا ہی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ مدھم..... باقار روشنی وہ خود کو بے حد ہلکا چمکا چھوٹ کر رہا تھا۔  
”چلیں۔“ وہ الجھ کر ہوا۔ ”یہ ایک بار پھر ذمہ لگالینا، بلکہ ایک کام کرو۔ یہ موتی ذمہ پہ لگاؤ۔“ سپیرا نے اسے ایک مرہم دینا چاہا مگر پھر اس کو موتی کی بابت ہدایت دی۔ ثمران نے اپنی دانتیں کلائی پہ، مٹی کے پاس دیکھا۔ آج بھر دائرے کی جگہ یہ مگر اذم تھا۔ آس پاس کی جگہ سرخ ہو رہی تھی۔ اس نے موتی

ذمہ پر دھر دیا۔ ایک ٹھنڈک سی ذمہ سے ہوتی ہوئی رگ و پے میں اتر گئی اور محض چند ہی لمحوں میں ذمہ حیرت انگیز طور پر بھر چکا تھا۔ اس نے موتی ہٹایا تو کبھی کے پاس نشان سا تھا۔ جیسے بہت پرانے ذمہ کا نشان رہ جایا کرتا ہے۔ ”تم لوگ آنکھیں بند کر کے جس جگہ کا تصور کرو گے، پہنچ جاؤ گے۔“ نوجوان سپیرا نے بتایا تھا۔ دونوں نے سپیرا کا شکر یہ ادا کیا اور گھل کر رخصت ہو گئے۔

☆.....☆.....☆  
وہ غار نما جگہ کافی وسیع اور ہوا دار تھی۔ ذرا بھی گھٹن کا یا جس کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ غار کی دودھیا دیواروں پہ دھوئیں کے مرغولے متحرک تھے۔ ان سب کی بے قراری سے ان کے اضطراب کا اندازہ ہوتا تھا۔ ”میرا نام زاروق ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار تھا۔“ انہیں لانے والے دھوئیں نے بتانا شروع کیا۔

”مختصر بتانا ہوں۔ میں اپنی طاقت کے ذمہ میں مبتلا تھا۔ میرے پاس بہت سی پراسرار خصلتیاں تھیں۔ اور مجھے لوگوں کو تنگ کر کے انہیں اذیت دے کر بہت خوشی ہوتی تھی، کون تھا، اس وقت جو میرے ہاتھوں سے محفوظ تھا۔ یہ سب لوگ میرے ساتھی تھے۔ میں نے ایک لڑکے کو اغوا کر لیا۔ دراصل وہ ایک مسلمان لڑکا تھا۔ عمر بارہ سال..... وہ اماؤس کی رات کو پیدا ہوا تھا۔ مجھے اس پہ ایک عمل کرنا تھا۔ وہ لڑکا اور اس میں مٹی ساری خصلتیاں بچھل جاتیں۔ یعنی وہ لڑکا میرے دس میں ہو جاتا۔ میرا ارادہ اس کے ذریعے بہت کچھ پانے کا تھا۔ وہ چاب کیا رہ دن کا تھا۔ لیکن..... پہلی ہی رات وہ کچھ ہوا جو میرے ذمہ دنگان میں بھی نہ تھا۔ میں نے بے ہوش بچے کو دائرے میں لٹا کر عمل شروع کیا ہی تھا کہ ایک بزرگ ظاہر ہوئے۔ وہ اس بچے کے دادا تھے۔ بچے کا باپ مر چکا تھا..... اسے باہر لگا لو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ اور میرے چاب میں خلل نہ ڈالو۔“ میں نے تنبیہ کی۔ ”خلل کے بچے! میں تجھے



گئے تھے، بایں ہاتھ کی اٹلی سے لکیریں بھیجیں پھر اس کے لکیر والے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ سج

اس کی وضع کچھ عجیب سی تھی۔ قدمے چھٹی، کھلے منہ  
خوفناک کہانیاں [5]

ہے..... صرف وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ سب!

میرے ساتھ ہی یہی تھا۔ میں بے اختیارانہ باہر نکل پڑا۔ باہر نکلتے ہی مجھے زور کا جھٹکا لگا۔ جیسے کسی نے



گئی۔ اس کا رخ سینڈ اور روشی کے گھر کی جانب تھا اور چال میں فاتحانہ لڑکھڑاہٹ.....

☆.....☆.....☆

وہ جس کے سائے میں بیٹھا رہا ہوں میں برسوں وہ شجر بھی نہ بنا میرا سائیاں اب کے زمین کا فاصلہ ہوتا تو سمیٹ بھی لیتے

سمندروں کو وہ لایا ہے درمیاں اب کے سمندر کے برہنہ حسن پر چھائے کبر کی چادر میں سورج کی نو مولود کریمیں اپنا راستہ بنانے کی سر توڑ کوششیں کر رہی تھی۔ تاحد نگاہ پھیلا سمندر کا تاریک دکھتا پانی ان کروں کو سینے سے لگا رہا تھا۔ اور دیر سے دیر سے ان کے رنگ میں رنگ کر سونے میں ڈھلنے لگا تھا۔ پر سکون پانی خاموش تھا۔ ساکت تھا۔ جیمز اور

رومان از حد حیرت سے سارہ اور ڈیزی کو دیکھ رہے تھے۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ ہمارا یہاں آنا..... یہ بھی خدا کی کوئی مصلحت ہے۔“ رومان نے جناتی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ سر جھکا کر رہ گئے۔ سارہ کی نظریں سمندر کی سطح پر بھٹک رہی تھیں۔ اس نے پھر ثمران کو رات خواب میں دیکھا تھا۔ اور اس نے اسے ٹھیک نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اسے خواب میں جب سے دیکھا تھا، تب سے بے حد پریشان تھی۔ لہجہ بھر بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ دل تھا کہ چل رہا تھا۔ لیکن..... کوئی راستہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ اس تک پہنچنے کا۔ راستے میں سمندر حائل تھا۔ سفاک سمندر..... جو کسی پر بھی ترس نہیں کھاتا.....

”چلو کچھ ناشتے کا کریں۔ بھوک سے چو ہے پیٹ میں کھرت کھیل رہے ہیں۔“ جیمز اٹھا تو رومان اور ڈیزی بھی اٹھ گئے۔ ”آ جاؤ سارہ۔“ رومان نے اسے ٹکرم سے پکارا تھا۔

”آپ جائیں۔ میں نہیں ہوں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں قطعی تھی۔ رومان سمجھ گیا کہ وہ اس وقت صرف تہائی کی خواہاں ہے۔ سو چپ چاپ پلٹ گیا۔ سارہ کی آنکھوں میں بھی سمندروں کا کھارا، لیکن پانی اتر آیا۔ ایک سمندر سامنے پھیلا تھا

☆.....☆.....☆

وہ درخت بہت بلند تھا۔ اس کی شاخیں ٹیڑھی میڑھی تھیں۔ اس کا تنا بکا سبز تھا اور سچے دودھیا سفید..... اس پہ انور کے طرز کے پھلوں کے کچھ لٹک رہے تھے۔ ان پھلوں کا رنگ گلابی مائل نیلا تھا اور وہ جسامت میں انگوروں سے کافی بڑے تھے۔ یعنی ایک درمیانے سائز کے آلو بخارے کے جتنے..... ان کا بیج محض گندم کے دانے جتنا تھا جو کہ کرسل کی طرح چمکتے پھل سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سینڈو نے ہاتھ بڑھا کر پھلوں کا ایک گچھا تو لیا۔

”یہ ہے آب حیات۔“ اس نے وہ پھل اس کی طرف بڑھائے۔ اس نے بلا توقف تمام لئے۔ اسی پل چاروں طرف سے سرسراہٹ ہوئیں ان کی جانب آنے لگیں۔

”بھاگ جاؤ یہاں سے۔“ رنگ تھیں روکنا چاہ رہا ہے۔ ”سینڈو اضطرابی انداز میں چلایا۔ وہ جو شکرانے کے نوافل پڑھنے جا رہا تھا، چونک اٹھا۔

”جاؤ۔“ سینڈو نے اسے دھکیلا۔ ”لیکن تم؟“ وہ تذبذب میں گھرا تھا۔ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ رنگ ضرور وعدے سے بھرے گا۔ جاؤ جلدی کرو، میں انہیں روکتا ہوں۔“

”نہیں۔ میں تمہیں مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

”نامران! سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے رنگا سے زیادہ سے زیادہ چندوں سزا ملے گی۔ لیکن تم کو زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ماہ شب ہمیشہ سوئی رہ جائے گی۔ ہاں۔“ میں ان سے فارغ ہو کر تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔ جاؤ اب۔“ اب کے اس نے ثمران کو دھکیلا تو وہ آگے بڑھ گیا۔

”تم ان سے نمٹ لو گے؟“ اس نے رک کر

تھیں وہ پانی چاہی تھی۔

”بالکل۔“ وہ مسکرایا۔ آندھی تیز ہو گئی تھی۔ تیز ہوا میں کوئی اورانی قوت اسے دھکے دے کر لڑکھڑانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے لیوں پہ وہ نام چلایا جس کے آگے ہر قوت بے بس ہو جاتی۔ جس نے اب تک ہر جگہ ہر مشکل میں اس کی مدد کی تھی۔ بلاشبہ وہ آگے بھی اس کی مدد کرنے والا تھا۔ اس کے دل میں چند ٹائٹل قتل ہو چکا تھا۔ وہ اللہ کے نام سے سہل ہماگ گیا تھا۔ اب وہ کسی بھی خوف و دہشت سے قلعی بے نیاز ہو کر چل رہا تھا۔ آب حیات کے پھلوں کے کچھ اس نے متاع حیات کی طرح سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کا روال روال اللہ کا شکر گزار تھا۔

☆.....☆.....☆

سورج کا رنگ سرخی مائل تھا..... غالباً اس کا وجود دم زخم ہو گا۔ جیسی وہ لہو میں تھرا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے ڈوبنے سورج سے نظریں ہٹا کر سلیمنہ کے چہرے پر جمادیں۔ دونوں سارہ کو تلاش کر کے تھکے ہارے، اب کچھ دیر سستانے کو اس بلند پہاڑی پر بیٹھے تھے۔ ”ایک بات کہوں، مجھے لگتا ہے سارہ زندہ نہیں ہے۔“ سلیمنہ کی بات پہ احمر کا بھاری ہاتھ منظر اری انداز میں اس کے رخسار کو دہکا گیا تھا۔ سلیمنہ کی بے لفتن نظروں نے احمر کو دیکھا..... بے یقینی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ وہ کچھ دیر کو حیران بھی نہ ہو پائی۔

”وہ زندہ ہے۔“ احمر نے کہہ کر سر دونوں ہاتھوں میں تمام لیا۔ ”تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟ سلیمنہ پر؟“ وہ خود غلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔ احمر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔

”آتم سو رہی۔“ وہ میں..... اس کے انداز میں شرمندگی کا رنگ کھرا تھا۔ ”میں اب تمہارے پاس ایک منٹ نہیں رہوں گی۔ سڑتے ہوئے جنگل میں۔ یہ تو تب چلے گا نا جب بدردووں سے واسطہ پڑے گا۔“ سلیمنہ کی آواز میں اشتعال کی تپش تھی۔ احمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ عائب ہو چکی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔

مگر اندھیرا بھی اتنا گہرا نہیں تھا۔ بس اتنا سا ہی تھا جیسے کوئی تالاب میں ذرا سی سیاہی گھول دے۔ وہ پہاڑی سے اترنے لگا۔ جنگل میں چھائی خاموشی اسے اپنے اندر اتنی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے قدم خشک چوں پہ پڑے تو پتے احتجاج چلا اٹھتے۔ مکران پتوں کی آوازوں یہ کان دھرنے والا کون تھا بھلا؟ رات دیر سے دیر سے جنگل کے درختوں سے ہوتی ہوئی جنگل کی زمین پر اتر آئی تھی۔ وہ ایسے ہی پانگلوں کی طرح چل رہا تھا۔ اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیال سر اٹھا رہا تھا کہ سارہ اس جنگل میں نہیں ہے۔ لیکن..... لیکن پھر کہاں گئی وہ؟ کسی درندے کا شکار.....

”نہیں۔ نہیں۔ وہ زندہ ہے۔“ اس نے با آواز بلند اپنے خیال کو ڈپٹا تھا۔ چلتے چلتے اس کی ٹانگیں ٹھل ہو چکی تھیں۔ مگر منزل کا کوئی سراغ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض اوقات ہم چلتے ہی جاتے ہیں۔ مگر منزل کبھی مل نہیں پاتی۔ ہر کوشش، ہر سفر رائیگاں ٹھہرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ خود کو کس رہا تھا کہ..... اچانک ایک درخت کی جھکی شاخوں سے ایک طویل ہاتھ نمودار ہوا۔ اس نے لمبے کے ہزارویں حصے میں اس کی گردن کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اور اچانک حملہ خواہ ہلکا سا ہی ہو، کچھ دیر کو تو سوچنے بجھنے کی ہر صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کچھ دیر کو اس کی سوچنے بجھنے کی ہر صلاحیت سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی حیرت نے جنم لیا تو وہ ایک تاریک جگہ میں تھا۔

☆.....☆.....☆

سائل کی ریت ابھرتے سورج کی روشنی میں چمک سورج کی چمکی کریمیں سرخ آب پہ بھجان انگیز انداز میں رقصاں تھیں۔ جنگل کے درختوں سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہلیو ڈھیلے ڈھالے لڑاؤ زراور ہلکے فی شرٹ کی سلوٹیں بتاتی تھیں کہ اسے کئی دن سے لباس بدلنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں بڑے بڑے انور جیسے پھلوں کا ایک کچھ یوں اٹھا رکھا تھا



جیسے وہ اسے لوگوں کی نظروں سے بچانا چاہتا ہو یا پھر اسے اس سے چھین لئے جانے کا خدشہ ہو۔۔۔۔۔ اس کا رخ سمندر کی جانب تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اس کے منہ بیروں کے نشان ساحل کی گیلی ریت پر ثبت ہوتے جا رہے تھے۔ سطح آب یہ ناہنجی کرئیں اپنا رخ بھول کر۔۔۔۔۔ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ دن نے تیرا سے انگلی دانٹوں میں دبائی تھی۔ وہ شخص دیرے دیرے پانی میں اترنے لگا۔ جب پانی اس کی کمر کو چھونے لگا تو اس نے سر اٹھا کر آسمان کو بچی نگاہوں سے دیکھا۔ زیر لب کچھ بڑبڑایا اور پھر مزید آگے بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ گہرے پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ بہت دیر بعد دن کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ وہ رات کو یہ سب ضرور بتائے گا۔۔۔۔۔ اس نے عقیدت سے شران غنی کے نقش پاد دیکھتے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

سارہ کے ہاتھ میں کانچ کی وہ بوتل تھی۔ اس کی حالت بے حد عجیب ہو رہی تھی۔ اس کے لب، اس کی زبان، اس کا دل، اس کی روح عقیدت سے آیت قرآنی کا نذرانہ پیش کر رہی تھی، پھر اس نے سورہ فاتحہ پڑھی، پھر آیت الکرسی اور۔۔۔۔۔ پھر درود شریف پڑھ کر بوتل کا ڈھکن کھول دیا۔ جابجا مضطرب دھواں بھڑک رہا تھا۔ سانس روکے اسے دیکھنے لگا۔ پھر وہ دیواروں پر پانی کا چھڑکاؤ کرنے لگی۔۔۔۔۔ دیواروں سے حیرت آمیز خوشی کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ ایک عجیب سا شور فضا میں پھیل گیا۔ مکیوں کی جھنڈناہٹ سے مشابہہ۔۔۔۔۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پانی ختم ہو گیا تھا۔ اور جب وہ ہاتھ میں خالی بوتل لئے پلٹی تو وہ جگہ اتنے لوگوں سے بھر چکی تھی کہ پاؤں دھرتا دھرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اے ہمارے رب! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمارے عذاب کو ختم کر دیا۔ بلاشبہ تو تمام جہانوں کا مالک اور ہر چیز پر قادر ہے۔“ وہ سب مختلف الفاظ میں اللہ کے شکر گزار تھے۔ ”اور تمہارا بھی شکر یہ لڑکی؟“ وہی پہلا شخص اس سے مخاطب ہوا۔ رومان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور جیمز اور ویری آنکھوں میں ڈھیروں

☆.....☆.....☆

اسے یوں پکارنے والا؟

☆.....☆.....☆

ڈوبتے سورج کی گلابی، لرزتی کرئیں تاحد نگاہ پھیلے سمندر کی سطح پر سجدہ ریز تھیں۔ سمندر موت کی سی گہری نیند سوا ہوا تھا۔ سورج اپنا زخم زخم وجود لئے ڈوب رہا تھا۔ سمندر کے کنارے اس کا لہو لہان وجود دیرے دیرے گہرے گہرے پانیوں میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ لرزتی کانٹنی لہروں کے سبب سمندر دیرے دیرے کسمانے لگا تھا۔ لہریں سانپ کی طرح بل بل کھاتے ہوئے کروٹ بدلتے لگی تھیں۔ وہ ریشمی ساحل پر بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے پھوڑی گھٹنوں پر لگائے ایک ٹک دور دور تک پھیلے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ ”جو“ ”مقدّر“ کی طرح اس کے راستے میں حائل تھا۔ اس کی آنکھوں میں سامنے پھیلے بحر اوقیانوس سے بھی گہرا تر کا سمندر تھا۔ اور شام سے پہلے ہی شام کا ملگجا اندھیرا، ان سرمئی لہروں میں اتر آیا تھا۔ پھر دفعتاً سرمئی آنکھوں میں شدید ترین حیرت۔۔۔۔۔ شدید ترین حیرت۔۔۔۔۔ اس کا دل یکبارہ دھڑکا دھڑکا اور پوری شدت سے دھڑکا تھا۔۔۔۔۔ بل حائل لہروں کی سنہری سطح پر کوئی چلنا آ رہا تھا۔ یوں۔۔۔۔۔ جیسے پانی پہ چل رہا ہو۔ اس کے پاؤں گھرنے سے پانی ذرا سا اٹھ اٹھا اور پھر ساکن ہو جاتا تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے تاریخ تبدیل کیا اور اس کے قدم مخالف سمت میں اٹھنے لگے۔ سارہ کی آنکھوں میں ابھری شناسائی کی لہر معدوم پڑی اور وہ جلائی ہوئی اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اس کے قدم لہو لہاں وار اس کے تعاقب میں اٹھ رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ اسے پکارتی بھی جا رہی تھی۔ وہ مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ خود بھی پانی میں اتر رہی ہے۔ اس کی نظریں تو جانے والے پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً ایک تڑپتی لہر آئی اور۔۔۔۔۔ اسے نکل گئی۔ اب وہاں پلٹتے پانی کے واہجہ تھا۔ چلتا۔۔۔۔۔ پھر قرار پائی۔۔۔۔۔ جو بار بار اپنی شہ زبان کو ساحل سے لڑنے لگتا تھا۔

☆.....☆.....☆

پانی میں اترتے ہی وہ کسی مچھلی کی مانند تیرنے

لگا۔ اسے سانس لینے میں ذرا بھی دشواری یا دقت نہیں ہو رہی تھی۔ البتہ جب وہ سانس لیتا تھا تو پانی میں جلیبے سے چھوٹ جاتے تھے۔ وہ عین نیچے۔۔۔۔۔ تہہ میں اتر گیا۔ مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوق اسے دیکھ کر ضرور ہی تھیں مگر چھپنے نہیں رہی تھیں۔ نیکیوں مائل سبز گھاس میں نیلے سفید اور سرخ پھول مسکرا رہے تھے۔ جابجا چھوٹی بڑی چٹانیں ابھری ہوئی تھیں۔ پھلوں کا وہ بچھا اس نے ابھی بھی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اچانک اس کے سر پر کوئی چیز لگی۔ اس کا سر پانی میں نیچے ہوا۔ اس نے پھر سر اٹھایا اور دیکھنا چاہا کہ اس کے سر پر کتنے والی چیز کیا تھی؟ ابھی وہ سر اٹھا بھی نہ پایا تھا کہ پھر کسی سخت چیز کی ضرب لگی۔ یہ وار کافی کاری تھا۔ اسے لگا کہ سمندر کا سارا پانی اس کے گرد تیزی سے کسی گولے کی طرح چکرار رہا ہے۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا۔۔۔۔۔ مگر اسی لمبے مزید ضرب اس کے سر کا حزانہ پوچھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں دیر تار کی پانی کی منہ زور لہروں کی طرح گھس آئی تھی۔ آب حیات ابھی بھی اس کی گرفت میں جکڑا تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ پھلوں کا وہ بچھا کوئی اس سے چھیننا چاہ رہا ہے۔ اس کی ساری حیات ہاتھ میں سمٹ آئیں۔۔۔۔۔ اس نے پھلوں کی پتلی سی شاخ کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ پھر مزید ایک ضرب نے اس کے سر کو اوندھا دیا۔۔۔۔۔ اس کا ذہن سمندر کی تہوں سے بھی نیچے۔۔۔۔۔ پاتال کی گہری گمانیوں میں۔۔۔۔۔ کالے پانیوں کی تہوں میں اترتا چلا گیا۔ آخری احساس آب حیات نامی پھل، ہاتھ سے چھین جانے کا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کے حواس جاگے، آنکھیں کھلیں تو وہ ابھی بھی سمندر کی تہہ میں ہی تھا۔ اس کی نظروں نے پانی کے بعد اس لڑکی اجول کو چھو اٹھا۔ اس کے سنہری لالچے بال پانی میں لہرا رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

”ماہ۔۔۔۔۔ ماہ شب کہاں ہے؟“ اس نے کلمہ پڑھنے کے بعد پوچھا تھا۔ اجول کے چہرے پر اضطراب



جھا گیا۔ ”بہت برا ہوا ہے شران! بہت برا۔۔۔“ اس کا  
 غمبیر لہجہ شران کے دل پہ تھوڑا رسید کر گیا۔  
 ”کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہراساں نظروں سے  
 اجول کا چہرہ دیکھا۔ ”ماہ شب کو ابن سمندر لے گیا  
 ہے۔“ اجول کا لہجہ رازدار تھا۔

”ابن سمندر؟“ اس نے ٹھٹھک کر اجول کو  
 دیکھا۔ ”وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئی۔

”اس کا نام تو پتہ نہیں کیا ہے؟ مگر سب اسے  
 سمندروں کا بیٹا کہتے ہیں۔ وہ بہت خطرناک ہے۔  
 تمہارے جانے کے بعد۔۔۔ اس نے محض چند گھنٹوں  
 بعد یہاں حملہ کیا۔ حفاظت پر مامور ساری آبی مخلوق  
 اسے روک نہ پائی۔ ان میں سب کچھ تو ماری گئی اور کچھ  
 ڈر کے مارے بھاگ گئیں۔“

”لیکن وہ کیوں لے گیا ہے اسے؟“ اسے اپنی  
 آواز پاتال سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے طلق میں  
 گویا مونکے کی چٹان بھنس گئی تھی۔ دل کی گردن پہ کسی  
 نے پاؤں رکھ دیا تھا اور دل۔۔۔ دھڑکنے کی طلب  
 میں۔۔۔ سانس لینے کی طلب میں پورے وجود میں بے  
 قراری سے سر تھینے لگا تھا۔ دھڑکنیں سینے کے بجائے ہر  
 مسام سے ابھرنے لگی تھیں۔

”ماہ شب کے پاس بہت ہتکتیاں ہیں۔ وہ کوئی  
 جاپ کرے گا۔ یوں وہ ان کو اپنے تابع کر لے گا۔“ وہ  
 پست آواز میں بتانے لگی۔ ”اور پھر ان سے اپنی مرضی کا  
 ہر کام لے سکے گا اس کے عزائم بہت خطرناک ہیں  
 شام!“ اس کا لہجہ تشویش میں ڈوبا تھا۔ ”لیکن ماہ کیوں  
 اس کا ساتھ دے گی؟“ اس نے سر جھٹکا۔ ”وہ دے گی  
 کیونکہ۔۔۔ کیونکہ اس عمل سے اس کی یادداشت چلی  
 جائے گی۔ اسی لئے اس نے تم سے آج حیات چھینا  
 ہے۔ جب وہ جاپ مکمل کر لے گا۔ تب آج حیات کا  
 رس ڈیکائے گا اور وہ زندہ تو ہو جائے گی مگر۔۔۔ بہت  
 خطرناک ہو جائے گی۔“ اس نے سر سراتے لہجے میں ہم  
 پھوڑا تھا۔

”اسے روکنا ہوگا۔“ خود کلامی کے انداز میں بولا

تھا۔ ”میں اس جگہ تک تمہاری رہنمائی کر سکتی ہوں۔۔۔  
 چلو۔۔۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔“  
 اس نے شران کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ساتھ لئے تیزی  
 سے تیرنے لگی۔ اس کے انداز میں غلت تھی۔ وہ  
 تاریک پانیوں کا سینہ چیرتے چلے جا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

جان مکمل ہو چکا تھا اور اپنے مکمل ہونے کی خوشی  
 میں انتہائی فراخ دلی سے جاندار لپٹا رہا تھا۔ سمندر کا پانی  
 چاندی میں ڈھل چکا تھا۔ کنارے سے کافی دور ایک  
 شخص کمر تک پانی میں کھڑا تھا۔ اس کے سینے سامنے ایک  
 آبی قبر تھی۔ جس طرح مٹی کی قبریں زمین کی سطح سے ابھرتی  
 ابھری ہوتی ہیں، ویسے ہی سطح آب سے تھوڑا اور اونچا  
 کمر پانی نے قبر کی شکل اختیار کر رکھی تھی۔ پانی کی اس  
 شفاف قبر کے بیچ لٹکی ہوئی بلاشبہ ماہ شب تھی۔ اور اس  
 سے دربارے کھڑے شخص کے لب مسلسل پھڑپھڑا  
 رہے تھے اور نظریں قبر کے بیچ لٹکی ماہ شب پر تھیں۔ وہ  
 پلکیں نہیں جھپک رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ اسی عمل میں  
 مصروف رہا۔ پھر اس نے آبی قبر پہ پھونک ماری  
 اور۔۔۔ پانی کی سطح پر تیرتا کنارے پہنچا۔ اس نے  
 آبی قبر کے گرد حصار کھینچ ڈالا تھا۔ اب کوئی شے اس آبی  
 قبر کو چھو نہ سکتی تھی۔ بشرطے کہ ماہ شب خود حرکت نہ  
 کرے۔ اور ماہ شب کے خود شرکت کرنے کا سوال ہی  
 پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ رقیلی ساحل پہ لیٹا اور مستقبل کے  
 خوش کن سینوں میں کھویا۔ اس کا ماضی سمندر کی تہوں  
 میں نہیں پوشیدہ تھا۔ وہ جپٹ لیٹے لیٹے سو گیا۔ سمندر کی  
 تہہ میں۔۔۔ ایک سیپ میں بند مونی کی طرح اس کا  
 ماضی۔۔۔ جو سیپ کے پیٹ میں دفن تھا۔ سیپ کھلنے سے  
 دھیرے دھیرے باہر نکلنے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس نے ہوش سنبھالتے ہی صرف شام کو دیکھا  
 تھا۔ جو خود کو اس کا چچا بتاتا تھا۔ بقول اس کے، وہ لوگ  
 دو ہی بھائی تھے۔ وہ لوگ چھیرے تھے۔ سمندر کنارے  
 ان کی جھوپڑیاں تھیں۔ وہ لوگ برسوں سے وہیں تھے۔

مگر یہ تو کسی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ قائم رہتی ہے۔ بحال  
 ہے جو اپنی جگہ سے ذرا بھی سرکے۔۔۔

بہر حال وہ لوگ بھی اپنی اس محبت سے مجبور تھے تو  
 واپس سمندر کے پاس آ گئے تھے۔ اس کے بچپانے اس  
 کی پرورش سمندر کی لہروں پر کی تھی۔ وہ محض دوسال کی  
 عمر سے ہی بہت اچھا تیراک بن چکا تھا۔ سمندر کے  
 سارے جاندار اس سے مانوس ہو گئے تھے اور رام دیال  
 جو کہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ افریقہ کے جنگلات میں گزار آیا  
 تھا اور پراسرار علوم جمع کر چکا تھا۔ شام کی خواہش پر اس  
 نے ایک ایک کر کے وہ سارے علوم سمندر کے ذہن میں  
 اٹھانا شروع کر دیے۔ سات سال کی عمر تک وہ علوم کو  
 خود میں جذب کر چکا تھا۔ اس نے سارا سارا دن پانی  
 میں تیرتے ہوئے چلے کٹی کی تھی۔ ساری ساری رات  
 سمندر کی تہوں میں گزاری تھی۔ اکثر اوقات سمندری  
 مخلوق اس کی دخل اندازی پر برہم ہو کر اس پر جھپٹ  
 پڑتی تھی۔ مگر جلد ہی اس کے سامنے ترنوالہ ثابت ہوئی۔  
 وہ چند منٹ میں ہی انہیں چپ کر جاتا۔ یوں اس نے نو  
 عمری میں ہی سمندر اور سمندری مخلوق پہ دسترس حاصل  
 کر لی تھی۔ اسے سمجھی سے ابن سمندر کہا جانے لگا تھا۔ یہ  
 نام اس قدر مشہور ہوا کہ اس کے اصل نام نہیں پس پشت  
 چلا گیا۔۔۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ چاہے سمندر میں  
 کئی سینے گزار دیتا مگر پانی اس کے پیچھے پروں میں داخل  
 نہ ہو پاتا تھا۔ وہ سمندری مخلوق کی مانند ہی تھا۔۔۔ سمندر  
 اس کا گھر تھا۔۔۔ دیگر لوگ سمندر کو ”ماں“ سمجھتے تھے مگر  
 سمندر اسے ”پپا“ سمجھتا تھا۔ کم از کم لوگوں کا خیال یہی  
 تھا۔ آپ کون کیا تھا؟ اس کا فیصلہ تو وقت ہی نے کرنا  
 تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے آکھیں کھیں تو دم بخود رہ گئی۔ وہ  
 سمندر کی تہہ میں تھی۔ لیکن حیرت یہ کہ زندہ بھی تھی۔ کیا  
 کوئی بنا کسی حفاظتی اقدام کے پانی میں زندہ رہ سکتا ہے  
 اور اس پر مستزاد کہ سانس لیتے وقت بھی پانی اس کے منہ  
 میں نہ جا رہا تھا۔ ارد گرد جھیلی چٹانیں اور سمندری نیلیں

ان کی تمام امیدیں سمندر سے وابستہ تھیں۔ وہ سمندر  
 کے دامن سے رزق تلاش کرتے تھے۔ لیکن ایک دن  
 اسی سمندر نے ان کی جھوپڑیوں کو، ان کے گھروں کو  
 اور۔۔۔ ان کی زندگیوں کو کھل لیا۔ سیلاب کوئی پہلی بار نہ  
 آیا تھا۔ لیکن پہلے وہ سمندر کے تیور بھانپ جاتے تھے  
 اور پہلے ہی ہتھیار کا انتظام کر لیتے تھے۔ لیکن اب کی بار  
 سمندر نے انہیں ہتھیار کا موقع نہ دیا تھا۔ دیو قامت  
 اچھلتی لہریں سب کچھ ٹپک کر گئی تھیں۔ شام نے بمشکل  
 نئے سمندر کو بچا یا تھا۔ اس کے ماں باپ دونوں ہی سمندر  
 کا شکار ہو گئے تھے۔ اس بار وہی سمندر انہیں کھل گیا تھا  
 جو کہ اب تک انہیں روزی روٹی فراہم کرتا آیا تھا۔ ہمیشہ  
 سمندر سے رزق لینے والے، سمندر کا رزق ثابت  
 ہوئے تھے۔ شام نئے سمندر کو لئے کچھ عرصے کے لئے  
 غریب لہروں سے دور چلا گیا تھا۔ سمندر جب اپنا غضب،  
 اپنی ہزاروں نکال چکا، پر سکون ہو چکا تو تب وہ واپس  
 لوٹ آیا۔ طوفانی لہروں کے قاتل جڑے سے بچنے والا  
 ان کے علاوہ ایک بوڑھا رام دیال بھی تھا۔ سمندر اس  
 کے بھی پورے لئے کھڑا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ  
 بھی پھر وہیں، سمندر کنارے آ گیا تھا۔ زمین کی کشش  
 سے زیادہ انہیں سمندر کی کشش اپنی کرتی تھی۔ وہ لوگ  
 سمندر کو ”ماں“ کا درجہ دیتے تھے اور انہیں اپنی ماں سے  
 ”پیارا بھی بہت تھا۔ اس لئے وہ اسے چھوڑنے کا سوچ  
 بھی نہ سکتے تھے۔ جن سے محبت ہوتی ہے نا، انہیں ہم  
 لاکھ چاہئے کے باوجود بھی چھوڑ نہیں پاتے۔ چاہے وہ ہم  
 سے لاکھ گریزاں ہو۔ ہمارے ہاتھ جھٹکے، ہمیں ٹکرائے،  
 دھکے مارے۔۔۔ اس کے باوجود ہم اسے چھوڑ نہیں  
 پاتے۔۔۔ والدین کو پتہ ہوتا ہے کہ روشنی تو انہیں کیا  
 ملے گی، بلکہ اللہ انہیں جلا دے گی۔۔۔ مگر اس کے  
 باوجود وہ اس کے گرد بکراتے رہتے ہیں۔۔۔ تپش لہہ بہ  
 لہہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔۔۔ مگر پروانے جل کر راکھ  
 ہونے تک شمع کا طواف کرتے رہتے ہیں محبت کی  
 فطرت میں عجیب ایثار ہے۔ اور ایک عجیب ہی ضد  
 بھی۔ بلا کا سرکش مزاج ہے اس کا۔ لاکھ دھکے مارو،



جن یہ رنگ برنگے پھول تھے۔ نباتات کی خوشبو پھیلی تھی۔ کچھ دیو تودہ گم صمسی وہیں کھڑی رہ گئی۔ پھر اچانک وہ چوکی۔ اس کے چونکنے کا سبب ایک بڑا مگر مجھ تھا۔ جو اپنا پہاڑ سامنے کھولے اس کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے دانت یقیناً اس کو ننگے والے تھے۔ وہ بدستور گم صم کھڑی رہی۔ اچانک اس کے دائیں بازو میں نیزے سے کھب گئے۔ مگر مجھ اسے دانتوں میں دبوچے ایک سمت تیرنے لگا۔ راستے میں آنے والی عجیب و غریب مچھلیاں اور دیگر آبی مخلوق خود بخود اس کا راستہ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اس پہ تھابت طاری ہونے لگی۔ اور پھر دھیرے دھیرے اس کا ذہن تاریکیوں کی تہوں میں ڈوبنے لگا۔ ہر منظر پانی میں کھل کر اپنا وجود دکھو بیٹھا تھا۔

☆.....☆.....☆

پانی کی وہ قبر چاندنی رات میں چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ اور اس میں تو خواب ماہ شب کا چاندنی لٹا تا وجود عجیب خیرہ کن تھا۔ اس کی سفید شفاف جلد سے گویا نور کی کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ ابن سمندر اس قبر کی پائنتی کھڑا تھا۔ وہ سینے تک پانی میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پوجا کے انداز میں باندھ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں یک ناک ماہ شب کو کھور رہی تھیں۔ اور ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ یونہی گزر گیا۔ رات جو سمندر پہ چمک چمک کر تپتی پھرتی تھی اس منظر کو دیکھ کر جہاں کی جہاں تھم گئی۔ اس کی آنکھیں جو حقیقتاً بے نور تھیں مگر اس وقت چاند سے روشنی مستعار لئے ہوئے تھیں۔ اور اس کی عارضی روشن آنکھوں میں تجسس جاگ اٹھا تھا۔ ابن سمندر نے دفعتاً اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اس نے سر جھکا یا اور پانی میں ڈبکی لگا کر نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔ اس جگہ پانی کے چھینٹے کچھ دیر اٹھتے رہے۔ لہروں میں چند ٹانے پھل پھل پٹی رہی۔ پھر پانی ساکت ہو گیا۔ رات سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اسے پکارنے والا کون تھا؟ اس کی حیرت بجا تھی۔ ”میرے پاس آؤ۔“ آواز میں ایک عجیب سا کرب پہاں تھا۔ جیسے کوئی سخت اذیت میں سلگ رہا ہو۔

”کہاں؟“ وہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ ”دائیں جانب آؤ۔“ اس نے آواز کی تقلید کی۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے وہ ہیولہ سا دکھائی دے گیا۔ وہ ہیولہ کی امر کا تھا۔ ”تم بیٹھو۔ یہ کھانا کھاؤ۔ پھر میں تمہیں ان تمام دواؤں کے جواب دوں گا۔ جنہوں نے تمہارے ذہن میں پھل عجیبی ہے۔“ اس نے کہا۔ تب امر کو کھانے کی ترے نظر آئی۔ کئی دن سے بھوکے ہونے کی وجہ سے وہ بلا تکلف کھانے پھوٹ پڑا۔ کھانے کے بعد اس نے جی بھر کے پانی پیا اور بوڑھے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کم از کم اس کی جسامت سے وہ اسے بوڑھا ہی لگا تھا۔ اب مجھے ان زنجیروں سے آزاد کرواؤ۔“ اس نے چوک کر دیکھا۔ فضا بدستور تاریک تھی۔ مگر اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں۔ اس شخص کا پورا وجود زنجیروں میں جکڑا تھا۔ کافی کوشش کے بعد وہ اسے آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ”اب بتاؤ۔ تمہیں اس طرح کس نے جکڑا اور کیوں؟“ امر کا سوال فطری تھا۔ ”میرا نام منصور ہے۔“

☆.....☆.....☆

میں نے آنکھ کھولے ہی بابا کو کھودیا۔ میں ایک ہی دن کا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر مر گئے۔ ”نہ کی موت گھر کی چھت گرنے سے ہوئی تھی۔“ ماں نے دس سال تک سینے سے لگائے رکھا۔ مگر ایک دن اسے بھی موت نے نکل لیا۔ میں دردور کی شوکرین کھانے لگا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں جب سولہ برس کا تھا تو ایک دن دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں اس دن گھر پر ہی تھا۔ وگرد اکثر میں تاپا یا پچا وغیرہ کے ہاں رہتا تھا۔ بہر حال دروازہ کھولا تو سامنے ایک فقیر کو پایا۔ ”کچھ کھانے کو دے دے بچہ۔“

”میرے پاس کچھ کھانے کو نہیں تمہیں کیا“

”کیا مطلب؟“ جواب میں نے مختصر حالات کہہ سنائے۔ اس نے مجھے ایک بوسیدہ سا درق دیا۔ اس پر ایک عمل لکھا تھا جو کہ ایک ویران جگہ کرتا تھا۔ اس سے میں دولت مند ہو جاتا۔ قصہ مختصر یہ کہ میں نے وہ عمل کیا۔ چالیس دن کے کھن چاپ کے بعد لوٹوں سے بھرا ایک تھیلہ میرے کمرے میں تھا۔ میں بہت خوش ہوا۔ اس شام محلے کے امام مسجد صاحب آئے اور مجھے وہ پیسے استعمال نہ کرنے کا کہا کہ وہ سفلی علم سے حاصل ہوئے تھے۔ مگر میں نے کوئی توجہ نہ دی۔ خوب عیش کئے۔ وہی عمل پھر سے شروع کر دیا۔ مگر اس بار اس کا الٹا اثر ہوا۔ شاید مجھ سے دوران عمل کوئی غلطی ہوئی تھی۔ اثر یہ ہوا کہ کمر کا سامان تک پیچھے کی نوبت آ گئی۔ پھر مجھے ایک اور عمل ملا۔ اس سے پہلے میں بتا دوں کہ دوسرا عمل بھی سفلی تھا جو جنگل میں کرتا تھا۔ مگر..... لالچ نے میری آنکھوں پہ جی باندھ دی اور میں تیار ہو گیا۔ ویسے انسان فطرتاً ہی لالچی واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کی عبادت میں دوزخ سے بچاؤ یا پھر جنت کے حصول کی خاطر کرتا ہے۔

بہر حال..... میں یہاں جنگل میں گیا۔ اور عمل شروع کیا۔ لیکن پہلی ہی رات ایسا خوفناک منظر دیکھا کہ میری روح تک کانپ اٹھی۔ اور میں نے سفلی علم سے توبہ کر لی۔ چلے پہلی ہی رات بندہ گرنے پر اس کے سر کے نیچے یہاں باندھ گئے کہ ان کا کہنا تھا کہ اگر عمل زیادہ دن لیا جاتا تو سزا بھی زیادہ ملتی۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے چھوڑ دیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ امر نامی کوئی بندہ اس جنگل میں بیٹھا پھر رہا ہے۔ اگر وہ یہاں سے گزرے تو میں اس سے کہہ کر آزاد ہو سکتا ہوں۔ مزید یہ کہ ایک جن میری عمرانی پر مامور کر دیا گیا۔ وہی مجھے کھانا وغیرہ دیتا تھا۔ تو بھی میری کہانی ”وہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ اچھا۔“ آخر جس سر ہلا کر وہ گیا۔ میں ابھی پہن ہوں۔“ اس نے کہہ کر قدم بڑھائے۔ ”چلے جانا۔“

جلدی کیا ہے؟ ویسے تم اس خطرناک جنگل میں کیوں بیٹھتے پھر رہے ہو؟

”میں..... میں محبت کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ویسے کتنی عجیب بات ہے نا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے محبت کھو دیتے ہیں اور پھر اسے ڈھونڈنے کے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔“ وہ خود کھلائی کے سے انداز میں بول رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شران اور اجول وہاں پہنچ چکے تھے۔ مگر..... انہیں دیر ہو چکی تھی۔ اکثر ہمیں دیر ہو جایا کرتی ہے۔ پھر اس ”دیر“ کی تلافی ممکن بھی نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ جب وہ لوگ وہاں پہنچے جب ابن سمندر ماہ شب کے ہونٹوں پہ آب حیات کا رس نکار رہا تھا۔ شران وہیں ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے قدموں سے گویا مینوں وزنی زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ جن سے وہ چاہ کر بھی خود کو رہا نہیں کروا سکتا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی مگر بحر اوقیانوس کا سارا پانی ایک دم گویا برف میں ڈھل گیا تھا۔ منجھد ہو گیا تھا۔ رس حلق میں جانے کے بعد..... چند لمحے بعد ماہ شب نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمندر کی سطح پر کھڑی تھی۔ اس نے چند ٹانے ارد گرد پھیلے بیزی مائل نیلیوں سمندر کو دیکھا اور اٹھ بیٹھی۔ ”میں..... کہاں ہوں؟..... میں میں کون ہوں؟“ اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ”تم میری..... ابن سمندر کی غلام ہو۔“ ابن سمندر نے کہا تھا اور شران دم بخور ہو گیا۔ جب ماہ شب نے تائید کی۔

”ہاں۔ میں ابن سمندر کی غلام ہوں۔“

”تم میری ہر بات ماننے کی پابند ہو۔“

”میں تمہاری ہر بات ماننے کی پابند ہوں۔“

”میں تم سے تمہاری جان بھی مانگوں گا تو تم دو گی۔“

”تم میری جان بھی مانگو گے تو میں دوں گی۔“

”تم صرف یہ جانتی ہو کہ میری غلام ہو، تم اور کچھ نہیں جانتی تم صرف مجھے پہچانتی ہو تم اور کوئی نہیں پہچانتی۔“



”میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں تمہاری غلام ہوں میں اور کچھ نہیں جانتی، میں صرف تمہیں پہچانتی ہوں اور کسی کو نہیں پہچانتی۔“ وہ میکا کی انداز میں اس کی ہر بات و ہر رائے جاری نہ تھی۔ اس کا لہجہ کسی بھی تاثیر سے یکسر عاری تھا۔ اس کی سنہری آنکھیں بھی کسی بھی تاثر سے عاری تھیں۔

”ٹھیک۔۔۔۔۔ اب جاؤ اور شیا تک قبیلے کے سردار رنگا سے سفید ناگ کی مٹی لے کر آؤ۔“ ابن سمندر کی بات نے شران کو دہلا کر رکھ دیا۔ اضطراب کا لاوا اس کے حلق میں سمٹنے لگا۔

”میں نہیں تین دن کا وقت دیتا ہوں۔ تین دن بعد مجھے وہ مٹی چاہئے۔“ ابن سمندر کا لہجہ حکم سے بھرپور تھا۔ اور بے حد اٹل۔۔۔۔۔ ”تم تین دن بعد وہ موتی مجھے لا دو گی۔ خواہ قیامت بھی آ جائے۔ تم ہر حال میں مقررہ مدت میں وہ موتی لاؤ گی۔“

”میں تین دن بعد تمہیں وہ موتی لا دوں گی۔ خواہ قیامت بھی آ جائے۔ میں ہر حال میں مقررہ مدت میں وہ موتی لاؤں گی۔“ ماہ شب کے لہجے سے اپنی عزم جھلکتا تھا۔ پہاڑوں کا ساعر۔۔۔۔۔ ”اب جاؤ۔ ابھی سے آغاز کرو اس کام کا۔“ ابن سمندر کا انداز سخت تھا۔ اس بار ماہ شب بنا کچھ بھی بولے سر ہلا گئی۔ ابن سمندر نے کچھ بڑبڑا کر اس پر پھونکا۔ ”تم اپنی تمام تر شہتوں اور ان کے طریقہ استعمال سے واقف ہو چکی ہو۔ مگر ان کو استعمال تم صرف میرے کاموں کے لئے کر دو گی۔“ وہ مسکرایا۔

”اب جاؤ۔“ اس نے جھانکنا انداز میں کہا۔ ماہ شب نے آنکھیں بند کیں۔ اس کی پلکیں لرزیں اور اگلے ہی لمحے وہ۔۔۔۔۔ وہاں نہیں تھی۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ شران پاگل ہوا تھا۔

”ماہ شب۔۔۔۔۔“

”ریلیکس شام۔۔۔۔۔ ماہ شب کو روکنا ہوگا۔ رنگا بہت طاقتور ہے اور اب تو اس کے پاس سفید موتی کی ہتھکڑیاں بھی۔۔۔۔۔ وہ ماہ شب کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

اجول نے تشویش سے کہا تھا۔

”چلو۔۔۔۔۔ وہ شران کا ہاتھ تمام کر پانی میں اتر گئی۔ ابن سمندر انہیں لاقلمی سے دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

اس نے وقت آنکھیں کھولی تھیں۔ پلکیں کھولنا بھی کارِ شفقت تھا۔ اس کی نگاہوں نے سب سے پہلے آسمان کو چھوا تھا۔ آسمان جس کا رنگ گہرا نیلا ہو رہا تھا اور فضا میں اکا دکا سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھرتے تھے۔ ایک پرندہ اوپر، بہت اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا۔ ”سارہ!“ رومان کی پکار نے اس کی سماعتوں کو چھوا تھا۔ وہ دیر سے اٹھ نہ تھی۔

”کیا ہوا تھا تمہیں؟“ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

”رومان! میں نے ماہ شب کو دیکھا تھا۔“

”کیا؟“ وہ بے ساختہ اچھل پڑا۔

”ہاں! وہ ماہ شب تھی۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ پانی پر یوں چل رہی تھی۔۔۔۔۔ جیسے زمین پر چل رہی ہو۔ وہ ادھر ہی آ رہی تھی۔ مگر۔۔۔۔۔ ایک دم اس نے رخ پھیرا اور چلی گئی۔ اور رومان! وہ اکیلی تھی۔ اس کے ساتھ شران نہیں تھا۔ یہ نہیں وہ کہاں ہے؟“ اس کا لہجہ ٹٹا ہوا تھا۔

از حد ٹھہرا۔۔۔۔۔ ”تو تم نے اسے پکارا نہیں؟“

”پکارا تھا۔ مگر اس نے سنا ہی نہیں۔۔۔۔۔ اور پتہ ہے میں اس کے پیچھے بھی گئی تھی مگر۔۔۔۔۔ وہ مگر مجھ کا واقعہ سنانے لگی۔ کہ کس طرح وہ اسے بخیریت بچا لایا تھا۔“ اس کا مطلب ہے کہ ہم منزل کے قریب ہی ہیں۔ رومان نے سفید ریت مٹیوں میں بھری۔ سمندر پر سکون تھا۔ گویا گہری نیند سو رہا ہو۔ از حد مطمئن اور۔۔۔۔۔ سپاٹ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں شران کہاں ہے؟ میرا دل ہول رہا ہے۔“ سارہ کے لہجے میں سختی میں لپٹا اضطراب تھا، اندیشے تھے اور چہرے پر شدید فکر مندی اور تشویش کے نقشے کھینچ گئے تھے۔ ”اللہ خیر کرے گا۔ دیکھو یا اب ہم منزل کے بے حد قریب ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“

جس اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے آگے بھی وہی کرے گا۔ تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رومان کے لہجے میں تسلی کا سامان تھا۔ سارہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ اس کے سینے میں درد گویا بوجھ بن کر بیٹھا جا رہا تھا۔ بھاری، ناقابل برداشت۔۔۔۔۔ سانسوں میں کسی نے گندھک کا تیزاب گھول دیا تھا۔ جلن شدید ترین تھی۔۔۔۔۔ روح گویا جسم کی صلیب پر مصلوب ہو کر رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت بے قراری کے عالم میں ساحل پر نمودار ہوا۔ نیم جان دن نے بغور اسے دیکھا تھا۔ بے قراری اس کے پورے وجود پہ حاوی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے مغرب کی نماز ادا کی، اور دعا مانگ کر، اندھیرے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس کی چال میں بے چینی کے روڑے اٹکتے تھے۔ جنگل میں پرندوں اور جینکروں کی آوازیں ایک تسلسل سے جاری تھیں۔ اس کے قدم تیزی سے جنگلی بیلوں کو چھوتے اور پھر آگے بڑھ جاتے۔۔۔۔۔ درخت، اندھیرے میں لیٹنے لگے تھے۔ دن اب رخصت ہو رہا تھا۔ اور رات کی آمد آدھی۔ دن نے جاتے جاتے رات کو شران غنی کے ہمراہ رہنے کی تاکید کی تھی۔ اور رات استغہامیہ انداز میں سر ہلاتی اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ جنگل کے درخت گئے تھے اور ستاروں کی مدھم روشنی درختوں کی شاخوں سے جھانکنے کی سعی لا حاصل کر رہی تھی۔ مگر وہ شاخوں میں ہی الجھ کر رہا۔ اور دھڑکی کر رہی تھی۔ اک گہرا سکوت اور گاڑھا خوف تلخی میں گھلا ہوا تھا۔ جیسے ہر درخت پر لاتعداد غفریت براجمان ہوں۔ ان کا خوف جیسے فضا کا کھیر دہلائے جاتا تھا۔ رات کی بیانی میں چپکی تھی اور وہ اندھیرے میں گرتی پڑتی شران غنی کے ساتھ چل رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

احمر ضیا جنگل طے کر رہا تھا اس کے چہرے پر مساتوں کی گرد تھی۔ اور آنکھوں میں انتظار کی چمک میں لپٹا سورہا تھا۔ اس کی بصراتیں اس ایک چہرے کو دیکھنے

کی خواہاں تھیں۔ مگر وہ چہرہ تو گویا خواب ہو گیا تھا۔ ”تیرے چہرے کو تنکا بھی اب خواب سا لگتا ہے“ تیرا خواب میں ملنا بھی اب خواب سا لگتا ہے“ ہوتا ہے نا ایسا بھی۔۔۔۔۔ کہ جولوگ ہمارے دل کے بے حد قریب ہوتے ہیں، اس قدر قریب کے نہیں لگتا ہوتا کہ ہماری شرک ہم سے فاصلے پر ہے، مگر وہ نہیں، جو ہمارے وجود کا ایک ملزوم حصہ بن چکے ہوتے ہیں، جیسے دل، جیسے روح۔۔۔۔۔ وقت ان کو۔۔۔۔۔ ”ان کو“ ہم نے اس قدر دور کر دیا ہے کہ ان کا خواب میں ملنا بھی خواب سا لگنے لگتا ہے۔ یہ وقت بھی کتنا غالم ہے۔۔۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔۔۔ غالم تو یہ جذبات ہوتے ہیں۔ غالم تو امیدیں ہوتی ہیں جو ہم کسی سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ اب اگر دوسرا امیدوں پر پورا نہ اترے تو اس میں بھلا اس کا کیا قصور؟ اسے دفعتاً ٹھوکر لگی تھی۔ اور ٹھوکر ہمیشہ دفعتاً ہی لگا کرتی ہے۔ اگر پہلے سے کسی کو ظلم ہو جائے تو وہ ٹھوکر کھائے ہی کیوں؟ لیکن جو ٹھوکریں مقدر میں لکھ دی جاتی ہیں، وہ تو لگ کر ہی رہتی ہیں۔ خواہ ہم لاکھ پھونک پھونک کر قدم اٹھا سکیں مگر وہ پھر بھی لگ ہی جاتی ہیں کہ وہ ”مقدر“ ہوتی ہیں اور مقدر سے فرار ممکن ہی نہیں۔ درد کی ایک بے درد لہر گوار بن کر اس کے پیروں کے پنجوں سے لے کر سر تک اس کی رگوں کو کاٹتی چلی گئی۔ ضبط کی کوشش میں اس نے اپنا کچلا لب بری طرح چل ڈالا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرچشیں سی جبرگئی تھیں۔

”اتنا گھبرا کیوں گئے احمر ضیا؟ ایسی ٹھوکریں پتہ ہے، ہمیں کیوں لگتی ہیں؟ اس لئے کہ ہم اکثر غلط راہ پہ چل رہے ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں دکھوں کی، تکلیفوں کی ٹھوکریں اس لئے لگاتا ہے کہ ہم سیدھے راستے پر چل سکیں تاکہ اس درد کی ٹھوکر، اور ٹھوکر کے درد سے ہم ”حواس“ میں آ جا سکیں۔۔۔۔۔ اور غلط راہ چھوڑ کر صراط مستقیم اپنالیں۔۔۔۔۔“ بولنے والے کا لہجہ بے حد پرکشش اور کھویا کھویا سا تھا۔ احمر ضیا حیران تھا کہ وہ کون تھا اور اس کا نام کیسے جانتا تھا؟ اتنی سی بات پہ حیران ہو گئے؟



یہ دنیا تو حیرت کدہ ہے میرے دوست۔ اور حیرت کدہ تو حیران ہی کیا کرتا ہے۔ بہر حال، میرے پاس زیادہ وقت نہیں، چلو آؤ، میں تمہیں تمہاری منزل، یعنی سارہ ارشد تک چھوڑ دوں۔“ اس نے تمہم کھڑے احمر ضیا کا ہاتھ تھاما تھا۔

☆.....☆.....☆

سمندر بھرا ہوا تھا۔ لہریں وحشی ہو رہی تھیں۔ گویا ان کا سب کچھ چھن گیا ہو اور اب وہ سب سے ”سب کچھ“ چھین لینا چاہتی ہوں۔ سب کو ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ سب کچھ ”لوٹ“ لینا چاہتی ہوں۔ وہ بار بار پھنکارتی ہوئی ساحل سے آن کرانی تھیں۔ تیز ہوائیں بھی پاگل لہروں کا پوری طرح ساتھ دے رہی تھیں۔ ایک وحشت ناک شور تھا جو خاموشی کی ساعتوں کو چیرے جاتا تھا۔ بارش کی بوندیں تڑتڑا رہی تھیں۔ ہوائیں نکلوں سے بنی اس جھوپڑی کو بھی گرانے کے درپے تھیں۔ ان کی تندگی کے آگے وہ کمزور ہونے کے باوجود سر تانے لکڑی تھیں۔ خشک پتے اور ٹکے ہواؤں میں بے یار و مددگار بہہ رہے تھے۔ ججز اور یزی اس طوفان سے ہراساں تھے۔ رومان کے چہرے پر بھی قدرے تشویش اور فکر مندی کے آثار تھے۔ مگر سارہ جھوپڑی کی دیوار میں چنے بانس سے ٹیک لگائے بیٹھی کھوئی کھوئی سی تھی۔ یہ محبت بھی تو اسی طوفان کی طرح ہوتی ہے..... سب کچھ ختم کر دینے والی۔ اور جس کو محبت ”جلاؤ“ چکی ہو، اسے بیرونی طوفانوں کا کیا ڈر؟ محبت بڑی تباہ کن شے ہے۔ لوگ دیگر آفات سے پناہ مانگتے ہیں، کاش محبت سے بھی مانگ لیا کریں تو شاید ایک بھیا تک انجام سے بچ سکیں..... ساری رات طوفان جاری رہا۔ بادل گرتے رہے اور چنگھاڑتے رہے..... ہوائیں جنوں کے عالم میں ہر شے کو پس نہیں کرنے پر تلی رہیں اور..... سمندر اس ناگ کی طرح پھنکارتا رہا، جو چاروں طرف سے آگ میں محصور ہو گیا ہو اور محصور جگہ یہ بھی اٹکارے بیچے ہوں..... ٹوٹنے درختوں کے کڑا کے سنائی دیتے رہے..... بجلی بار بار

زبان نکال کر انہیں چاٹنے کو لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”ماہ شب!“ اس نے ایک عجیب وضع کے درخت تلے سوئی ماہ شب کو بے حد عقیدت سے پکارا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ اسے پانے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ مگر وہ اس سے محبت تو بہر حال کرتا ہی تھا۔ عشق، عقیدت اور پاکیزگی کی انتہاؤں کو جھوٹی محبت! اتنے دن بعد اسے دیکھ کر اس کی لاش نگاہ ”سیراب“ ہو گئی تھی..... اس کے ”بجھڑپن“ پر بارش ہونے لگی تھی..... ٹھنڈی، میٹھی اور روح نیک کو سرشار کر دینے والی بارش! ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم صدیوں پرہیز یا کائناتوں پر جلتے ہیں، ہزار ہا مصائب جھیلے ہیں، مگر جب منزل نظر آجائے تو سفر کی ساری صعوبتیں بل بھر میں بھول جاتی ہیں۔ وہ بھی لا تعداد مشکلات سے گزر رہا تھا۔ مگر..... ماہ شب اسے اتنی بھاری، اس قدر عزیز تھی کہ وہ اس کے لئے آخری سانس تک ایسی ہزار ہا مشکلات جھیل سکتا تھا۔ وہ بھی بنا ہی ملے کی تنہا کے..... شاید اس کی نگاہوں کی تپش تھی جو ماہ شب کی آنکھیں ایک ذرا سا کسمساں تھیں۔ پھر اس نے یکا یک آنکھیں کھول دیں۔ ”ماہ!“

”کون ہوتی؟“ وہ شران غنی سے پوچھ رہی تھی کہ وہ ”کون“ ہے؟

”مجھے نہیں پچھانا.....؟“ اس کے لہجے میں زمانے بھری شکستگی، صدیوں کی تنگی اور قیامت کی تڑپ تھی۔ اس نے اک ”آس“ کے عالم میں ماہ شب کی نیلگوں مال سبز آنکھوں میں اپنی ”پچھان“ بھی ان کی ایک ”آشنا“ نگاہ پر وار سکتا تھا۔ ان آنکھوں میں پچھان، یا آشنائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ صرف اجنبیت تھی اور کیسا لگتا ہے کہ جس ایک شخص کے لئے ہم پوری دنیا سے لڑے ہوں، اندھا دھند طوفانوں سے ٹکراتے ہوں، جس کی خاطر آپ لہو لہو ہو چکے ہوں، وہ آپ کو پچھانے بھی نہ.....؟ وہ انھی اور اس سے دور جانے لگی۔ شران گویا کرنت کھا کر ہوش میں آیا تھا۔ اس نے بے قراری

سے اسے پکارا تھا۔ ”ماہ!“

”تم یہ نہیں کون ہو؟ مجھے تنگ نہیں کرو۔ ورنہ ہری طرح پچھتاؤ گے۔“

”ماہ!“ اس کے لہجے میں سناٹوں کی وحشت سرخ رہی تھی۔ لیکن ماہ شب ایک دم غائب ہو گئی..... اسے لگا زمین اپنے مرکز سے ہٹ گئی ہے۔ اس کے وجود کو گویا کوئی آرے کے ساتھ چیر رہا تھا اور اس زخم زخم وجود میں نیزے اتارے جا رہے تھے۔ سورج ایک دم بچھ گیا تھا۔ ہر سو گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی تھی۔ سوائے منجمد سکوت اور مہیب سناٹوں کے کوئی احساس زندہ نہ تھا۔ اس نے اپنے لبوں کو اذیت سے کچلا تھا۔ اس اذیت سے کہ خون منوی کی صورت ابھرا آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

درختوں کے پتوں پہ دھوپ بکھری تھی، کئی درخت اپنی بڑی زمین سے باہر نکال لئے تھے، یعنی وہ اپنے قدموں کو قابو میں نہیں رکھ پائے تھے اور نتیجتاً ”ختم“ ہوئے تھے۔ ہم بھی کٹ ڈگنا جاتے ہیں۔ پھر..... پھر ہماری ذرا سی لڑا لڑاہٹ میں ایک بل میں، محض ایک بل میں زمین بوس کر دیتی ہے۔ پھر ہمارا بھی سب کچھ ”ختم“ ہو جاتا ہے۔ صرف ایک بل میں..... گھاس پانی میں ڈوبی تھی اور اس گدے پانی میں چنے اور چھوٹی چھوٹی شاخیں تیرتی پھرتی تھیں۔ کچھ بڑے درخت اور پودے بھی زمین بوس ہو کر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کئی پرندوں کے پر، پرندوں کے مردہ وجود اور مردہ پھیلاں تیر رہی تھیں۔ ”اے!“ ڈیر کی کی تحقیر آواز نے بھی کوساحل کی جانب متوجہ کر دیا۔ وہاں ایک موٹر بوٹ اپنی بڑی تھی۔ ”ایک ہی پل میں ان کی آنکھوں نے کی خواب دیکھ ڈالے..... امیدوں کا ایک جہان بل بھر میں ہی آباد ہو گیا تھا۔ یہ امید ہی تو ہے، جو ہر مشکل وقت کو مصائب اور آفات کے پہاڑ عبور کر دیتی ہے..... مشکل وقت میں ”جسم وقت“ کی امید..... اگر یہ نہ ہو تو زندگی کس قدر تکلیف دہ اور کریناک ہو جائے۔ بعض دفعہ ہمیں علم ہی ہوتا ہے کہ یہ

امید جھوٹی ہے..... محض خوش گمانی ہے۔ مگر ہم پھر بھی اسی کے تعاقب میں بھاگے چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ امید ہمارا سہارا ہوتی ہے..... اور ہم..... اسی سہارے کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ اور یہی امید اگر انسان کے بجائے اللہ سے وابستہ کر لی جائے تو بلاشبہ بھر وہ امید پوری ہوتی ہے..... کیونکہ اللہ فرماتا ہے کہ ”میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔“ سو ہم اگر اچھا گمان رکھیں گے تو یقیناً کامیاب ٹھہریں گے۔ وہ سب کے سب ساحل کی طرف لپکے تھے.....

☆.....☆.....☆

سورج بادلوں کے عقب میں تھا۔ لیکن اگر بادل اسے نہ بھی ڈھانپے ہوئے ہوتے، تو بھی جنگل کا وہ حصہ اتنا گھٹا تھا کہ سورج کی کرنیں جس گھنے درختوں کے سروں پر ہی ایک کر رہ جاتیں..... اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں مگر پھر بھی وہ چل رہا تھا۔ یہی زندگی ہے۔ ہم شل ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی چلے رہے ہیں۔ ہمیں چلنا ہی پڑتا ہے۔ ہم رک نہیں سکتے۔ اور اگر ہم رک بھی جائیں تو بھی زندگی تو چلتی ہی رہتی ہے..... لمبی تھوٹھنیوں والے بھیڑیے ایک دم ہی نمودار ہوئے تھے۔ ان کے تیز جارحانہ تھے اور رخ شران غنی کی جانب..... شران کے لبوں پر اس ”حافظ الخفیظ“ کا نام تھا جو ہر ایک کا ”حافظ“ ہے اور وہی ہے جو بلاؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ مدد نہ کرے تو پھر کوئی بھی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ صرف اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لئے تمام تعریفیں..... تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

بھڑپنے ایک دم اپنی جگہ ساکت ہو گئے..... ان پہ گویا بحر پھونک دیا گیا تھا۔ شران نے انہیں اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ اپنے قدموں پیچھے ہٹتے چلے گئے..... جب انسان سچے دل سے سیدھے راستے پر چلنے کا ارادہ کر لے تو پھر راستے کی ہر رکاوٹ بستی چلی جاتی ہے۔ راستہ صاف تھا۔ سو وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس جگہ درخت نہایت گھنے تھے۔ وہاں شام کا سماں تھا۔ درختوں پر



آخری جملہ اس نے اپنے محافظوں کے لئے کہا تھا۔ ”میری بات سنو“ وہ مضطرب ہوا۔ لیکن رنگا نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ اور بٹے کئے پھرے دار اسے ہتھیاروں کی زد میں لئے ایک اجنبی منزل کی طرف چل دیئے۔ اسے جس جگہ لے جایا گیا، وہ بھی غار کو تلاش کر بنایا گیا کمرہ تھا۔ اندر مشعل کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور شران وہاں گم صمی ماہ شب کود کچھ کر سناٹے میں رہ گیا۔ ساکت..... شل..... دم بخود..... تشدد..... کوئی تلاؤ کہ

اک عمر کا بچہ محبوب کہیں اچانک مل جائے تو کیا کہتے ہیں؟ ”ماہ.....!“ اس کی پکار میں صدیوں کی تنگی اور صدیوں کی تڑپ تھی۔ ماہ شب نے چونک کر اسے دیکھا..... لیکن اس کی سبزی مائل نیلگوں آنکھوں میں پچپان کی رقت تک نہ تھی۔ شناسائی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ”کون ہو تم؟“ ماہ شب نے کہا تھا اور شران غنی ساکت رہ گیا..... میں بس ایک بار لا جواب ہوا تھا۔

”کسی“ نے کہا تھا جب کہ کون ہو تم؟“ اسے اس پہل خود پہ بے پناہ ترس آیا تھا۔ اور ابن سمندر پر از حد غصہ..... ”ماہ! میں شران..... شران غنی!“ ماہ شب کے ذہن میں چمک سی لہرائی اور لمحے کے بھی خزاویں حصے میں معدوم ہو گئی۔ ”اب چپ کر کے بیٹھو۔ مجھے دیکھنے دو کہ ناگ منی ہے کہاں۔“ وہ غرا کر بولی۔ وہ بے یقینی کے حصار میں تھا۔ چند لمحے گزرے، اور پھر وہ زلزلہ بے کچھ بڑبڑائی، بے ہوش ہوا کہ ایک جھوٹا لہرایا..... اور..... وہ موتی..... وہ دودھیا موتی ماہ شب کے ہاتھ میں آ گیا..... ”ماہ.....!“ اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتا، ماہ شب موتی سمیت غائب ہو گئی۔ شران غنی سر پکڑ کر رہ گیا۔ اب کیا ہو گا؟ اندر چھاتی ”رات“ سہم کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج ایک بار پھر تھک ہار کر آنکھیں موند گیا تھا

”یہ میں ہوں رومان!“ رومان نے اسے بھجوڑا تو وہ ہوش میں آئی۔ جھوڑ اور ڈیری اسے مسکرا کر دیکھ رہے تھے..... وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اسے ایک دم غجالت نے آن لیا۔ انہیں کچھ دیر قبل پیش آنے والا واقعہ سنا کر وہ انہیں سمجھ کر گئی گویا ہوئی۔

”خبردار! جو آئندہ تم تینوں ایک ساتھ کہیں گے تو.....“

”مطلب یا نگ لائی واقعی پراسرار جزیرہ ہے۔“ ڈیری پر سورج انداز میں بولا۔ رات کا وہ نہ جانے کون سا پھر تھا جب سارہ کی آنکھ کھلی۔ وجہ شدید بیاس تھی۔ ابھی وہ انہی ہی تھی کہ بھاگتے قدموں کی آواز اسے بری طرح دہلا گئی۔ اس نے ذرا قافلے پر سوائے رومان کو چنگا ڈالا۔ ”اے..... کون ہو تم؟“ سانسے دو ہائے ایک دوسرے سے ستم گھاتے۔ رومان کی آواز سے ایک لمحے کو دونوں ٹھٹھے، پھر ایک سایہ تیزی سے بھاگ گیا۔ دوسرا رومان کی طرف پلٹا۔ ”تمہاری وجہ سے بھاگ رہی ہیں۔“ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی ہیں۔ ”اسی شکل سے قابو کیا تھا مگر.....“ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ عجیب جھپٹی سا شخص تھا وہ۔

☆.....☆.....☆

وہ اب بھی چل رہا تھا مگر اب کے اس کے قدموں سے تھکن کی زنجیریں لٹکتی تھیں۔ اور اس کے ارد گرد شیا نگ قبیلے کے لوگ اسے یقین پہنکی بار کی طرح ہتھیاروں کی زد میں لئے جارہے تھے۔ رانگی کی آنکھیں اسے دیکھ کر لہو رنگ ہو گئیں۔ ”ت..... تم..... تم.....“ غدار کی کی ہے۔“ وہ دانت نہیں کر بولا۔

”ہاں.....“ جب تم آب حیات لے گئے تھے تو پھر اس لڑکی کو کیوں بچاؤ گے؟“ شران کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا اور بڑی شدت سے دھڑکا تھا۔

”وہ کہاں ہے؟“ اس نے بے پناہی سے پوچھا۔

”رنگا سے ناگ منی حاصل کرنا آسان نہیں۔“ وہ لڑکی اس وقت ہماری قید میں ہے۔ لے جاؤ اسے بھی۔“

جنا سنگ میں مصروف ہیں۔ پہلے کچھ کھالیا جائے؟“ ڈیری کی گھاس پھوس سے بیٹھ گیا۔ اس ویران جزیرے پر وہ لوگ چونکہ زیادہ تر نارمل اور پھیلوں وغیرہ پر گزارہ کرتے رہے تھے۔ لہذا ان کے پاس کافی خوراک بچ گئی تھی۔ تنگ گوشت اور وائن ڈیری اور جھوڑے نکال لی اور سارہ اور رومان نے آلوؤں کے تیلے ہوئے تیلے اور اورنج جوس..... کھائے۔ سے فارغ ہو کر وہ آگے بڑھ گئے۔

شام ہونے پر انہوں نے ایک جگہ سے بھاڑیاں وغیرہ صاف کیں اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ”پانی ختم ہے۔“ جھوڑ کو اچانک یاد آ گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے وہ ایک تالاب کے پاس تھے۔ گزرے تھے لیکن اس وقت کسی کو بھی پانی کی کیا بی یادنی آتی تھی۔

”میں لاتا ہوں۔“ ڈیری اٹھا۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔“ جھوڑ نے سارہ اور رومان کی بولیوں بھی اٹھالیں۔ وہ چلے گئے تو خاموشی کا احساس مزید گہرا ہوا۔ تھکن حاوی ہونے کی وجہ سے ان پہ فقاہت طاری تھی۔ سارہ کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ غنودگی کی کیفیت میں ہی اس نے رومان کی آواز سنی تھی۔ ”جھوڑ اور ڈیری کو گئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ میں ان کا پتہ کرنے جا رہا ہوں۔“ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں غنودہ سی ”ہوں“ کر کے رہ گئی۔ چند لمحے خاموشی کی اوٹ سے گزر گئے۔ سارہ کی آنکھیں کسی کی گھٹی گھٹی سی کراہیں سن کر کھلی تھیں اور سامنے کا منظر اس کا خون خشک کر دینے کو کافی تھا۔ سامنے موجود درخت کی شاخوں سے ایک شخص الٹا لٹکا تھا اور اس کا سر گردن سے غائب تھا۔ سارہ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کر گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ منظر تو کیا سرے سے درخت ہی نہیں تھا۔ وہ لرزتے دل کے دل ساتھ رہ گئی۔ اچانک ایک ہاتھ پشت سے اس کے شانے پر آنکھ پڑا۔ وہ آنکھیں بند کر کے چلانے لگی۔

پرندوں نے شور مچا رکھا تھا۔ مگر پرندوں کی آوازیں بھی سنانے کے سحر کو کم نہ کر پاری تھیں۔ وہ آگے بڑھتا گیا وہاں ٹھنڈک تھی۔ زمین نم..... خشکی کا احساس قوی تر تھا اور دشت عجیب راگ الاپتی تھی۔ ایک شخص اچانک اس کے راستے میں حائل ہوا۔ ”اب کہاں کا ارادہ ہے۔“ لمحہ بھر بعد شران نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی تھا جس نے پہلے بھی اسے شیا نگ قبیلے میں جانے سے روکا تھا اور پھر اسے راستہ بتایا تھا۔ ”شیا نگ قبیلے.....“

”اگر تم ایک بار موت کے منہ سے نکل آئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر بار ہی بچ جاؤ گے۔“ وہ ترشی سے گویا ہوا تھا۔ ”موت جس جگہ، جس مل لکھی ہے، اسی بل، اور اسی جگہ آئے گی۔“ شران مسکرایا۔ وہ کرخت صورت سمجھ رہا اور پھر مسکرایا۔ گاؤ بیٹیں پو..... پھر وہ ایک دم اچھلا اور وہیں بندروں کی سی پھرتی سے ایک درخت سے دوسرے پر ہوتا ہوا اس کی نظر کی حدود سے اوجھل ہو گیا۔ شران نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی میں تھکن کا نام و نشان نہ تھا.....

☆.....☆.....☆

کشتی تیار تھی۔ ان سب کے چہرے حیرت و خوشی کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر گل رنگ ہو گئے تھے۔ ”آزادی!“ چیز ہی ایسی ہے۔ جھوڑ آ کر کشتی پر بیٹھا، دیگر لوگ پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔ انجن کی غراہٹ ابھری، سمندر کی تھیلی پر کشتی نے ایک جھکول کھایا اور لہروں سے کھینچی آگے بڑھنے لگی۔ اس بار راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ بے زاری بھی سارہ کو ڈیری اپنی اپنی سیدی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا رہا..... پانچویں دن عرس کی ریٹنگ تھا سے کھڑے سارہ کی نگاہ نے ایک مانوس منظر کو دیکھا اور اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ”وہ..... وہ یا نگ لائی.....“ وہ بے ربطی سے چلا اٹھی۔ سامنے جانا پہچانا منظر تھا۔ گلے ملتے نارمل کے جڑواں بیڑا اور اوپر گہرا نیلا آسمان..... ٹھنڈے بھر بعد وہ جزیرے کے سینے پر قدم دھر چکے تھے۔ فضا پسنائے کا راج تھا۔ ”بھوک کے مارے میرے پیٹ میں بلیاں



اور رات نے اسے اپنی مہربان آغوش میں یوں چھال لیا تھا۔ جیسے خطرے کے وقت مرغی چوزوں کو اپنے پروں میں چھپالیتی ہے۔ وہ چاروں تک چکے تھے۔ لیکن انہیں گھنے درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے وہ رات بھر کے لئے پناہ لے سکیں۔ یوں کھلے میں سونا خطرناک تھا۔ دفعتاً گھاس میں کچھ چمکا تھا۔

”وہ کیا ہے؟“ رومان نے کہا۔ اور وہ سب اس سمت بڑھے۔ وہ جگہ چھری کی تھی اور اس وقت اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسی لئے پتھروں کے نیچے بنی دراڑیں کبھی کی گاہوں میں با آسانی آگئیں۔ دراڑ میں جھانکنے پر وہ کبھی حذر زدہ ہو گئے۔ نیچے، تہہ میں بڑی مائل نیلے پانی کی ندی رواں تھی۔ کالج ایسا شفاف پانی..... لہریں ہلکورے لیتی بہہ رہی تھیں۔ پانی کی تہہ میں، شفاف ریت پر چمکتے چھوٹے بڑے نیلے اور سبز ہیرے بہہ رہے تھے۔ ان کی چمک ٹھنڈی مٹی کی تھی وہ ہیرے کبھی تہہ میں بیٹھ جاتے اور کبھی سطح پر ابھر آتے۔ یکا یک زنائے کی آواز انہیں چونکا دیتی۔ ان کی نظریں تقریباً ایک ساتھ عقب میں پٹی تھیں۔ ایک کرخت صورت شخص ان کے سامنے گندی رنگت، گلابی مائل جینے ہوٹ اور شانوں سے نیچے گرے ہوئے بال..... ”اب دیکھو.....“ اس نے انہیں دوبارہ دراڑ میں جھانکنے کا کہا۔ جہز نے پلٹ کر جھانکا اور ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے انداز نے باقیوں کو حیران کیا تھا لہذا وہ بھی جھانکے بنا رہے۔ نیچے منظر اب بیکس تبدیل تھا۔ پانی کا رنگ سرخی مائل زرد تھا اور پیروں کی جگہ انسانی سر تیر رہے تھے۔ پوٹی پوٹی آنکھیں، پھولا ہوا گوشت جابجا کٹا بیٹھا تھا۔ وہ شا کڈ ہوئے اور پھر واپس پلٹے۔ ”ایسے ہزاروں ظلم ہیں یہاں۔ کبھی بھٹا ہر پرمٹ جانا۔ ظاہر ہمیشہ دھوکہ ہوتا ہے۔“ وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا۔

”آتم جہز.....“ اور پھر سب نے باری باری اس سے مصافحہ کیا۔ ”حشیش.....!“ وہ بے تاثر انداز میں بولا اور یکبارگی اچھل کر درختوں پر چھوٹا ان کی نظروں

آئی تھیں۔ ”جھینکس.....!“ رومان نے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“ حشیش کہہ کر آگے بڑھا۔ ان حالات میں ان کے پاس اس پر اعتماد نہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ اس کی تقلید میں بڑھ گئے۔ کھلے میں بارش کی پونڈیں ان کے سروں پر سنگروں کی طرح برس رہی تھیں۔ پانچ سے سات منٹ بعد وہ لوگ ایک جھونپڑی کے سامنے تھے۔ ”لاوا!“ حشیش نے پکارا تو اندر سے ایک نسوانی سایہ نکلا۔

”تم اور یہاں؟“

”ان لوگوں کو اندر لے جاؤ اور ہاں ان کا ایک ساتھی ڈھی ہے۔“ وہ بتا کر چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ ”اندر آؤ۔“ لڑکی انہیں اندر لے آئی۔ ان کے سردی سے کپکپاتے جسموں کو گرم فضا نے سکون دیا تھا۔ بیٹھ جاؤ۔ میں مرہم لگاتی ہوں، پھر کھانا کھانا۔“ شعل کی درویشی میں لڑکی کی رنگت دیکھ رہی تھی۔ وہ حسن و دلکشی کا راجہ تھی۔ خصوصاً اس کی بھوری آنکھیں.....

فلپاٹ مال مرہم اس نے ڈیزی کے شانے پر لپ کیا اور پھر کونے میں رکھی لڑکی کی باسکٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے انہیں چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نوکری ان کے سامنے رکھ دی۔ ”کھا لیجئے۔“ وہ آڑوٹنا پھل تھا۔ مگر اس کا ذائقہ سب سے ملتا جلتا تھا۔ ”اب تعارف بھی ہو جانا چاہئے۔“ ڈیزی پھل کو دانٹوں سے تڑ کر بولا۔ ”میرا نام لاوا ہے۔“ باقیوں نے بھی تعارف کروایا۔ ”آپ لوگ کتنے ہوئے ہیں اب سو جائیں، ہاتی بائیں مکمل ہوں گی۔“ اس نے چٹوں کی ایک چھوٹی چٹائی کوٹنے میں بچھا دی اور سارہ کو بلا کر کہا۔ ”ہم دونوں یہاں سو جاتے ہیں۔ ان تینوں کے لئے یہ بڑی چٹائی کافی رہے گی۔“ وہ سب بچھری دیر میں سو گئے۔ ”بارش رات بھر جاری رہی اور رات سردی سے کپکپاتی قطرہ قطرہ بھینکتی رہی۔“

اگلی صبح بڑی حسین تھی۔ پیر اور گھاس بارش میں نہا کر کھرہ پکے تھے اور پھولوں کی خوشبو ہوا میں لگی ہوئی تھی۔ لاوا نے قبوے اور مختلف پھولوں سے انہیں ناشہ

کروایا۔ وہ انہیں ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بتاتی رہی کہ اس کے تمام گھر والوں کو آدم خورد رخت کھا گیا تھا۔ ”اب آپ لوگ بتائیں۔ اس خطرناک جنگل میں کیوں آئے؟“

”میں شینگ قبیلہ کی جوانی اور زندگی کا راز جاننے کے لئے آیا ہوں۔ میرا کزن سمندر کا ذوق بن گیا اور میں.....“ ڈیزی نے بلا توقف کہا۔ ”شینگ قبیلہ؟ تو یوں کہو کہ تم مرنے کے لئے آئے ہو۔“ لاوا نے اسے گھورا پھر رومان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”میرا دوست شمران غنی اپنی ایک دوست کے ساتھ یہاں آ گیا تھا۔ میں اور سارہ اسے ڈھونڈنے آئے ہیں اور جہز کی کشتی پر.....“ رومان نے اسے سمندری طوفان کا بتایا۔ ”لیکن تم لوگ انہیں ڈھونڈو گے کیسے؟ اتنا بڑا جزیرہ ہے اور شاید تم لوگ جانتے نہیں کہ یہاں قدم قدم پر.....“

”لیکن بھی مشکلات ہوں، جس اللہ نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے، طوفان سے بچایا اور اس گمنام جزیرے سے نکالا ہے۔ وہی آئندہ بھی ہماری مدد کرے گا۔“ رومان کا لہجہ بے حد پرسکون تھا۔ ”اچھا تم لوگ جلتے ہیں۔“ وہ اٹھا تو سارہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ”میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جاؤں گی۔“ لاوا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆.....☆.....☆

سمندر پرسکون تھا اور اس کے سینے پر ابن سمندر لیٹا ہوا تھا۔ سورج کی کرنیں سمندر پر کھری تھیں۔ ابن سمندری نظریں جزیرے کی طرف، ساحل پر جمی تھیں۔ ان نظروں میں انتظار کی چیمیں تھیں۔ یکھتے وہ ”چیمیں“ سکون میں ڈھل گئی۔ وہ شہبازی مائل نیلے پانی پر چلتی آ رہی تھی۔ اس کا انداز بین یوں تھا کہ گویا وہ شخص زمین پر چل رہی ہو۔ اس کے قدموں تہہ البتہ پانی کی لہریں ہلکورے لیتی تھیں۔ ابن سمندر کے پاس آ کر وہ مودب انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے انا دایاں ہاتھ ابن سمندری کی طرف بڑھایا۔ اس کی ہتھیلی پر دو دھیا، بیضی موتی دھرا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور موتی بے



قراری سے چھپنا۔

”ہوں..... آج تیرا دن ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔  
”اب جاؤ..... اور پورے پانچ لائی میں موجود ہر  
جاندار کو ختم کر دو۔“ اس کی آنکھوں میں سفاکی اور لہجے  
میں سنگینی تھی۔ ”اوکے!“ ماہ شب نے سر خم کیا۔  
”تمہارے پاس ایک ہفتے کی مہلت ہے۔“

☆.....☆.....☆

وہ لوگ جنگل کے گھنے حصے سے گزر رہے تھے اور  
لاوا کی نظریں پھٹی جاتی تھیں۔ سامنے پھر تین جانور  
مردہ پڑے تھے۔ آج صبح ہی سے لاتعداد جانوروں کی  
پراسرار ہلاکت نے اسے تشویش زدہ کر ڈالا تھا۔ اور تو  
اور ڈیڑی بھی چلنے سے قاصر تھا۔ رومان اور جیمز اسے  
تھمپتے ہوئے چل رہے تھے۔ لاوا ایک شیر کو مردہ دیکھ کر  
رک گئی۔ ”حشیش.....!“ اس کی حرکتی آواز جنگل میں  
دور دور تک گونجی تھی..... ”حشی..... یی..... شش  
ش!!“ اس کی دوسری پیکار کی بازگشت ابھی فضا میں معلق  
تھی جب درختوں پر جمولتا حشیش نمودار ہوا۔ ”کیا  
ہے؟“ انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ وہ سامنے زمین پر گرا  
اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے؟“ لاوا نے مردہ شیر  
کی طرف اشارہ کیا۔ حشیش کا چہرہ ضبط کی شدت سے  
سرخ پڑ گیا۔ ”میں خود حیران ہوں۔“

”وشال سے پوچھا؟“ لاوا نے لب کچلے۔  
”نہیں، اب جاتا ہوں۔“

”یہ وشال کون ہے؟“ جیمز نے پوچھا تھا۔  
”وہ ایک تارک الدنیا ہے۔ ہندوستان سے آکر  
یہاں آباد ہوا ہے۔ اور اس کے پاس کافی شکلیات ہیں۔  
اسے کسی بھی شخص کا نام بتادیا جائے، وہ اس کے بارے  
میں بتا دیتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔“ لاوا  
نے بتایا۔ ”تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“ سارہ نے  
ایک ایک فیصلہ کیا۔ رومان نے تائید کی۔ ”وہ کافی دور رہتا  
ہے۔“ حشیش نے آگاہ کی اور وہ سامنے اچکا کر رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

نعت زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے؟

لاکھ گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے  
بیض آتے ہیں راہ عشق میں جو ختم مقام  
آنے والوں سے کہو، ہم تو گزر جائیں  
گے.....!

جھاڑیوں اور بڑوں سے ان کے چہرے بار بار الجھتے  
تھے۔ تحکین انہیں شل کر چکی تھی، مگر منزل ابھی دور تھی اور  
منزل کی چاہ مسلسل آگے بڑھنے پر اکرائی جاتی رہتی ہے۔  
”مجھ سے توب اور نہیں چلا جاتا۔“ ڈیرین ہلانتے ہوئے  
پیٹھ گیا۔ ”چلو کچھ دیر سستالیتے ہیں۔“ حشیش نے کہا اور  
باقی سب جیسے فقط اس بات کے انتظار میں تھے۔ دھب  
سے بڑھ گئے۔ سب نے باری باری پانی پیا اور پھر لیٹ  
گئے۔ ”مردوں شروع ہی سے اسی جنگل میں رہتے  
ہو؟“ جیمز نے پوچھا۔ ”میں تو شروع ہی سے یہیں  
ہوں۔ البتہ اس کے بارے میں خود بھی نہیں جانتی۔“  
لاوا بولی۔ اس جگہ درخت اتنے گھنے تھے کہ دھوپ کی  
کرتیں نہیں کہیں اور پردرختوں کے سردوں پر ہی انکی تھیں۔  
جنگلی کا احساس گہرا تھا۔ ”میں نے تمہیں ہی ہوں۔“ سارہ  
نے کہا اور ان سے قدرے دور ایک گھنے درخت کی  
اوٹ میں جا کر لیٹ گئی۔ تحکین سے اس کا برا حال تھا۔  
”یار! تم تو ثمران کے دوست ہو، اس لئے اسے  
خطرناک جنگل میں اسے ڈھونڈنے آئے ہو، مگر یہ  
لڑکی؟“ حشیش کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ”یہ محبت  
کرتی ہے اس سے۔“ رومان نے ایک طویل سانس  
لی۔

”کیا؟ صرف محبت کے لئے یہ اس قدر خطرناک  
جنگل میں.....؟“ حشیش کی حیرت قابل دید تھی۔  
”محبت“ صرف“ نہیں ہوتی حشیش!“ لاوا کا لہجہ مدہم  
تھا۔ ”ہاں محبت صرف ہی نہیں، کچھ بھی نہیں ہوتی۔ یہ  
محض ایک لفظ ہے۔ ایک کھوکھلا لفظ۔“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔  
”تم یہ کہہ کر محبت کی توین کر رہے ہو۔“ رومان نے  
رسانیت سے کہا۔ ”نفرت ہے مجھے اس لفظ سے.....“  
اس کے لہجے میں آگ ہی آگ تھی۔ ”اچھا، چھوڑو

ہمارے میں بتاؤ۔“ رومان نے بات بدل دی۔  
”یہ سو گیا تھا اور جیمز چپ بیٹھا تھا۔“ اپنے بارے میں  
پتاؤں؟“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ”سب  
.....“ جیمز نے لب کشائی کی۔ ”اچھا..... بتاتا ہوں۔“  
اس کی ہجوری آنکھوں میں کرب کر دیش لینے لگا۔

☆.....☆.....☆

رات بڑی سرد اور بے حد تاریک تھی۔ چاند تو  
لہا آسمان پر ستارے تک نہ تھے انہیں گھنے بادلوں  
نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جھینگروں اور دیگر حشرات  
ارض کی آوازوں کے باوجود ایک سکوت مستقل  
ہلکا تھا۔ سنائے کافسوں بڑا گہرا تھا۔ گاہے بہ گاہے  
کوئی نہ کوئی درندہ دھاڑ اٹھتا تو سنا کسمسا کر ہاتھ  
الوں پر رکھ لیتا۔ سرد ہوائ بھنگی لئے وحشتانہ انداز  
میں لیرن پھرتی تھی ایسے خوفناک موسم میں ایک شخص  
کسی نے کوشا نہ یہ دھڑے کسی جانے پناہ کی تلاش  
میں تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بارش شروع ہونے سے  
قبل وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچ جائے اور اس کی یہ  
خواہش غیر فطری تو نہیں تھی۔ بچا اپنی تو تلی زبان میں  
لہہ ہارے کہتا تھا۔ مال پاش جانا ہے۔“ اور وہ سنگین  
الامات سے یکسر انجان معصوم بنے کو لب بھی نہ دے  
اتا۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار تھا ایک رحم دل اور منصف  
سردار..... اس کے چچا زاد بھائی زومبا نے اس کے  
کلاف سازش کی۔ وہ زومبا جسے اس نے ہمیشہ سکا  
مائی سمجھا تھا جس پر اسے اعتماد تھا اور ایسا تو ہمیشہ ہی  
ہوا کرتا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے کہ جن پر اعتماد  
ہوتا ہے وہ اس اعتماد کا گلا خود اپنے ہاتھوں گھونٹ دیا  
کرتے ہیں۔ زومبا نے اس کی بیوی زونیک کو قتل کر دیا  
اور اس کا خون خود اس کے چہرے پر مل دیا۔ ”سردار  
لے اپنی بیوی کو مار کر کھالیا۔ یہ آدم خور ہے۔“ زومبا  
نے چلانے پر وہ بڑبڑا کر جاگا۔ زونیک کی پچی لاش  
انڈر اپنا خون آلود لباس دیکھ کر وہ ساکت رہ گیا۔ کچھ  
دیر میں پو پقبیلہ اکٹھا ہو گیا۔ ”میں نے اسے نہیں  
لہا۔“ وہ چلاتا رہا مگر..... قبیلے والے تو اس کے خون

آلود ہاتھ اور لباس دیکھ رہے تھے۔ ”اس کی سزا موت  
ہے صرف موت.....“ اور اس کے حواس فیصلہ سن کر  
جمع ہو گئے۔ اس نے جھپٹ کر اپنے بیٹے کو اٹھایا اور  
بھاگ نکلا۔ اسے علم تھا کہ اس کے بعد اس کے بیٹے کو  
بھی مار دیا جائے گا۔ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا تھا مگر  
قسمت..... کہ وہ ان سے بچ نکلا۔ اس قبیلے کی حد سے  
نکل کر اب وہ کوئی محفوظ مقام تلاش کر رہا تھا۔ وہ پچھلے  
دو دن سے مسلسل سفر میں تھا۔ رات کو تھوڑی دیر  
ستانے کے علاوہ..... اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ  
رہے تھے۔ وہ آنسو زومبا کی سازش کے بھی تھے، اپنی  
محبوب بیوی کی ہمیشہ کی جدائی کے بھی اور اپنے بیٹے کی  
محروری کے بھی..... اسے بالآخر ایک خستہ حال  
جھوپڑی دکھائی پڑی۔ وہ بلا توقف اندر چلا گیا۔  
جھوپڑی خالی تھی۔ اس نے کونے میں رکھی خشک  
گھاس کو زمین پر بچھایا اور بچے کو اس پر لٹا دیا۔ رات  
دبے پاؤں گزرتی۔ اور پھر بہت سارا وقت گزر گیا۔  
وقت کا تو کام ہی گزرتا اور گزرتے چلے جاتا ہے۔ بنا  
رکے، بنا سستائے، حتیٰ کہ پلک تلک جھپکے بنا بس  
گزرتے ہی جاتا..... وہ ضروریات زندگی میں لگا رہا۔  
وہ قبیلے والوں کو سچائی بتا کر مرنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں سے  
انتقام لے کر مرنا چاہتا تھا۔ مگر زندگی نے اسے مہلت  
ہی نہ دی۔

وہ بھی ایک طوفانی رات تھی۔ ہوائیں چٹکھاؤتی  
تھیں، بادلیاں گرجتے تھے اور بارش موسلا دھار..... بنا  
رکے جاری تھی۔ وہ نڈھال سالیٹا تھا اور اس نے جان  
لیا تھا کہ اس کا وقت آخر آن پہنچا۔ اس نے کھانسیے  
ہوئے اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو پکارا۔ وہ آیا تو اس نے  
اسے پانی لانے کا کہا۔ بیٹے نے پانی کا پیالہ اس کے  
منہ سے گادیا۔ پانی پینے کے بعد وہ بولا۔ ”میں اب  
نہیں بچوں گا۔ مگر بیٹا! مجھ سے وعدہ کر کہ تم زومبا سے  
بدلہ لو گے۔ اپنی ماں کے قتل کا بدلہ، اپنے مجبور، بے گناہ  
اور بے بس باپ کے خلاف سازش کا بدلہ“ اس کی  
آنکھوں میں انتقام اور نفرت کی تاریکی آگ تھی۔ ”میں



خوفناک کہانیاں 134 مئی 2018ء



میں حائل تھے۔ پھر ایشا نے اسے دیکھا اور ہنسی۔  
اس نے نوجوان سے کچھ کہا تھا۔ نوجوان نے بھی رخ  
مڑ کر حشیش کو دیکھا۔ پھر وہ دونوں اس کی طرف  
بڑھے۔ ”میٹ مائی پریزنڈ میکس!“ اس نے نہایت  
اطمینان سے اس کے حواس پر ہم بھڑا تھا۔ دھماکہ بے  
حد شدید تھا۔ شدید ترین! خود حشیش بھی اسی لمحے  
چیتھڑوں میں ریزوں میں بکھر گیا تھا۔

”یہ سب کیا ہے ایشا؟“ الفاظ کا نٹوں کی  
طرح اس کے حلق میں چبھنے لگے۔ ”انتقام!“ ایشا کا  
اطمینان دیدی تھا۔

”انتقام؟“ وہ خاک نہ سمجھا۔ تم جانتے ہو میں  
کون ہوں؟“ ایشا نے سوال کیا۔

”کون ہو؟“ اسے اسی پل احساس ہوا تھا کہ وہ  
سامنے کھڑی لڑکی کو واقعی نہیں جانتا۔ جس کے بارے  
میں اسے دعویٰ تھا کہ وہ جانتا ہی صرف اسی کو ہے۔  
”زومبا کی بیٹی ہوں میں۔۔۔۔۔ پورے قبیلے کے سامنے تم  
نے میرے بابا کو کیسے سکا سکا کر مارا۔ میں ان دنوں  
اپنے شوہر میکس کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی گھونٹنے کے  
لئے۔۔۔۔۔ بابا کی موت کا سن کر میری جو حالت ہوئی۔۔۔۔۔  
تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ ٹھیک ہے انہوں نے سازش کی  
تھی، مگر معافی بھی تو دی جاسکتی ہے۔ خیر۔۔۔۔۔ جس طرح  
تم اپنے باپ کی موت نہ بھول سکے اور بابا سے انتقام لیا،  
اسی طرح میں بھی بابا کی موت نہ بھول سکی اور تم سے  
انتقام لیا۔“ وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے بول  
رہی تھی۔

”میں اگرچہ تمہاری جان بھی لے سکتی تھی مگر۔۔۔۔۔  
جان لینا میرے نزدیک کوئی انتقام نہیں۔۔۔۔۔ انتقام تو یہ  
ہے کہ دشمن زندہ رہے اور تڑپتا رہے۔“ وہ مسکرائی حشیش  
ساکت و صامت کھڑا تھا۔ کسی جیسے کی مانند شل۔۔۔۔۔  
ساکن۔۔۔۔۔ ”میں تمہیں ایسی اذیت دینا چاہتی تھی جس کو  
تمہارا جسم نہیں، تمہارا دل اور تمہاری روح محسوس  
کرے۔ تمہارے لئے موت نہیں، زندگی اذیت بن  
جائے۔۔۔۔۔ اور میں نے انتقام لے لیا۔“ تم ہمیشہ تڑپو

گئے۔“ اس کے گلابی لبوں پر فاقا تھانہ مسکراہٹ سج گئی  
میکس اس دوران خاموش کھڑا رہا۔ ایشا نے میکس  
ہاتھ تھاما اور پلٹ کر چل پڑی۔ پتھر کے بت میں بابا  
پیدا ہوئی اور وہ بے جان انداز میں گھٹنوں کے بل آ  
چلا گیا۔

☆.....☆.....☆  
دوبئی لمحے گھر پر پہن گئیں  
ایک تیرے آنے سے پہلے ایک تیرے جانے

کے بعد  
زندگی اس کے بعد میرے لئے بے حد مشکل  
ہوگئی۔ ایشا کو میں نے اس کے بعد پھر کبھی نہیں دیکھا۔  
خیر خود میں سٹ کر رہ گیا۔ بہر حال۔۔۔۔۔ وقت گزرتا  
گزر رہا ہے اور۔۔۔۔۔ گزرتا رہے گا۔“ وہ یاسیت  
مسکرایا۔ خاموش چپ چاپ ان کے پاس آن ٹھہری  
”اب چلیں۔۔۔۔۔“ خاموشی کے سحر کو حشیش ہی نے توڑا  
تھا۔ وہ اٹھی اور جگمگاتے انجیل کر چل پڑے۔ سارہ کو اس  
نے چکا چکا تھا۔ جگمگاتے سٹوٹس مرگ چھایا تھا۔ اور اس کا  
سحر گہرا تھا۔

☆.....☆.....☆  
اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک ہی شیبہ تھی،  
بصارتوں اور بصیرتوں پر ایک ہی چہرہ سا تھا۔ باقی  
منظر، ”پس منظر“ تھا۔ اور یہ کوئی عجیب بات تو نہیں۔

محبت نامی یہ جذبہ ایسا ہی زور آور ہوا کرتا ہے۔ اسے یہ  
ہرگز برداشت نہیں کہ کسی کی توجہ غلط بھر کو ہی سہی اس کی  
ذات سے، اس کے وجود سے ہٹے۔ یہ کسی اور سمت  
دیکھنے ہی نہیں دیتی۔ دل، نگاہ اور تمام توجہات ایک  
اسی کی ذات پر مرکوز رہتے ہیں۔ کسی اور سمت تنکا، فٹکا  
اک نگاہ ڈالنا بھی ”فکر“ کے زمرے میں آتا ہے۔

ایک کھٹکی کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔  
”تم؟“ مینڈو کو دیکھ کر اس کے لبوں پر پچھلی سی مسکراہٹ  
پھیل گئی۔ ”رنگا تمہیں قتل کروانے والا ہے۔“ مینڈو کا  
لہجہ بے قمر تھا۔

”اچھا!“ وہ مسکرایا۔ لہجہ نازل تھا۔ اب وہ

ہامنے موجود درخت کو دیکھ رہا تھا۔

”تم بھاگ جاؤ شام!“ مینڈو نے اسے جھنجھوڑ  
دیا۔ ”کیوں؟“ اس نے بے اثر انداز میں پوچھا۔  
”میں درخت کی انجھی شاخوں پر ایک سفید چڑیا آن  
گئی ہے۔“ ”رنگا تمہیں۔۔۔۔۔“ مینڈو نے بے بسی سے  
دیکھا۔

”بھلائی کوئی موت سے بھی بھاگ سکا ہے؟“ وہ  
پوچھ کر چڑیا کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے اسے درختی سے تھام  
کر اٹھایا۔ اس نے بنا چوکنے ان کو دیکھا۔ وہ رنگا کے  
ہاتھ تھامے۔ وہ بنا کسی مزاحمت کے ان کے ساتھ چل  
پڑا۔ سامنے ہی رنگا اور دیگر لوگ موجود تھے۔ آگ کا  
پت بڑا الاؤ جل رہا تھا۔ ایک درخت کے کھر درے  
میں سے ایک سفید فام جوڑا بندھا تھا۔ لڑکی نرم و نازک  
کی مرد لہبا ترنگا اور مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ ان  
دونوں کے چہرے دہشت کی زد میں آ کر ہلکی ہو رہے  
تھے۔ لڑکی کا سلا ہوا لباس اس کے ساتھ کی گئی بدسلوکی  
کا شاہد تھا۔

”چلو ہلادی نکالو ان کو۔ بہت بھوک لگی ہے۔“  
رنگا نے بے تابی کا مظاہرہ کیا۔ چند لوگ مرد کی رسیاں  
کھولنے لگے۔ صورتحال سمجھ کر وہ چلانے لگا۔ ”مجھے  
پھوڑو۔۔۔۔۔ خدا کے لئے مجھے پھوڑو۔۔۔۔۔ اس کا لہجہ بھرا  
گیا تھا۔ اور آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کی آواز میں  
محبت کا وہ عالم تھا کہ پتھر بھی پھسل جائیں۔ وہاں  
موجود لوگ ایسی صداؤں، منتوں اور التجاؤں کے عادی  
تھے۔ اور ان پر یہ کان نہ دھرنے کے عادی بھی۔ لڑکی  
اس کے لئے کھٹی کھٹی آواز میں رو رہی تھی۔ مرد نے  
چلائے ہوئے چار اطراف کو متلاشی نگاہوں سے  
دیکھا۔ اور ہر چہرے سے اس کی نگاہ کا ناکام۔۔۔۔۔ نشہ  
کام پلٹ آئی۔ پھر اس کی نگاہ شران غنی کے چہرے پر  
آ کے ٹک گئی۔ ”شران غنی کے تاثرات نے اسے اپنا  
لگا۔ پھر وہ محض اپنی قسمت آنڈانے کو بکارتھا۔“ میری  
مدد کرو۔ تمہیں تمہارے رسول محمد کا واسطہ۔ میری مدد  
کرو۔“ اس کی بات نے شران غنی کی روح تک کو جھنجھوڑ

ڈالا۔ اب اس کے لئے ”خاموش تماشا“ رہنا ممکن نہ  
رہا تھا۔ کسی صورت ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے ایک  
جھٹکے سے خود کو چھڑایا اور رنگا سے کہا۔ ”چھوڑ دو اسے۔“  
اس کے منظم لہجے نے رنگا کو متحیر کیا کہ کوئی اس سے بھی  
اس لہجے میں بات کر سکتا ہے؟ رنگا؟ ”تجربہ در تجربہ  
ہے۔۔۔۔۔ حد ہوگئی یعنی کہ۔۔۔۔۔ تم ہوش میں تو ہو؟“ رنگا غرا  
ہی تو اٹھا۔

”اسے چھوڑ دو۔“ اس نے اٹل لہجے میں اپنی بات  
دہرائی تھی۔ ”چھڑا سکتے ہو تو چھڑالو۔“ رنگا کے چہرے کی  
ککیروں میں چیخ بھرا آیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا کر  
گویا چیلنج قبول کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور  
جھپٹ کر مرد کو ان کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ لوگ  
اس پہ چل پڑے۔ ”غصہ روا!“ رنگا دھاڑا۔ سب لوگ مٹی  
کی موتوں کی صورت ایک دم ساکت ہو گئے۔ ”آج  
تمہاری موت لکھی ہے۔ یہ تو طے ہے کہ تم صرف یہ بتاؤ  
کہ تم کس کے ہاتھوں مرنا چاہو گے؟“ وہ بھی دیگر لوگوں  
کی طرح رنگا کو صرف دیکھے گیا۔

”بتاؤ! کس سے لڑنا چاہتے ہو؟“ رنگا کے پرکیر  
ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اور غرور لہجے میں کوٹ کوٹ کر  
بھرا تھا۔ لیکن وہ بے خبر تھا کہ غرور کتنا بھی بلند ہو، ہمیشہ  
ہوتا ٹوٹنے کے لئے ہے۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔!“  
شران بے ساختہ بول اٹھا۔ وہاں موجود لوگ بولنے  
لگے۔ ان کی آوازیں البتہ کھینوں کی جھنجھناہٹ سے  
شاب تھیں۔ چند لٹپٹے تک تو خود رنگا بھی کچھ بول نہ پایا۔  
پھر اس نے ہاتھ اٹھایا اور ہر آواز ایک دم ”مر“ گئی۔  
وہاں لا تعداد لوگ موجود تھے مگر ”لاموجود“ تھے۔

”آؤ! اس نے رنگی اٹھا کر شران کو آنے کا اشارہ کیا۔  
”موت جانا شران!“ اس کی ساتوں کو سینڈو کی  
مضطرب آواز نے چھوایا۔ لیکن وہ بنا پلٹ کر دیکھے، آگے  
بڑھا تھا۔ اور پھر سے دیکھے ”دن“ نے سنا کی انداز میں  
سوچا تھا کہ ”اگر ہم کسی کی مدد کر سکتے ہیں؟ کسی کی مشکل  
کو دور کر سکتے ہیں، تو لازماً کرنا ہی چاہئے۔ کہ اسی  
صورت میں ہم اللہ سے مدد کی امید رکھ سکتے ہیں اور



اگر..... ہم کسی کی مدد کر سکتے کی اہلیت رکھنے کے باوجود تجھ غوث سے سر جھٹک کر ”نہیے کیا؟“ کہہ کر آگے بڑھ جائیں، تو پھر ہم اللہ سے کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کرے گا؟ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے بڑی محبت کرتا ہے۔ ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت..... اور اس کے بندوں کو مشکل میں چھوڑنا اسے پسند نہیں۔ حدیث نبویؐ کا مفہوم ہے کہ روز محشر اللہ رب العزت فرمائے گا۔ ”اے بندے! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی، میں نے تجھ سے کھانا پانی مانگا۔ تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا کہ ”یا باری تعالیٰ! آپ رب ہیں، آپ کب بیمار ہو سکتے ہیں، اور آپ کو کھانا، پانی کی کیا ضرورت؟ آپ تو رازق ہیں، رزاق ہیں۔“ تب اللہ فرمائے گا کہ ”میرا فلاں بندہ بھوکا، پیاسا تھا، اگر تو اس کو کھانا کھاتا تو مجھے یعنی میری رضا کو اس کے پاس سے پاتا۔ اور فلاں بیمار تھا اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے یعنی میری رضا کو اس کے پاس پاتا۔“

☆.....☆.....☆

سکوت بڑا جاندار تھا اور ہر سو اس کی راجدھانی تھی۔ وہ لوگ سوختر تھے۔ ان کے قدم گھاس کو روند رہے تھے۔ اور سکوت..... ان کے قدموں سے ابھرتی آہوں کو روند رہا تھا۔ ”اب تم لوگ یہیں روکو۔ آگے صرف میں جاؤں گا۔“ حشیش کی بات پہ وہ بھی چونک اٹھے۔

”کیوں؟“ ڈیزی کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ ”آگے دلدل ہے۔ میں وشال کو یہاں لے آؤں گا۔“ اس کی نظریں ہرن کے بے جان وجود پہ گڑی تھیں۔ جنگل میں حیرت انگیز طور پر تمام جانور خاموش تھے۔ اس کی کثیر تعداد کو تو وہ لوگ مردہ دیکھ چکے تھے۔ شاید باقی بھی..... ایک نقصان زدہ، ناگوار یو دم اٹھائے دیتی تھی۔ وہ سبھی بار بار اٹکائیاں لیتے، مگر معدہ خالی ہونے کے سبب حالت وہی کی وہی رہتی۔ وہاں جنگل زیادہ گھٹا نہیں تھا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے آگے صرف یہی جاسکتا ہے۔“ لاوانے اس کی تائید کی۔

”جیسے یہ جانے گا، ویسے ہی ہم بھی چلے جائیں

گئے نا؟“ سارہ بے چارگی سے بولی۔ حقیقتاً وہاں پل بھر رکنا بھی عذاب تھا۔ سڑے ہوئے گوشت کی ایسی ناگوار بو فضا میں پھیلی تھی جو سانپوں کے راستے انہیں اندر سے ”کھائے“ جاتی تھی۔ ”اگر میری طرح آ سکتے ہو، تو آ جاؤ۔“ حشیش رو لہجے میں کہہ کر اچھلا..... اور درختوں کی شاخوں سے کودتا ہوا لہجوں میں اوجھل ہو گیا۔ اس کی مہارت اور بھرتی قابل دید تھی۔ ”کہاں ہے دلدل؟“ ڈیزی بیشکل اٹکائی روکتے بولا۔ ”یہ سامنے دیکھو۔“ لاوانے بتایا۔ وہاں بظاہر تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ مگر گھاس کی رنگت سیاہی پائی تھی اور زور دیکھنے پہ وہاں پانی دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ سا پانی..... اور زور دے کر اس پانی میں جھلنے سے چھوٹے دکھائی پڑتے تھے۔ سارہ گرنے کے سے انداز میں زمین پر نیچے پڑا۔ ایک کر کے کبھی بیٹھ گئے۔ وہ پچھلے چوہیں ٹھٹھوں سے تو مسلسل سفر میں تھے۔ رات کو خض آدھ گھنٹہ سنانے کے علاوہ..... ٹھٹھن سبھی کو بڑھال کر پکی تھی۔ مگر کراہیت انہیں بوسہ انہیں سونے نہ دے رہی تھی۔ لیکن کہا گیا ہے کہ نیند تو لی پڑھی آ جاتی ہے، تو ٹھیک ہی کہا گیا ہے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے سو گئے۔

ڈیزی ابھی غصہ کی تھی تھا، جاگی سوئی کیفیت میں، کہ اس کے پیر میں چین سی ہوئی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پانچویں ایک بہت خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ سرخ شرٹ میں لمبوں اس کا جسم کندھ کی مانند دک رہا تھا اور سنہری بال آنکھوں کے ہم رنگ تھے۔ ”ہیلپ می!“ اس نے عاجزانہ انداز میں کہا۔ ”میری سسٹر بیمار ہے۔ پلیز اس کو یہاں تک لانے میں میری مدد کرو۔ پلیز جلدی کرو۔“ اٹھو..... آؤ..... وہ مرجائے گی۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھی۔ ڈیزی میکا کی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میرے ساتھ آؤ..... جلدی۔“ اس نے قدم آگے بڑھائے، پل بھر کو رکی، پلٹ کر تصدیق کی کہ وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ اور پھر دوبارہ تاکید کی۔ ”کم آن..... ہری اپ.....“ اور ڈیزی مندی مندی آنکھوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا ذہن

خالی خالی سا سو رہا تھا۔ ذرا آگے جا کر اسے لگا کہ اس کے قدم جیسے کچھڑ میں جنس رہے ہیں۔ مگر اس نے غور نہیں کیا۔ غور اس نے تب کیا تھا جب کوشش کے باوجود اس کے قدم اٹھنے سے انگاری ہو گئے تھے۔ اس نے نیچے دیکھتے ہوئے پاؤں اوپر اٹھانے کی کوشش کی اور بھی ”ماؤنٹ ایورسٹ۔“

گویا آسمان سے لڑھکتا ہوا آیا اور دم سے اس کے سر پہ آن کر۔ اسے یکبارگی یاد آ تھا کہ یہاں..... یہاں تو دلدل تھی..... اس نے تڑپ کر برہنگا لے کر کوشش کی۔ مگر زمین نے اس کے پیر بری طرح جکڑ لئے تھے۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا..... لڑکی وہاں نہیں تھی..... لڑکی کہیں نہیں تھی..... وہ لمحہ بہ لمحہ گاڑی کچڑ میں دھنسا جاتا تھا۔

”بھاؤ..... بھاؤ.....“ وہ بری طرح چلانے لگا۔ اس کے ہاتھ کی ہڈ بڑا کر جا گئے..... لیکن جتنی دیر انہیں حواس جمع کر کے صورت حال سمجھنے میں لگی، اتنی دیر میں ڈیزی کے سر کے صرف بال باہر تھے۔ اور اگلے ہی لمحے وہ بھی ہمیشہ کے لئے غائب..... اس کے ساتھی سنانے میں رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

تاجہ نظر ریت کا سمندر تھا۔ جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ جیسے دنیا میں ریت کے سوا کچھ بھی نہیں..... یا پھر نقشہ جھاڑیاں اور چند ایک درخت..... وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ سوپ نیزوں کی صورت جسم میں پیچھ رہی تھی۔ بیسنہ جسم سے پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کے بال اور جھاڑ چمک کر کی ڈی وادھی بھی چھڑ رہی تھی۔ مگر اسے مطلق برداشت تھی۔ سارہ نماز پڑھ کر آئی تو وہ پھیکے سے انداز میں سر ادا کیا۔

”پڑھ لی نماز؟“ ”ہم م م..... آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ میرا مطلب ہے، باقاعدگی سے کیوں نہیں پڑھتے؟“ وہ دوپٹے سے چہرہ اور گردن کا پسینہ صاف کرتی، وہ بیٹھ گئی۔ ”بس.....“ وہ سر جھٹک کر رہ گیا..... ”میں

نہیں جانتا ہے؟“ ”کیسے جاؤں؟“ سارہ نے بے بسی سے ہاتھ سلے۔ ”جو ہمیں کھانا پہنچاتے ہیں وہ تمہیں گھر بھی پہنچا دیں گے۔“ لیکن وہ دکھائی کب دیتے ہیں؟“ سارہ نے ریت سے مٹی بھر لی۔

”وہ نہ کر آ جائیں گے یا پھر میں ردا کو بلوا لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔“ وہ سارہ کو ریت سے بھری مٹی خالی کرتے دیکھ رہا تھا۔ ریت ایک دھار کی صورت نیچے گر رہی تھی۔ ”السلام علیکم!“ آواز پہ وہ دونوں چونکے تھے اور دونوں ہی کے سر ایک ساتھ اوپر اٹھے تھے۔

☆.....☆.....☆

رنگا کی سرخ دھاتی آنکھیں شران کے بڑھتے قدموں پر جچی تھیں اور لمبوں پر فاختانہ مسکراہٹ جس میں استہزا کی گچی گچی تھی۔ بھلا کیا حیثیت تھی؟ شران غنی جیسے ایک حقیر انسان کی اس کے سامنے؟ اس جیسے ہزاروں لاکھوں اس کے آگے ”بہہ“ جاتے تھے۔ جیسے سیلاب کے آگے ریت کے ذرات..... ”شران غنی مستحکم قدموں سے چلتا اس کے عین مقابل آن ٹھہرا.....“ ”پہلے تم کرو اگر چاہو تو.....“ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

”شران! اس کی گردن دباؤ۔“ سینڈو کی چلائی آواز..... اور اس کے ہاتھ میکا کی انداز میں رنگا کی توانا گردن پر جم گئے۔ رنگا کی کھال کسی گینڈے کی طرح سخت تھی، تاہم وہ پوری قوت سے اپنی تمام تر توانائیاں یکجا کر کے اس کی گردن پہ دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ رنگا کی مسکراہٹ سمٹ گئی..... وہ اب خود کو چڑھانے کے لئے چل رہا تھا..... اسے اندازہ ہوا تھا کہ پہلی بار وہ دہشت زدہ ہے۔ ورنہ دہشت اور رنگا دو متضاد چیزیں تھیں..... اور پھر اس کی دہشت میں اس وقت اضافہ ہوا جب اسے احساس ہوا کہ وہ چاہے کبھی اپنی گردن چھڑائیں یا رہا..... شران کی گرفت لڑائی تھی۔ اس میں اتنی قوت نجانے کہاں سے آگئی تھی کہ وہ رنگا کی گردن پہ دباؤ بڑھاتا ہی جا رہا تھا۔ رنگا اب تڑپ رہا تھا اور اس کے ہاتھ پھڑ پھڑاتے ہوئے گردن چھڑانے کی کوشش



## پچاس ہزار قتل



میرے نزدیک یہ ایک ایسا جرم اور قتل تھا..... جو پچاس ہزار فوجیوں نے مل کر کیا تھا

صرف ایک شخص کو.....

یہ تو دنیا میں بہت سارے کھیل کھیلے جاتے ہیں اور وہ بھی بے حد مقبول ہیں۔ کرکٹ، ٹینس اور ہاکی وغیرہ کے کھیلوں میں ساری دنیا میں فٹبال بڑے ذوق و شوق سے کھیلا جاتا تھا۔ بے حد مقبول اور ایک طرح سے قومی کھیل کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ اس کے بعد کرکٹ، ہاکی، ٹینس اور بہت سارے کھیلوں نے جنم لیا۔ ہاکی اور ٹینس کے مقابلے میں دنیا میں کرکٹ کا کھیل بہت زیادہ مقبول ہوا۔ دن ڈے ٹیمر جب سے شروع ہوئے تب سے اس کی مقبولیت میں حد درجہ اضافہ ہوا۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی بہت سارے ممالک میں صرف فٹبال کھیلا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے

میں کوئی اور کھیل مقبول نہ ہو سکا۔ دنیا کے بہت سارے ممالک خصوصاً یورپ میں کرکٹ فٹبال کے کھیل پر فوقیت حاصل نہ کر سکا۔ امریکا میں بھی اس کھیل میں ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں لی گئی۔ جنوبی امریکا میں فٹبال کا کھیل بہت مقبول ہے اور اس ذوق و شوق سے کھیلا جاتا ہے جس طرح یورپ اور ہمسائہ ممالک میں دوسرے کھیل۔ اس کھیل کے جنون میں شامت غریب ریفری کی آجاتی ہے اس سے کوئی غلطی یا ناانصافی ہو جائے تو تماشا بین اس کا حشر فٹبال جیسا کر دیتے ہیں یعنی اسے فٹ بال کی طرح کھیلتے ہیں۔ پھر وہ میدان میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے سر پر ہیر

کر رہے تھے۔ اس کی سانس حلق میں پھنسی تھی اور باہر آنے کو تڑپ رہی تھی۔ مگر باہر آنے کا راستہ بند تھا..... سانس بے پیمبروں اور حلق کے درمیان اضطرابی انداز میں تڑپتے ہوئے بے قراری سے پکرا رہی تھی۔ ”وہ کبھی بے پیمبروں کی طرف لپکتی اور کبھی حلق کی طرف پلٹتی..... وہ بری طرح ہانپ رہی تھی.....

بلا آخر اس کی مضطرب مزاحمت دم توڑ گئی..... اور لمبے بھر بعد..... خود سانس بھی دم توڑ گئی..... وہاں سکوت تھا..... بوجھل سکوت..... سانس تک روک دیئے والا سکوت..... وقت بھی گویا ایسی جگہ قائم کیا تھا۔ ”یہ ختم ہو چکا ہے۔“ ٹمران کا شانہ ہلا کر سینڈو نے کہا تو ٹمران کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رنگا کا بے دم وجود ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گر کر ٹمران کی فراخ پیشانی عرق آلود تھی۔ تمام لوگ دم بخود تھے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ رنگا بھی مر سکتا ہے؟ وہ فاتح موت سے شکست کھا سکتا ہے؟ ٹمران نے زمین پر پڑے رنگا کے بے جان وجود کو دیکھا..... اس کی ابلی ہوئی آنکھیں باہر نکلی زبان اور جھلی رگت والا لکیروں سے پر چہرہ عجیب ہیبت ناک تھا۔ ”سردار مر گیا ہے۔“ رنگا کے قریب لوگ چلانے لگے۔ لیکن ان کی آوازوں میں غم کے بجائے خوشی تھی، آزادی کا احساس تھا۔ وہ لوگ جیسے پل بھر میں ان دیکھی ذخیروں سے رہا ہو گئے تھے۔ وہ لوگ عجیب ناقابل فہم آوازیں نکالتے ہوئے بے ہنگم انداز میں رقص کرنے لگے۔ بیشتر لوگوں کی آوازیں خوشی سے لرز رہی تھیں۔ رقص کرتا ایک ٹولہ آگے بڑھا اور ٹمران کو اٹھالیا..... وہ بس خیر تھا۔

☆.....☆.....☆  
رومان، سارہ جیمز اور لاوا کر ہناک نگاہوں سے دلدل کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں ہنسا مسکراتا ڈیزی ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا تھا۔ ”اسے پتہ تو تھا کہ وہاں دلدل ہے۔ پھر وہ وہاں کیوں گیا؟“ سارہ کی آواز غم سے بوجھل تھی۔ ”پتہ نہیں.....“ رومان نے لب کھلا..... ”وہ یہاں لائف واٹر کے لئے آیا تھا اور.....“ جیمز نے بات

کر رہے تھے۔ اس کی سانس حلق میں پھنسی تھی اور باہر آنے کو تڑپ رہی تھی۔ مگر باہر آنے کا راستہ بند تھا..... سانس بے پیمبروں اور حلق کے درمیان اضطرابی انداز میں تڑپتے ہوئے بے قراری سے پکرا رہی تھی۔ ”وہ کبھی بے پیمبروں کی طرف لپکتی اور کبھی حلق کی طرف پلٹتی..... وہ بری طرح ہانپ رہی تھی.....

بلا آخر اس کی مضطرب مزاحمت دم توڑ گئی..... اور لمبے بھر بعد..... خود سانس بھی دم توڑ گئی..... وہاں سکوت تھا..... بوجھل سکوت..... سانس تک روک دیئے والا سکوت..... وقت بھی گویا ایسی جگہ قائم کیا تھا۔ ”یہ ختم ہو چکا ہے۔“ ٹمران کا شانہ ہلا کر سینڈو نے کہا تو ٹمران کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ رنگا کا بے دم وجود ایک زوردار آواز کے ساتھ زمین پر گر کر ٹمران کی فراخ پیشانی عرق آلود تھی۔ تمام لوگ دم بخود تھے۔ کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ رنگا بھی مر سکتا ہے؟ وہ فاتح موت سے شکست کھا سکتا ہے؟ ٹمران نے زمین پر پڑے رنگا کے بے جان وجود کو دیکھا..... اس کی ابلی ہوئی آنکھیں باہر نکلی زبان اور جھلی رگت والا لکیروں سے پر چہرہ عجیب ہیبت ناک تھا۔ ”سردار مر گیا ہے۔“ رنگا کے قریب لوگ چلانے لگے۔ لیکن ان کی آوازوں میں غم کے بجائے خوشی تھی، آزادی کا احساس تھا۔ وہ لوگ جیسے پل بھر میں ان دیکھی ذخیروں سے رہا ہو گئے تھے۔ وہ لوگ عجیب ناقابل فہم آوازیں نکالتے ہوئے بے ہنگم انداز میں رقص کرنے لگے۔ بیشتر لوگوں کی آوازیں خوشی سے لرز رہی تھیں۔ رقص کرتا ایک ٹولہ آگے بڑھا اور ٹمران کو اٹھالیا..... وہ بس خیر تھا۔

☆.....☆.....☆  
رومان، سارہ جیمز اور لاوا کر ہناک نگاہوں سے دلدل کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں ہنسا مسکراتا ڈیزی ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا تھا۔ ”اسے پتہ تو تھا کہ وہاں دلدل ہے۔ پھر وہ وہاں کیوں گیا؟“ سارہ کی آواز غم سے بوجھل تھی۔ ”پتہ نہیں.....“ رومان نے لب کھلا..... ”وہ یہاں لائف واٹر کے لئے آیا تھا اور.....“ جیمز نے بات



مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب، ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت - 100 روپے

## ہیپاٹائٹس اور علاج

(کالابرقان)

پڑھئے ہیپاٹائٹس کیوں اور کیسے ہوتا ہے، جگر کی ساخت، جگر کا اہم کام، پوریا بننے کا عمل، ناکارہ خون کے ذرات، مفید عضو، ہیپاٹائٹس اور کینسر، جنسی علامات، مرض کی وجوہات، قدرتی نظام، گردوں کا عمل، ہیپاٹائٹس اے، اور ہیپاٹائٹس بی، ایلو پیٹھی اور ہومیو پیتھی علاج، ہیپاٹائٹس کا طبی علاج، دافع درد جگر، نسخہ دافع یرقان، نسخہ آملہ، شربت انار، عرق کاسنی، نسخہ آب آہن، تاب، خشک انجیر سے علاج، گردے کا درد، گردے کا درم، جگر پر درم، جگر میں گرمی، یرقان (پیلیا)، زیادہ پیتھاب آنا، گردوں کے نقص، جگر میں درم کے لئے، تلی کا رائے سے علاج، تلی بڑھنا، تلی کا درم، آک سے یرقان کا علاج، امراض گردہ مثانہ کے چند نسخے، دن میں صرف دو بار کھائیے، دن میں آٹھ گلاس پانی پینا ضروری ہے، روزانہ پندرہ منٹ ورزش کریں، حفظان صحت کے 39 اصول، اور دیگر معلومات اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی  
ارشد بازار  
Ph: 32773302

رکھ کر بھاگتا ہے۔ تماشیوں کی یہ جذباتیت ریفری کا ایسا شکر کر دیتی ہے کہ وہ آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا ہے۔

یہ بات بہت پہلے ہی سے میرے علم میں تھی لیکن اس کا اندازہ جنوبی امریکا کی اس چھوٹی سی ریاست میں آکر ہوا جہاں میں اپنے ایک کاروبار کے سلسلے میں آیا ہوا تھا یہ بڑی حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات تھی کہ لوگ ریفری سے ایسی شدید نفرت کرتے تھے جیسے وہ کوئی عفریت ہو۔ مجھے تو وہ ایک مظلوم مخلوق کی طرح لگتا تھا حقیقت میں ایسا تھا بھی لیکن تماشا کی اپنی نفرت کے سبب اس پر ظلم کرنے کے لئے آخری حد تک چلے جاتے تھے۔ وہ صرف اپنی تسکین کے لئے اس غریب کی جتنی مٹی پلید کر سکتے تھے ختم کر دیتے تھے۔

میں آپ کو جنوبی امریکا کی اس چھوٹی سی ریاست کے بارے میں بتا رہا ہوں جو نہ صرف اس ریاست کا دارالحکومت تھا بلکہ اپنے عالی شان قنصل اسٹیڈیم کی وجہ سے امریکا اور یورپ میں بھی بے حد مشہور تھا۔ سیاح لوگ اس اسٹیڈیم کو دیکھنے آتے تھے اس اسٹیڈیم میں اتنی وسعت تھی کہ اس میں ایک لاکھ تماشا کی محفوظ ہو سکتیں اتنی گنجائش کے اسٹیڈیم شاید وہ ایک ممالک میں ہوں۔ یہ شہر سمندر سے دو میل کی بلندی پر واقع ہوا تھا عام طور پر اس کا موسم خوشگوار ہی رہتا تھا لیکن جن دنوں وہاں میرا قیام تھا موسم بہار اپنے پورے شباب پر تھا لوگ اس سے ہر طرح محفوظ ہو رہے تھے لیکن ان کے سینے میں ایک ہی بات گڑی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ جس شخص کو دیکھو اس کا ایک ہی موضوع ہے وہ اس بات پر ہے حد تک اور چند باتوں اور شام کی تھا کہ بڑی ملک کی قنصل ٹیم نے گزشتہ سال قنصل میں اس ریاست کے خلاف جو کامیابی حاصل کی تھی وہ غلط امیازنگ کی وجہ سے تھی۔ اس لیے ان کی ٹیم جیتا ہوا بیچ ہارٹی تھی۔ ایک عام خیال یہ تھا کہ ریفری بکا و مال ہوتے ہیں اس لئے بڑی ملک ملک ارباب بست و کشادان کے خمیر کو منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ اس کھیل کی ہار جیت میں

میری اس سے اس لیے بھی ملاقات نہ ہو سکی تھی







تورنفری نے کھلی بے ایمانی کی ہے اسے کیا ضرورت تھی بلاوجہ کارزدینے کی۔

”ہمارا اعتراض ریفری پر کیا ہے؟“ اس نے جیسے اپنے طرف سے اپنی پوری قوم کی نمائندگی کی ”کاش! مجھے ریفری کو شوٹ کرنے کا اختیار حاصل ہو میں اسے ابھی اور اسی وقت شوٹ کر دیتا“ اس کے لہجے سے یاسیت ٹپکنے لگی جیسے اسے ریفری کو شوٹ نہ کرنے کا بہت رنج ہو رہا ہو۔

اس وقت سورج کی آفتابیں شعاعیں بدن میں نیزوں کی طرح چھ رہی تھیں اور گرمی کی شدت تھی کہ ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی لیکن میں یہ سمجھ دیکھنے پر مجبور تھا اور پھر نہ جانے کیوں مجھے اس سچ میں دلچسپی سی پیدا ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس لمحے میرے دل کے ایک کونے میں عجیب ترنیں بلکہ ایک بے تکا خیال پیدا ہوا تھا اگر میں اس ریفری کی جگہ ہوتا؟..... میں اپنے اس خیال پر مسکرایا پھر میں دل میں سوچا کہ..... میں کیوں اس کی جگہ ہوتا؟ میں کوئی بے خبر نہیں تھا میں کبھی دولت کے پیچھے نہیں بھاگا تھا دنیا کی ساری دولت بھی میرے قدموں میں ڈال دی جائے تو میں وہ نفرت سینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا اس وقت جو ہزاروں نگاہیں اور زبانیں ریفری پر بارش کی طرح برس رہی تھیں اور پھر اس ریفری نے کھیل کی روح کو تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا تھا۔

پورے دو گول ہونے کے بعد مقامی ٹیم کو جوش اور غیرت آ گئی پھر انہوں نے اپنی حکمت عملی بدلی پھر متحد ہو کر انہوں نے بڑی تندہی بھری اور تیزی سے کھیلنا شروع کیا انفرادی کھیل کے بجائے اجتماعی کھیل پر انہوں نے توجہ دی اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے پاس سے کام لیا جس کی وجہ سے کھیل پر ان کی گرفت مضبوط ہوئی اور گیندان کے پیروں میں رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کی کوشش اور جدوجہد نے کامیابی عطا کر دی تھی انہوں نے آخر کار رہمان ٹیم پر اپنا گول کر دیا یہ ایسا گول تھا اور اس تیزی سے ہوا تھا کہ

ریفری کو گول دینا پڑا ریفری کے پاس اسے گول نہ دینے کا کوئی جواز بھی نہ تھا اس گول کے ہوتے ہی سارا اسٹیڈیم لرز اٹھا، تالیوں اور سیٹوں کے فلک شکاف ہوئے گونج اٹھا۔ تماشاخیوں کے چہروں پر رونق اور دم کی آ گئی۔

مجھے نہ جانے یک بہ یک کیا ہو گیا تھا کہ میں بھی مقامی تماشاخیوں کی خوشی میں شریک ہو کر خوشی سے پنا اٹھا تھا اس بات پر مجھے بھی سخت حیرت ہوئی تھی میں نے بھی اپنے اس خوشی کے جذبے کو کھینچے سے قاصر رہا تھا کھیل میں میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی موسم کی پروان

ریفری۔ پھر تماشاخیوں نے اپنی ٹیم سے دوسرا گول ہونے کی توقع وابستہ کر لی تھی اس گول کی وجہ سے انہیں امید ہو چکی تھی اور ان کے حوصلے بہت بلند ہو گئے تھے اور اپنی ٹیم کی کھلاڑی حوصلہ افزائی بھی کر رہے ان کا جوش و خروش کچھ حد سے زیادہ ہی بڑھ گیا تھا میں نے محسوس کیا کہ اسٹیڈیم میں موجود ایک لاکھ تماشاخیوں کی گہرائیوں سے کامیابی کی دعا مانگ رہے ہیں ان کی دعائیں مستجاب ہو جائیں تو یہ اہم الم اور رونگٹے کھڑا کر دینے والا واقعہ پیش نہ آتا۔

ہوا یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد میزبان ٹیم نے کپتان نے مخالف ٹیم کے سات کھلاڑیوں کو انتہائی چالاک اور خوبصورتی سے ڈانچ دیتے ہوئے گول کر دیا اس نے جس انداز سے گول کیا میں اپنے دل میں عرش عرش کر اٹھا تھا اتنا صاف ستھرا اور سیدھا سا دھاک گول تھا لیکن اسے ریفری نے گول قرار نہیں دیا اس نے اس کی وجہ یہ بیان کی کہ کپٹن کا ہاتھ بال سے لگ گیا تھا سارا اسٹیڈیم ہونگ سے گونج اٹھا لوگوں کا غصہ ناقابل برداشت ہو گیا تھا وہ بے حد جذباتی ہو گئے اس قدر اشتعال پھیل گیا کہ وہ میدان میں اترنے والے تھے پولیس کی بروقت کارروائی سے ایک شخص بھی میدان میں اتر نہ سکا پولیس نے بڑی خوبصورتی اور دانائی سے مشتعل تماشاخیوں کو سنبھال لیا تھا۔

دونوں ٹیمیں اپنی اپنی پوزیشنوں پر واپس چلی گئی میں میدان کے درمیان میں صرف گیند اور ریفری رہ گئے تھے تماشاخیوں کی نعرے بازی نے ریفری کو جیسے گھاس باختہ کر دیا تھا وہ ہونٹ ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑا رہا تھا کہ وہ بھاگنا چاہے تو کس سمت بھاگے اسے کس سمت بھاگنے میں آسانی ہوگی وہ تماشاخیوں کے انگوٹوں سے محفوظ رہ جائے گا اس نے یقیناً اپنے دل میں اٹھارہ کے لئے توبہ کر لی ہوگی۔

اجا تک فضا میں فوجی بگل کی تیز آواز گونجی پھر ہلکی فضا کو ایک دل خراش خاموشی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہر کوئی حیران و پریشان چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن پچاس ہزار فوجیوں کے سکون میں ذرہ برابر بھی لرز نہیں آیا تھا سنا اس قدر شدید تھا کہ باہر سڑک پر چلنے والے ٹریفک کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں چند تانیوں کے بعد دوسری مرتبہ بگل بجا تو اس کی آواز بہت تیز تھی اور ساتھ ہی تیز روشنی کا ایک جھپکا ہوا جیسے لاکھوں فلش بلب ایک ساتھ چمک اٹھے ہوں فضا میں جیسے ہر طرف کھلبلیاں کود رہی ہوں میرے منہ سے بگل گئی اور ہاتھ غیر ارادی طور پر آنکھوں پر آ گئے لیکن آنکھیں بند کرنے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں کے سامنے بھلبلیوں کا سلسلہ رقصاں ہے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میدان میں اسٹیڈیم کی گلیاں سے اب ایک زوردار دھماکہ ہونے والا ہے ایسا ایسا تیسری مرتبہ فوجی بگل کی آواز گونجی پھر روشنیوں کا جھوم ایک دم غائب ہو گیا میں نے ڈرتے ڈرتے اپنی آنکھیں کھولیں اس نل میں صرف چند چائے ہی لگے تھے بظاہر ہر طرف وہی ساں تھا گہما گہما تھی ہر شے اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی مجھے کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا تھا جب میری نگاہ میدان کی طرف اٹھی تو مجھ کو گہری کمی چند کھوں پہلے جہاں ریفری کھڑا ہوا تھا وہاں ایک سگتی ہوئی لاکھ کا ڈھیر پڑا تھا جس میں سے کثیف دھواں نکل کر فضا میں اٹھ رہا تھا خاصی دیر تک میری کھوپڑی میں کچھ نہ آیا لیکن جیسے جیسے میں نے اپنی عقل سے کام لیا شروع کیا

ویسے ویسے میرے ذہن میں بات آتی گئی پھر معتبر ذرائع سے میں نے جو معلومات حاصل کیں اس سے میری بات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس دہشت ناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی واردات جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی جانے کیوں اس پر یقین نہیں آیا۔

اکثر چھوٹے بچے باکٹ سازز آئینوں کو دھوپ کے رخ رکھ کر اس کا عکس لوگوں پر ڈالتے ہیں یہ ان کے لئے محض ایک کھیل ہوتا ہے اور اس کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے مجھے یاد ہے کہ میں نے اسکول میں اپنے استاد کو اپنی اس شرارت سے بہت تنگ کیا تھا جس پر میری خوب پٹائی ہوئی تھی۔ جس پر آئینہ سے عکس ڈالا جاتا ہے اس کی آنکھیں چند لمحوں کے لئے چندھیا جاتی ہیں یہی نل ریفری کے ساتھ بھی کیا گیا تھا پچاس ہزار فوجیوں کی بیسیوں میں جو پاٹ سازز کے آئینے تھے انہیں بڑے شدہ پروگرام کے تحت استعمال کیا گیا تھا۔ یہ ڈان فریٹڈ وکے احکامات تھے دوسرے بگل کی آواز پر تقریباً دو منٹ تک ریفری پر پاٹ آئینوں کے ذریعے سے سورج کی شعاعیں منسک کی گئیں ان کا خیال تھا کہ اس طرح ریفری تھوڑی دیر کے لئے اپنی بصارت سے محروم رہے گا اس طرح سچ کے اختتام یا وقفے کے فوراً بعد دوسرا ریفری آ جائے گا لیکن ان فوجیوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ زمین کے ایک مربع گز پر ایک منٹ میں ایک ہزار پاؤں پاور کی حرارت پڑتی ہے اس لیے جب پچاس ہزار آئینے ایک ساتھ سورج کی شعاعیں سیدی اس ریفری پر ڈالی گئیں انہوں نے ایک منٹ میں پچاس ہزار پاؤں پاور کی خالص حرارت ریفری پر منسلک کی تھی ایسی صورت میں دنیا کی کوئی حالت اسے راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہونے سے نہیں بچا سکتی تھی۔ ڈان فریٹڈ وہی واقعہ تھا کیونکہ وہ ایک بہترین سائنسدان تھا میرے نزدیک یہ ایک ایسا جرم اور قتل تھا جو پچاس ہزار فوجیوں نے نل کر کیا تھا صرف ایک شخص کو.....

☆



اب ہم کچھ نہیں کر سکتے آج ہم تینوں کو اپنے مام اور ڈیڈ کے ہاتھوں قتل ہونائی پر ہے۔  
اور پھر تینوں لڑکیاں مزید سزا سے بچنے کے لئے اپنی غلطی درست کرنے بھاگیں۔

ہوگا۔“ ہیوری نے مومو کا کو گھبراہوا چہرہ دیکھا تو سمجھا  
سے بولی۔

”کیوں کیا ٹائم ہو گیا؟“

”سارا سے پانچ بجے ہیں۔“ مومو کا نے بتایا۔

”کیا سارا نے پانچ ہو گئے اور تم اب بتا رہی

ہو۔“ سارا کی چلا آئی۔

”کیوں بھی اب نہیں کیا ہو گیا۔“ ہیوری نے

عجیب بے زار لہجے میں کہا۔

”ارے یا راسا وقت تک تو اسکول بند بھی

ہو جاتا ہے۔“ سارا نے کہا اور ان دونوں کو اپنے ساتھ

لے کر بھاگی۔ وہ تینوں مختلف جگہوں سے ہوتی ہوئی

اسکول کے بیرونی گیٹ تک پہنچیں تو دیکھا کہ وہ بند

پڑا تھا۔

”ارے نہیں یہ کیا ہو گیا۔“ مومو کا گھبرا کر چیخ

اور پھر تینوں لڑکیوں نے مل کر دروازہ کھولنے کے لئے

پوری ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ لیکن دروازے میں باہر

تالا پڑا ہوا تھا۔ اس لئے لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہ مکمل

سکاتیں غصے میں آ کر اسکول کو برا بھلا کہنے لگیں۔ لیکن

اب شور مچانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ ویسے بھی اسکول کا

دروازہ کل صبح تک کے لئے بند ہو چکا تھا اور ان کا یہ

اجتاج دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ تینوں لڑکیاں تھک ہار

کر پہلے تو ایک طرف بے شیخ پریشہ گئیں لیکن جب

سردی کے احساس نے ستایا تو اٹھ کر واپس اسکول کی

دسمبر کا مہینہ تھا۔ جاپان میں اس وقت  
ہائس میں ٹیپر پچر تھا۔ لوگ سردی سے بچنے کے لئے  
گرم کپڑے سوئٹر مفلر اور دستانے وغیرہ پہن کر  
گھروں سے نکلتے ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ اتنی  
سخت دھند کے باعث سڑکوں پر کار حادثے بھی  
ہو جاتے تھے۔ اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے  
تھے اسکول کی چھٹی کو آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ جاپان  
میں بچے صبح نو بجے اسکول کو نکل جاتے اور پھر پانچ  
بجے چھٹی ملتی۔ اگرچہ ابھی چھٹی کو آدھا گھنٹہ  
ہو چکا تھا۔ لیکن وہ تینوں سہیلیاں ابھی تک اسکول  
کے پچھلے حصے میں کھڑی آپس میں باتوں میں  
مصروف تھیں۔ وہ تینوں آپس میں بہترین دوست  
تھیں۔

جہاں اسکول میں وہ سارا وقت ایک دوسرے  
کے ساتھ لگی رہتیں وہیں وہ گھر جانے کے بعد بھی آپس  
میں چٹیک کرتی رہتیں۔ اس وقت بھی وہ تینوں آپس  
میں اٹھکیلیاں کرنے میں مصروف تھیں اس بات سے  
بے خبر کہ تمام اسٹوڈنٹس کب کا اسکول خالی کر گئے ہیں  
اچانک ہی مومو کا نے اپنی رست وایچ میں ٹائم دیکھا  
تو بولی۔

”دوستو! میرے خیال سے اب ہمیں  
لکنا چاہئے۔ زیادہ دیر ہوئی تو گھر والے پریشان ہوں  
گے اور ویسے بھی اسکول کا گیٹ بھی بند ہونے والا



اندرونی عمارت میں داخل ہو گئیں۔  
 ”لڑکیوں ہمیں اپنے گھر فون کر کے اطلاع  
 کر دینی چاہئے کہ ہم یہاں پھنس گئی ہیں۔“ موموکانے  
 کہا تو بیوری نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔  
 ”نہیں ہرگز نہیں اگر میرے گھر میں مام اور ڈیڈ  
 کو پتا چل گیا تو کہیں آج اسکول میں بند ہو گئی ہوں  
 صرف اس لئے کہ میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں ہانکنے  
 میں مصروف تھی تو وہ مجھ پر آئندہ کے لئے سختی کریں  
 گے اور تم لوگوں کے ساتھ ٹھونسنے پھرنے کی اجازت  
 بھی نہیں دیں گے۔ ایسا کرتے ہیں کہ بہانہ بنا دیتے  
 ہیں کہ ہم اپنی فلاں دوست کے ساتھ آج رات  
 گزرائیں گے اس کے گھر میں پارٹی ہے اور اس نے  
 ہمیں اچانک بتا کر سر پرانز دیا ہے امید ہے آپ  
 لوگوں کو برا نہیں لگے گا۔“ موموکا سمیت ساسی کو بھی یہ  
 بہانہ بھلا محسوس ہوا کیونکہ سچ بھی یہی تھا اگر واقعی وہ  
 اپنے مام اور ڈیڈ کو سچائی کا پتا چلے دیتیں تو آئندہ کے  
 لئے وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے۔ اور ان  
 پر پھر دوسرے کرتے وہ انہیں لاپرواہ تصور کرتے۔ اگر اپنی  
 دوست کے یہاں پارٹی میں ٹھہرنے کا بہانہ بناتیں  
 تو شامت بھی ان کی دوست ہی کی آئی تھی جو کوئی بھی  
 ہی نہیں۔ تینوں لڑکیوں نے یہی کیا گھر پر اپنی اپنی مام  
 کو اپنی کسی ٹیلی کے یہاں آج رات پارٹی میں ٹھہرنے  
 کا بہانہ بنا دیا ان سب کی مام کو حیرت تو ہوئی لیکن وہ بھی  
 بڑی بہانے باز تھیں ایک کے بعد ایک بہانہ کر کے  
 انہیں قائل کر رہی لیا۔  
 ”آہ اب کیا کریں۔“ موموکانے آہ بھرتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”اب کرنا کیا ہے۔ بیٹھو یہاں اور ایک دوسرے  
 کا منہ دیکھو۔“ ساسی نے منہ بسور کر کہا۔ بیوری نے ان  
 دونوں کی اتاری ہوئی شکل دیکھی تو فوراً سے بولی۔  
 ”ارے ایسے کیسے ایک دوسرے کا منہ  
 دیکھو یہاں پر کھوجنے کو بہت کچھ ہے۔“ اتنا کہہ کر بیوری  
 انہیں ساتھ لے کر اسٹاف روم کی طرف آگئی اور پھر وہ

تینوں اندر داخل ہو گئیں اور وہاں ٹیچرز کی فائلز،  
 اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ انہوں نے الماریوں کی الماریاں  
 خالی کر دیں اور پھر خود ہی اپنا پھیلا یا ہوا بلیئر اسٹینڈ  
 اس کام سے فارغ ہو کر وہ اسکول کی ساری کلاسز میں  
 باری باری جا کر وارنٹ بورڈ پر مار کر سے ہتھی رہیں۔  
 ٹیچرز غفلت ہوتے ہیں بیوری نے تو ڈھٹائی کی یہاں  
 تک حد کر دی کہ اپنے اسکول کے ٹیچرز کے لئے لکھا  
 فلاں ٹیچر مونی ہے نامعلوم کتنا لمائی ہے یا فلاں  
 ٹیچر مونی شیوں والا چشمہ پہنتا ہے نامعلوم اندھا  
 کیوں ہے۔ اور پھر سب سے آخر میں ساسی آگے بڑھی  
 اور بولی۔  
 ”اور دوستوں اب باری ہے فائلز بچ کی  
 ۔“ اتنا کہہ کر اس نے مارکر سے بورڈ پر لکھ دیا کہ تم  
 وقوف اساتذہ سوچتے اور کھوجتے ہی رہ جاؤ گے کہ  
 سب کس نے لکھا ہے لیکن کبھی جان نہ سکو گے۔“ موموکا  
 اور بیوری ہنسنے لگیں کہ کس پر۔ سر دیاں زیادہ تھیں ان  
 لئے ڈرائی دیں میں آسان پرانہ پیرا لکھا گیا۔  
 ”یار بیوری ساسی بہت زور دلوں کی بھوک لگی۔  
 اب کیا کریں۔“ موموکانے اپنا پیچہ پکارتے ہوئے  
 کہا۔  
 ”یہ تو براہم ہی کوئی نہیں ہے چل کر سینیٹ میں  
 کچھ کھانے کو ڈھونڈتے ہیں۔“ بیوری نے کہا تو موموکا  
 اور ساسی کے پیچھے ہوئے چہرے ایک دم سے جیسے روشنی  
 سے چمک اٹھے اور پھر وہ تینوں اسکول کی کینٹین میں پہنچ  
 کر فریج میں سے مختلف چیزیں نکال کر کھانے لگیں  
 چائے بنانے کا سامان بھی کچن میں موجود تھا انہوں نے  
 اپنے لئے گرم گرم چائے تیار کی اور پینے لگیں۔ پھر وہ  
 واپس اپنی کلاس میں آ گئیں۔ تینوں ساتھ ساتھ کرسیوں  
 پر براجمان ہو گئیں ابھی وہ کوئی بات کرتیں کہ باہر سے  
 بچی کڑکنے کی آواز سنائی دی۔  
 ”گلتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے۔“ ساسی نے  
 کہا۔  
 ”ہاں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ یاد ہے ناں ابھی

بارش دیر پہلے آسمان پر کتنی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی  
 موموکانے بھی جلدی سے کہا۔  
 ”ہائے لڑکیوں بھلا اب رات گزارنے کے لئے  
 آکریں۔“ بیوری نے پریشان سے لہجے میں کہا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ رات گزارنے کے لئے کوئی  
 ہی کھائی کھاتی کھاتی ہیں۔“ موموکانے کہا۔  
 ”بہت خوب تو پھر کون سنائے گا پہلی  
 کھائی۔“ ساسی نے خوشی سے جھپکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”میں سناتی ہوں۔“ بیوری جلدی سے بولی۔  
 ”اب رہنے بھی دو تم تو بالکل بورنگ کہانیاں  
 سناتی ہو۔ تم سارا مزہ خراب کر دو گی۔“ ساسی نے منہ  
 بند کر لیا۔  
 ”بھلا حرج ہی کیا ہے سن کر تو دیکھیں کہ بیوری  
 کس طرح سناتی ہے۔“ ساسی نے کہا۔  
 ”موموکا جلدی سے بولی۔  
 ”ٹھیک ہے تو پھر ایسے ہی سہی۔“ ساسی نے  
 اسے اچانک دیکھا۔ بیوری نے اپنا گلہ نکالا اور بولنا شروع  
 ہوئی۔  
 ”یہ کہانی ایک لڑکے کی ہے۔ اسے آسمانی جگہوں  
 سے بہت شوق تھا وہ جانا چاہتا تھا کہ آسمانی جگہوں  
 سے آسمان میں کتنی سچائی ہے اس کی یہی جستجو اسے ایک  
 دن ایک آسمان زدہ گھر تک لے آئی۔ جب وہ گھر میں  
 چلا ہوا تو اندر بہت اندھیرا تھا ایسے میں اسے کوئی آواز  
 سنائی دی اور نہ ہی اسے کچھ دکھائی دیا۔“ اتنا کہہ کر بیوری  
 زور سے ہنسنے لگی۔  
 ”بیوری تم بہت بدتمیز ہو۔“ ساسی چڑ کر بولی۔  
 ”معاف کرنا لڑکیوں میں تو یونہی مسکا لگا رہی تھی  
 کہ کہانی غیر سنائی نہیں آتی۔“ بیوری کی ہنسی نہیں بند  
 رہی تھی۔  
 ”چلو چھوڑو یہ سب موموکا تمہیں کوئی کہانی سناؤ  
 کہ کہانی بڑی اچھی سی ہونی چاہئے۔“ ساسی نے  
 موموکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ٹھیک ہے تو پھر میں سناتی ہوں لیکن یہ کوئی

کہانی نہیں ہے بلکہ ایک سچا واقعہ ہے۔“ موموکا  
 بولی۔ بیوری اور ساسی قریب ہو کر بیٹھ گئیں۔  
 ☆.....☆  
 حنا کا گاڑی میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ اس کا  
 موڈ کافی خراب لگ رہا تھا۔ اس کی مام نے اس کا اترا  
 ہوا چہرہ دیکھا تو بولیں۔  
 ”اب چلو بھی حنا تا کب تک یوں منہ بسورے  
 بیٹھی رہو گی۔“  
 ”خوش ہو جاؤ اب تم اپنے نئے اسکول جاری ہو  
 وہیں بنے ہاسٹل میں رہو گی۔ ذرا سوچو تو نئی جگہ نئی  
 سہیلیاں کتنا اچھا لگے گا۔“  
 ”پلیز مام ایک تو آپ یہ نئی جگہ والی بات رہنے  
 ہی دیجیے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں نئی جگہ کے  
 خیال سے کتنی اپ سیٹ ہوں۔“ حنا تا بری طرح  
 چڑ کر بولی۔  
 حنا تا کے والد صاحب کا نئی جگہ تبادلہ ہوا تھا وہ  
 سارا دن دفتر میں رہتے اس کی مام کی جاب بھی بڑی  
 مشکل تھی وہ بھی کام سے فارغ ہو کر رات گئے دیر سے  
 لوٹتیں۔ پیچھے حنا تا کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے  
 انہوں نے اسے ایک ہاسٹل میں داخل کر دیا۔ ہاسٹل  
 اس کے گھر سے کافی دور تھا۔ حنا تا نے بار بار کہا کہ انہیں  
 اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اکیلے بھی رہ  
 لے گی۔ لیکن اس کے مام اور ڈیڈ نے کہا کہ وہ ابھی  
 صرف سترہ سال کی ہے اس کا گھر میں اکیلے رہنا  
 مناسب نہیں ہے۔ لہذا حنا تا کی مام آج اسے لے  
 کر ہاسٹل جاری تھیں ہاسٹل کے برابر میں ہی اسکول کی  
 عمارت بھی تھی۔ کافی لمبی ڈرائیو کے بعد حنا تا کی مام  
 نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ یہاں آس پاس میں اسکول  
 اور ہاسٹل کی عمارت کے سوا کسی قسم کی کوئی دوسری  
 عمارت نہ تھی یہ ایک سنسان سی جگہ تھی جہاں تھوڑا بہت  
 سبزہ تھا اور اسکول کے عین سامنے سیدھے ہاتھ پر ایک  
 قدرتی جمیل موجود تھی۔ جمیل کا پانی نہایت صاف اور  
 شفاف تھا۔ وہ واقعی بڑی خوب صورت جمیل تھی۔



## بیماریاں بھگائیں

میکینیشیم کے بارے میں انکشاف ہوا ہے کہ غذا میں اس کا استعمال ذیابیطس اور امراض قلب سے بچاتا ہے۔ ایک سروے سے معلوم واپس ہے کہ اگر غذا میں میکینیشیم سے بھرپور کھانوں مثلاً ہرے پتوں والی سبزیوں، چھلی، پھلیوں اور اناج سے منہ موڑا جائے تو اس اہم دھات کی کمی سانس کے امراض، ذیابیطس، امراض قلب اور الزائمر کی وجہ بن سکتی ہے۔ چین کی زیگ زیو یونیورسٹی میں غذائیت کے ماہر ڈاکٹر ژو یزیان فینگ نے 1999ء سے اب تک ہونے والے 40 مطالعوں اور سروے کا بغور جائزہ لیا ہے جس میں 9 ممالک کے دس لاکھ افراد میں میکینیشیم اور مہلک امراض کے تعلق پر غور کیا گیا ہے۔ سروے سے معلوم ہوا ہے کہ جن لوگوں میں میکینیشیم کی کمی تھی ان میں دیگر افراد کے مقابلے میں امراض قلب کا خطرہ 10 فیصد، فالج کا خطرہ 12 فیصد اور ذیابیطس کا امکان 26 فیصد تک زیادہ تھا۔ سائنسدانوں کے مطابق روزانہ 100 ملی گرام میکینیشیم کا استعمال فالج اور امراض قلب سے محفوظ رکھتا ہے۔

(سنیل - عرکوٹ)

ورش کی خوشبو یہ سرد ہوا ہاں سرد ہوا۔ اسے اچانک ہی لپٹ لیا گیا کہ ہوا بہت سرد ہے وہ جمیل میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ جمیل کا پانی واقعی نہایت شفاف تھا اسے دیکھ کر اسے سکون کا احساس ہوا کہ تب ہی اسے جمیل میں اپنے پیچھے اپنی ہی عمر کی ایک لڑکی کا عکس نظر آیا وہ بری طرح ہڑبڑائی اور جمیل میں گرتے گرتے پئی۔

”ارے ارے آرام سے۔“ اس لڑکی نے اسے گلے لگاتے دیکھا تو فوراً ہی اسے سنبھالا۔

”تم کون ہو؟“ حنا تانے اسے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

”میں اس اسکول کی طالبہ ہوں، میرا نام فانی ہے اور اگر میں غلط نہیں ہوں تو تم ضرور یہاں کی نئی اسکولنٹ ہو۔ کیونکہ ویسے بھی اس دیرانے میں اور تو کوئی نہیں سکتا۔“ اس لڑکی نے اپنا تعارف کرایا۔

”ہاں میں نے یہاں نیا داخلہ لیا ہے۔ میں ابھی گھوڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں۔ میرا نام حنا ہے۔“ حنا تانے ہی اپنا تعارف کرایا تو فانی مسکرانے لگی۔

”چلو اندر چلتے ہیں سردی بہت بڑھ گئی ہے اور بارش کی خشو اور تیز سخت سرد ہوا آنے والے طوفان کا پتا دے رہی ہے۔“ فانی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسے لے کر اندر ہاسٹل کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دل ہی دل میں حنا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا کہ چوٹی پہلی بھی مل گئی۔

وہ خوش خوشی اس کے ساتھ اندر آ گئی۔ اس رات بڑی موسلا دھار بارش ہوئی وقتے وقتے سے بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دیتی۔ حنا خاموشی سے بستر میں دبی سوئے کی کوشش کرتی رہی۔

اگلے روز صبح کے وقت حنا جب بید سے بیدار ہوئی تو پہلے سمجھ ہی نہ پائی کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ اس کا داخلہ نئے اسکول میں ہوا ہے۔ اور اس وقت وہ ہاسٹل کے کمرے میں لیٹی ہوئی ہے وہ جلدی سے بستر سے باہر نکلے ہاتھ

وہ اب دوبارہ ملنے نہ آئیں گی۔

حنا سامان ہاتھ میں اٹھائے ہاسٹل کی عمارت میں داخل ہوئی وارڈن نے اسے اس کے کمرے کی طرف چھوڑ دیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی سامنے کمرے کے کچھوں بیچ شاندار سنگل بنا ہوا تھا اس پر سفید چادر بہت لمبی لگ رہی تھی۔ بیڈ سیدھے ہاتھ پر رانگنگ ٹیبل اور کرسی بڑے سلیقے رکھی ہوئی تھی۔ بستر کے بائیں طرف ایک سنگھار پر دو صوفے رکھے ہوئے تھے اور بستر کے سامنے لڑکی کی الماری بھی تھی بستر کے عین اوپر کمرے کے دروازے کی بہت بڑا عالی شان قسم کا فائوس لک رہا تھا۔ حنا کی دیکھتی رہ گئی کہ صرف اس ایک کیلے کے لئے عالی شان کمرہ ہے۔ واقعی اس کے سام اور بڑے بہت اہم تھے۔ جب ہی تو انہوں نے اس کے لئے اتنا شاندار ہاسٹل دیکھا تھا۔

جب ہاسٹل اتنا عالی شان تھا تو یقیناً اسکول ہی بہت زبردست ہوگا۔ حنا تانے دل میں سوچا اور اسکول کی طرف سے تو بالکل مطمئن ہوئی لیکن ایک چیز جی اسی بھی اسے ستارہ تھی وہ یہ کہ یہ نئی جگہ ہے یہاں اس کی کوئی دوست نہیں ہے نامعلوم اس اسکول کی لڑکیاں عادتاً کیسی ہوں گی۔ اس خیال کے آتے ہی گھوڑی دیر پہلے والی خوشی ختم ہوئی اور اس کی جگہ ایسا بار بھرا داسی نے لے لی۔ اس نے اپنا سامان سلیقے الماری میں رکھا اسکول کی کتابیں رانگنگ ٹیبل پر رکھیں بالوں کے کلپ اور برش سنگھار میز پر رکھے۔

کپڑے الماری میں ترتیب سے بٹا دیے اور پھر اسکول کے باہر جمیل کو دیکھنے چلی گئی وہ جمیل کے کنارے بیڈ کراس جگہ کے بارے میں سوچنے لگی رہا تھی تو خوب صورت اسے برا تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ آس پاس آبادی نہ ہونے کے وجہ سے کافی دیرانی تھی۔

لیکن یہ خوب صورت قدرتی جمیل اس جگہ کا ان بڑھاپی تھی اوپر سے قیامت ڈھاتا ہوا یہ سہانہ موسم

”چلو بھی ہم آگئے اپنی منزل تک۔“ حنا کی مام نے خوش خوشی کہا۔ اور اس کا کندھا تھپتھپاتی ہوئی اسے باہر نکلنے کی ہدایت کرتی ہوئی خود بھی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئیں۔

”یہ ہم کہاں آگئے اس جنگل میں۔“ حنا تانے قدرے حیرت اور پریشانی سے استفسار کیا۔

”ارے گھبرا کیوں ہو یہی تو تمہارا نیا اسکول ہے۔“ مام نے قدرے لجاجت سے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”ہونہہ! یہی تو میرا اسکول ہے۔ مام آپ واقعی سنگدل ہیں آپ نے مجھے میرے گھر سے دور اس جنگل اور دیرانے میں لا چھوڑا اور اب خود چلی جائیں گی بھی نہ آنے کے لئے۔“ حنا تانے ان کی ہاتھوں سے نکلنے ہوئے کہا۔ اس کی آواز نرمی ہوئی تھی۔

”اوہ! کیا بکواس کر رہی ہو۔ میں تمہیں یہاں ہمیشہ کے لئے کب چھوڑ کر جا رہی ہوں۔“ اب کی بار مام نے ذرا سختی سے کہا۔

لیکن سچ تو یہ تھا کہ انہیں واقعی حنا کی فکر تھی۔ وہ ان کی اگلی اولاد بھی اس کی خوشی سے بڑھ کر نہیں اور کچھ عزیز نہ تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری بیٹا مجھے تم سے ایسے بات نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن میری پیاری یقین کرو تمہیں یہاں بہت مزہ آئے گا۔ تمہاری مام نے ایسے ہی تمہارے لئے اس اسکول کا انتخاب نہیں کرایا۔“ اب کی بار مام کو اس کی حالت پر دم آ گیا۔

”چلو میں تمہیں اندر چھوڑ آتی ہوں۔“ مام یہ کہتی ہوئی اس کا سامان نکالنے گاڑی کی طرف بڑھیں لیکن اس نے انہیں ٹوک دیا۔

”بہت بہت شکریہ لیکن میں خود اندر چلی جاؤں گی۔ آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ حنا تانے مام کو ایک سائیڈ میں کیا اور خود گاڑی سے سامان نکال کر اندر کی طرف بڑھ گئی مام نے اسے پیچھے سے ہی گڈبائے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئیں۔ جانتی تھیں کہ



نوراً: ”خامی نے کہا۔  
”جب ہی دو لڑکیاں حیران پریشان کی ان دونوں  
کی طرف چلی آئیں۔

”ہائے میرا نام ہوتا ہے۔“ ان میں سے ایک نے اپنا تعارف کرایا۔

”ہائے میرا نام شیوری ہے۔“ دوسری نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

”تم یہاں یقیناً ختی ہو جب میں تو کسی نے تمہیں اس بارے میں بتایا نہیں۔“ ہوتا نہ لکھا۔

”ارے ابھی کس بارے میں تم لوگ یہ پہچانیاں سمجھوانا بند کرو۔ اور درست بات بتاؤ۔“

پہلی ویلی کچھ نہیں ہے دراصل یہاں آتما سیں بھیرا کرتی ہیں اور جولوڑی بھی بالوں کی دو چوٹیاں بنالے تو وہ آتما سیں اس کے پیچھے پڑ جاتی ہیں تم بالوں کا کوئی دوسرا اسٹائل بنا سکتی ہو لیکن پلیز یہ چٹیاں جلدی کھول لو۔“ شیوری نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”فنامی کیا یہ سب ج ہے؟“ حنا نے سوالیہ نظروں سے فنامی کی طرف دیکھا اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ حنا نے پہلے فنامی اور پھر شیوری اور یونا کی طرف حیرت سے دیکھا پھر بولی۔

”ج ہے یہ ج ہو یا جھوٹ میں یہ نہیں جانتی میں ان تو ہم پرستی کی باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔“

”حنا یہ تو ہم پرستی کی باتیں نہیں ہیں بلکہ ایک

بہت بڑی حقیقت ہے اس طرح اس حقیقت سے منہ  
مت موڑو۔“ فتامی نے سمجھایا۔

”میں نے کہا ناں میں نہیں مانتی۔“  
 ”تمہارے مانتے یا نہ مانتے سے کوئی فرق نہیں  
 پڑتا جو حقیقت ہے وہ تو اپنی جگہ رہے گی۔“ شیوری نے  
 کہا۔

”ارے یار چھوڑو یہ بے کار کی باتیں مجھے  
تو حیرت ہو رہی ہے کہ آج صبح سے ہر لڑکی مجھے عجیب  
نظروں سے گھور رہی ہے میں نے سوچا کہ تم سے اس  
بات کا ذکر کروں گی لیکن تم لوگ تو خود بھی مجھے ایسے دیکھ

دل رکھنے کے لئے اسے گلے سے لگایا اور پیار کرنے لگی۔

”تم اگر چاہو تو مجھے ماما کہہ سکتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے۔“ حنا تنا نے پوچھا۔

”ماما تم نے ابھی تک میرا نام بتایا ہی نہیں۔ میرا نام کیا ہے۔“ بچے نے اس سے سوال کر ڈالا۔ حنا تنا حیران رہ گئی۔ بچے کا دل رکھنے کے لئے اس نے اس کا فرضی نام سوچ لیا۔

”تمہارا نام وائی جی ہے۔“ اس نے پیار سے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا اسے اس بچے پر بڑا پیار آ رہا تھا آج سے پہلے اسے کسی نے یوں ماما نہ کہا تھا اور کہتا بھی کیوں وہ تو غیر شادی شدہ تھی لیکن آج اس بچے نے جب اسے ماما کہہ کر بلایا تو اسے بڑا خوبصورت احساس ہوا پھر اچانک ہی وائی جی اس کی دونوں چٹٹیوں سے کھیلنے لگا حنا نے حیرت سے اسے دیکھا وہ مسلسل اس کی چوٹیوں کو بڑے پیار سے اپنے ہاتھوں میں لیتا۔ بسبھی اپنے چہرے سے لگتا تو بسبھی اپنے ہاتھ پر لپیٹا اس کے کھیلنے کا انداز تھوڑا عجیب تھا لیکن حنا تا پھر بھی اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ کھیتی رہی۔

جب کافی دیر ہوئی مگر رگمی تو حنا نے وائی جی

سے کہا کہ اب وہ سونا چاہتی ہے اور دیر ویسے ہی بہت ہو گئی ہے اب اسے بھی جا کر سونا چاہئے وائی چچی نے

دھیرے سے اثبات میں کروں ہلائی اور اسے پیار سے ماما کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے

کے بعد جتنا بڑی دیر تک اس پیارے سے بچے والی  
چچی کے بارے میں سوچنے لگی وہ بچہ اس کے دل  
کو بھا گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ کل فنامی، شیوری

اور ہونا کو بھی اس بارے میں بتائے گی۔ اس کے بعد وہ بستر میں دبک کر سونے کے لئے لیٹ گئی ساری رات جب بھی اس کی آنکھ کھلتی اسے شدت سے دہاں

سی کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ یلین وہ اسے اپنا وہم  
مجھ کر سوتی رہی۔



اگلے روز حنا تاجر سے صبح کے وقت بالوں کی دوچونیاں بنا کر اسکول جاتی ہے۔ دوستوں میں آگئی اس نے شیوری، ہنسی اور ہونا کو دیکھتے ہی کہا۔

”ہاں ہم ابھی تمہارے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔“ شیوری نے کہا۔

”اور سناؤ ان چونیوں کی وجہ سے کوئی واقعہ تو پیش نہیں آگیا تمہارے ساتھ۔“ ہونا نے کہا۔

”نہیں ان چونیوں کی وجہ سے تو کوئی واقعہ نہیں پیش آیا ہاں البتہ کل رات ایک بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ کل میرے کمرے کا دروازہ کھلا پا کر ایک پیارا سا بچہ میرے کمرے میں گھس آیا اور مجھے ماما کہہ کر پکارنے لگا۔“ حنا نے بتایا۔

”کیا.....؟“ تینوں لڑکیوں نے ایک ساتھ اپنے دل تمام لئے اور سانس لینا تک بھول گئیں۔

ادوہ تو اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے۔“ حنا کو ان کے ایسے رد عمل پر سخت بے زاری ہوئی فتی نے حنا کو دروڑوں بازوؤں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

”حنا ہوش میں آؤ۔ وہ بچہ دراصل ایک آتما ہے اگر تم چاہتی ہو کہ آئندہ وہ تمہیں تنگ نہ کرے تو کبھی بھی دوچونیاں مت بنانا بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ تم ابھی اسی وقت بال کھول لو۔“ فتی نے کہا۔

”ہرگز نہیں مجھے یہ بھڑاسا نکل بہت پیارا لگتا ہے۔ اور ویسے بھی اگر تم لوگ اس بچے سے ملتی ناں تو بڑا خوش ہوتیں کافی بھولا بھالا معصوم سا بچہ اس کی صورت دیکھتے ہی اس پر پیارا آ جاتا ہے۔“ حنا نے کہا۔

”بے وقوف صورت پر مت جاؤ۔“ ہونا نے تیز لہجے میں کہا۔

”اب چلو بھی پارتم لوگ کیوں اس بے چارے بچے کے بارے میں اتنی سیدی باتیں بنا رہی ہو۔ ویسے بھی وہ کہیں سے بھی آتما نہیں لگتا۔“ حنا بولی۔

تینوں لڑکیاں اسے بڑی دیر تک سمجھانے کی

کوشش کرتی رہیں لیکن وہ ہر بات پر انہیں نالتی رہی۔ اس رات حنا کو پھر نیند نہیں آ رہی تھی ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیند لانے کے لئے کیا عمل نکالے کہ تب ہی کمرے کا دروازہ کھل اور وائی جی ٹنگے پر دھب دھب کرتا ہوا اس کے برابر میں آ کر لیٹ گیا۔ حنا شاکزدہ رہ گئی۔

”ارے وا بچی تم اس وقت یہاں آج پھر۔“ اس نے حیرت سے وائی جی کی طرف دیکھا۔

”ماما وائی جی نے قدرے بھولیں اور مصیبت سے حنا کی آنکھوں میں جھانکا۔“ اس سے حنا کو اس برٹل کے پیار آ یا اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”وائی جی تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ بتاؤ ناں۔“ اس نے شفقت سے دریافت کیا۔

”میری ماما تم کو میرے گھر والوں کے بارے میں بھی تمہیں ہی پتا ہوگا۔“ وائی جی نے جواب دیا حنا خاموش ہو رہی وہ دل میں سوچنے کی کہ نہ اسے اپنا نام پتا تھا نہ ہی اسے اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ علم ہے اور روزانہ رات کو یہ میرے پاس آ جاتا ہے اور مجھے ماما کہہ کر مخاطب کرتا ہے بقول اس کے میں اس کی ماما ہوں۔ معلوم پڑتا ہے یہاں کی ٹیچر ڈاک بیٹا ہے جو کہ شاید

وئی طور سے کچھ نامل نہیں ہے۔ اس لئے بے چارہ بچی بچی باتیں کرتا ہے وہ ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ وائی جی ایک بار پھر کل رات کی طرح اس کی چونیوں سے کھیلنے لگا۔ حنا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ بے چارہ حالات کا مارا چھوٹا معصوم بچہ اس کی چونیوں سے کھیل رہا ہے ہائے پیار کرنے کا کتنا دلچسپ انداز ہے کافی دیر وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ حنا نے

اس کی فرمائش کے بغیر ہی اسے ایک دلچسپ سی کہانی بھی سنائی۔ وائی جی حنا سے بے حد خوش نظر آتا تھا۔ وہ بھی اس سے بے حد خوش تھی۔ باتوں باتوں میں حنا نیند کی وادی میں بھی چلی گئی جب آنکھ کھلی تو

کوشش کرتی رہیں لیکن وہ ہر بات پر انہیں نالتی رہی۔ اس رات حنا کو پھر نیند نہیں آ رہی تھی ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیند لانے کے لئے کیا عمل نکالے کہ تب ہی کمرے کا دروازہ کھل اور وائی جی ٹنگے پر دھب دھب کرتا ہوا اس کے برابر میں آ کر لیٹ گیا۔ حنا شاکزدہ رہ گئی۔

”ارے وا بچی تم اس وقت یہاں آج پھر۔“ اس نے حیرت سے وائی جی کی طرف دیکھا۔

”ماما وائی جی نے قدرے بھولیں اور مصیبت سے حنا کی آنکھوں میں جھانکا۔“ اس سے حنا کو اس برٹل کے پیار آ یا اس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ہو رہی تھی وہ جلدی جلدی اسکول جانے کی تیاری کرنے لگی۔ آج تو اس نے بڑے شوق سے دونوں چونیاں بنائیں اس خیال سے کہ اس کے یہ بال وائی جی کو پسند آئیں۔ بال بنانے کے بعد اس نے اپنی چونیوں پر بالکل ویسے ہی ہاتھ پھیرا جیسے وائی جی پھر رہا تھا پھر اس نے خود کو گھس کر آ کر اپنے میں دیکھا اور اسکول کے لئے چل پڑی۔

☆.....☆.....☆

اجانک بڑے زور کی بجلی کڑکی۔ تینوں لڑکیاں اپنی جگہ پر گر رہیں۔

”واہ کتنی خوب صورت کہانی ہے۔“ ساسی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ کوئی کہانی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔“ مومو کا نے زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ حقیقت اتنی خوبصورت نہیں جتنی تم اسے سمجھ رہی ہو۔ اصل پر اسرار بات تو ابھی آنے والی ہے۔“ مومو کا بولی۔

”میں وائی جی کی حقیقت جاننے کے لئے بے تاب ہوں۔“ شیوری نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ باہر بڑے زوروں کی ہوا چل رہی تھی اور اب بارش بھی شروع ہو چکی تھی۔

”ویسے حنا کو وائی جی پر اتنا اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔“ ساسی نے کہا۔

”ہاں لیکن وہ اس پر اعتبار کرنے لگ گئی تھی اور بہت جلدی سچائی اس کے سامنے آنے والی تھی۔“ مومو کا نے کہا اور کہانی دوبارہ شروع کی۔

اس رات تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ حنا اپنے کمرے میں بیٹھی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ جب ہی بچے سے وائی جی نے اسے پکڑ لیا اور اس کی چونیوں کو پیار کرنے لگا پہلے تو حنا نے چونک کر اس کو دیکھا پھر اسے پوچھ ہی بیٹھی۔

”تمہیں میری چونیاں اتنی پسند کیوں ہیں۔“ اس لئے کیونکہ تم میری ماما ہو۔“ وائی جی نے

مصیبت سے جواب دیا۔

”اچھا چلو آج تمہیں اپنی دوست سے ملواتی ہوں۔ اسے بھی تم سے مل کر اچھا لگے گا۔“ حنا نے وائی جی کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اس نے اثبات میں گردن ہلا دی حنا اسے اپنے ساتھ لے کر فتی کے کمرے تک آگئی اس نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ اندر سے لاک تھا۔

”کون ہے.....؟“ اندر سے فتی کی آواز آئی اور پھر کمرے میں چلنے کی آہٹ ہوئی۔

”دروازہ کھولو فتی یہ میں ہوں حنا۔ دیکھو میرے ساتھ وائی جی آیا ہے۔“ حنا نے کہا تو اندر سے فتی کے ڈر کر سانس لینے کی آواز آئی۔

”میں دروازہ نہیں کھولوں گی پہلے تم اپنے بالوں کی دونوں چونیاں کھولو۔“ اندر سے فتی کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

”اوہ فتی یہ فالٹو کی بکواس چھوڑو اور دروازہ کھولو۔“

”میں نے کہاناں میں نہیں کھولوں گی۔“ ایک بار پھر فتی نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا اچانک ہی وائی جی نے زور زور سے دروازے پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا جیسے کہہ رہا ہو کہ دروازہ کھولو۔

”آں! آں!.....“ فتی کے چیخنے کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھی فتی کی کچنیوں سے گھبرا کر حنا نے وائی جی کا ہاتھ روکنا چاہا لیکن وہ مزید زور سے دروازے سے سینے لگا حنا کو لگتا ہوئی کہ یوں تو بائیل کی دوسری لڑکیاں بھی جاگ جائیں گی۔ لیکن وائی جی کسی طور نہیں ہلکا ہٹا اور بڑے فتی کے انداز سے بھی لگ رہا تھا کہ وہ بہت بڑی طرح ڈر رہی ہوئی ہے وہ مسلسل اس سے بال کھولنے کی التجا کر رہی تھی اس ساری صورتحال سے گھبرا کر حنا نے اپنے بال کھول دیئے بال کھولنے کی دیر تھی کہ وائی جی ٹنگے پاؤں دھپ دھپ کرتا ہوا تیزی سے وہاں سے بھاگ گیا۔

”وائی جی جا چکا ہے فتی دروازہ کھول



”دو“ حنا نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ فحاشی کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور فحاشی نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔

”وہ..... وہ..... چلا گیا۔“ اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں وہ چلا گیا وہ میرے بال کھولتے ہی چلا گیا۔“ حنا نے بتایا۔

”حننا میری بات کا یقین کرو۔ وہ کوئی عام بچہ نہیں ہے بلکہ ایک آتما ہے تم نے دیکھا کیسے وہ تمہارے بال کھولتے ہی یہاں سے بھاگ گیا پلیز حنا آئندہ کے لئے ایسے بال بنانا چھوڑ دو۔“ فحاشی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

حننا نے اثبات میں گردن ہلائی اور واپس اپنے کمرے میں آگئی اب وہ بھی اس بات پر گہرائی سے غور کر رہی تھی کہ واقعی وائی جی کی حرکتیں پراسرار سی ہیں اور پھر آج جیسے ہی اس نے سر کے بال کھولے وہ اچانک سے بھاگ کیوں گیا یہی سوچتے سوچتے وہ سوچ رہی تھی۔

اس سے اگلے روز رات کے پہر حنا اپنے پیٹ پر لیٹی کل رات والے واقعہ کے بارے میں سوچ رہی تھی اچانک ہی کمرے کا فانوس جلنے لگا اتنے بڑے فانوس کے اچانک جلنے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکی وہ فانوس کو غور سے دیکھنے لگی اور پھر بری طرح چونک پڑی اس لئے کیونکہ فانوس کے اوپر وائی جی چڑھا ہوا تھا اس کے فانوس پر بیٹھے ہوئے وہ ال رہا تھا حنا دھک سے رہ گئی وائی جی نیچے اسی کو دیکھ رہا تھا اس سے پہلے کہ حنا کسی قسم کی آواز نکالتی وہ اس کے سینے پر کود گیا۔

حیرت انگیز طور پر اس کے اس طرح کودنے سے اسے کسی تکلیف یا درد کا احساس نہیں ہوا بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے کہ کسی نے روٹی کا تکیہ زور سے اس کے سینے پر دے مارا ہو۔

”وائی جی تم یہاں؟“ حنا نے حیرت سے استفسار کیا۔

”ماما میں تم سے ملنے آیا ہوں۔“ وائی جی نے اسی معمول کے لہجے میں جواب دیا جس لہجے میں وہ ہمیشہ بات کرتا تھا حنا اس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ آج اسے وائی جی کے یوں اچانک آ جانے سے ڈر لگ رہا تھا اوپر سے کل والا واقعہ بھی اسے یاد تھا اور وہ بے بسی آج تو اس نے کمرے کا لاک لگا دیا تھا کہ وائی جی پھر نہ آ سکے پھر نامعلوم وہ اندر کیسے داخل ہو گیا۔ اس نے یہی خیال کہ کیا شاید وہ کمرے کا لاک بعد میں کھول بھی ہوگی ورنہ کوئی اور سائنسی وجہ جس میں نہ آتی تھی۔

وائی جی ہمیشہ کی طرح اس کے بالوں کی چونچیل سے کھیلنے لگا مگر آج فرق صرف یہ تھا کہ حنا کو اس کا اس طرح کرنا گھبراہٹ میں جھلا کر رہا تھا آج اسے وائی جی سے خوف محسوس ہو رہا تھا آج بھی بڑی دیر تک وائی جی اس سے باتیں کرتا رہا جب کافی دیر یونہی گزر گئی تب حنا نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ اب وہ سونا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اسے دروازے تک چھوڑنے آئی تو دیکھا کہ دروازہ تو اندر سے لاک تھا یہ دیکھ کر اسے حیرت کا زبردست جھکا ہوا۔ اور وہ مزید ڈر گئی اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد وہ وائی جی سے چھپا چھڑالے گی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس بارے میں فحاشی سے پوچھے گی۔

☆.....☆.....☆

آخر وائی جی کون تھا؟“ ساسی نے حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں مومو کا جلدی بتاؤ یا اب تو مجھ سے بھی وائی جی کی حقیقت جاننے کا مزید انتظار نہیں ہوتا۔“ ہوری نے بھی جلدی سے کہا۔

”ہاں اب وائی جی کی حقیقت کھل کر سامنے آنے والی ہے یوں سمجھو کہ اب اپنے کلاس پر پہنچنے والی ہے۔“ مومو کا نے مسکراتے ہوئے کہا اور کہانی کا سلسلہ آگے سے جوڑنا شروع کیا۔

اگلے روز صبح کے وقت حنا کی آنکھ گھبرا کر کھلی وہ ابھی تو پسینے میں شرابور تھی۔ اس کا سانس بری طرح پھول

رہا تھا۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو اسکول جانے کا ٹائم ہو گیا تھا اس نے جلدی جلدی یونیفارم پہنا اور اسکول پہنچی۔ وہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے فحاشی کو تلاش کیا اور اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ وہ وائی جی کے بارے میں اسے اصل حقیقت بتائے کہ آخر وہ بچہ کون ہے اور وہ اس کے بارے میں کیا جانتی ہے یہ سب سن کر فحاشی نے ایک سرد آہ بھری پھر بولی۔

”ٹھیک ہے اگر تم سچ سننا چاہتی ہو تو سنو اور ویسے بھی مجھے گتا ہے کہ تمہیں سچ بتانا بھی اب ضروری ہو گیا ہے آج سے کئی سال پہلے اس اسکول میں اکاری نامی ایک لڑکی بڑھا کر تھی وہ بھی تمہاری طرح اپنے بالوں کی دو چونچیاں بنا کر تھی۔ وہ زیادہ تر سب سے اگت تھلگ ہی رہتی تھی اسکول میں اس کی کوئی کیٹلی نہ تھی پھر ایک دن کسی طرح اسکول کی لڑکیوں کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ پریکٹس ہوگئی ہے ساری لڑکیاں اس کے بارے میں بے شمار باتیں بنانے لگیں۔ کوئی کہتی کہ بچے کا باپ یہاں کا کوئی بچہ ہے تو کوئی کہتی کہ بچے کا باپ شاید یہاں کا بچہ نہیں بلکہ اصل بچہ یہاں کا چوکیدار ہی ہے۔ اس لئے کیونکہ یہاں لڑکیوں کے اسکول میں کوئی اور مرد تو ہے نہیں غرض یہ کہ جتنے منہ باتیں تھیں۔ بچے کا باپ کون تھا یہ بات کبھی کسی کو پتا نہ چل سکی۔

بہر حال تو ہوا کچھ یوں کہ اسکول کی لڑکیاں تو پہلے ہی اسے کوئی خاص پسند نہیں کرتی تھیں وہیں اسکول میں تین لڑکیاں ایسی تھیں جو شروع سے اس کے خلاف تھیں ایک روز رات کے وقت جب اکاری سونے کی بیت سے اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی تو وہ تینوں لڑکیاں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں اکاری ان کی اس حرکت پر گھبرا گئی اور ان سے جاننے کے لئے راستہ مانگنے لگی لیکن وہ آگے سے مزید بدلتی جی رہی تھیں اور اس کے ہونے والے بچے کے بارے میں ابھی سیدھی باتیں کرنے لگیں۔ اکاری نے غم آ کر وہاں سے لکھنا چاہا تو ان میں سے ایک لڑکی نے اسے دھکا دیا لیکن اکاری کی بد قسمتی کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دھکا

لگنے سے فرش پر گر گئی۔ اس وجہ سے اسے چوٹ آگئی اور اس کا بچہ ضائع ہو گیا۔

اکاری نے ابھی زندہ رہ رہا تھا اس لئے وہ بچ گئی اس واقعہ کے بعد اس نے یہ اسکول چھوڑ دیا لیکن ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ پراسرار اور عجیب واقعات پیش آنے لگے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہیں اسکول اور یہاں کے ہاسٹل میں ایک چار پانچ سال کا بچہ نظر آتا ہے اور پھر ایک دن وہ تینوں پراسرار طریقے سے مر گئیں۔ اس کے بعد سے اسکول میں جو لڑکی بھی اکاری کی طرح دو چونچیاں بنا کر آتی ہے اسے ایک بچہ نظر آتا ہے لڑکیوں کا کہنا ہے کہ وہ بچہ اکاری کا ضائع ہونے والا بچہ ہے وہ اس کی آتما ہے اس لئے اب کوئی بھی لڑکی یہاں ایسے بال بنا کر نہیں آتی اور تمہیں بھی اسی لئے ایسے بال بنانے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن تم نے بات نہیں مانی تو دیکھ لو آج وہ بچہ تمہارے سامنے ہے۔“ فحاشی بول کر خاموش ہوئی تو حنا حیران پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔

☆.....☆.....☆

اس رات بڑے زوروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی وقت بھی بجلی آگمرے گی ایسے میں حنا نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور آئینے کے سامنے اپنے بالوں کی دو چونچیاں بنا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ آج آزمانا چاہتی تھی کہ کیا واقعی یہ بچہ بھی وہی ہے؟ کیا واقعی اس کے ایسے بال دیکھ کر وہ اس کی طرف کھنچا چلا آئے گا۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اچانک ہی وائی جی اپنے پاؤں دھب دھب کرتا ہوا آیا اور آ کر اس کی بالوں سے لپٹ گیا۔

”ماما۔“ اس نے پھر پکارا۔

حننا نے خود کو جھڑپا چاہا لیکن وہ اس سے مضبوطی سے لپٹا رہا گھبرا کر حنا نے اپنے سامنے نگہار میز پر سے ہاتھ بڑھا کر قہقہہ اٹھائی اور اپنی ایک چونچلی کاٹ ڈالی جیسے ہی ایک طرف کے بال زمین پر گرے وائی جی بری طرح تڑپ کے رہ گیا اور اس نے حنا کی آنکھوں



# خواب یا حقیقت



ریحان پوری حویلی برجیرت سے پھر ایک بار نظریں دوڑاتا ہوا سوچ رہا تھا رات کو جو اس کے ساتھ دوا تھا وہ خواب تو نہیں تھا مگر نہیں وہ خواب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

**ریحان** نے ہوائی جہاز سے باہر آ کر طوں کی تمام میں ایک طویل سانس لیا اور پھر سیزھیان اترنے وہ آج 5 برس کے بعد واپس لوٹ رہا تھا انگریزوں کے ہاتھوں میں ماسٹر کرنے کا شوق اسے امریکہ لے گیا تھا۔ وہی شوق تھے اس کے پڑھنا اور بھنا سنا، وہ نے منصوبے لے کر آیا تھا وہ اپنے گاؤں کی تقدیر بدلنے کے لئے زراعت میں اپنے گاؤں کو سب سے لے جانا چاہتا تھا۔ ویسے ہی اس کا گاؤں رنگ باڑی زرخیزی کے باعث پورے علاقے میں مشہور تھا کے گاؤں کا کوئی باقاعدہ ریلوے اسٹیشن نہیں تھا اس ل گاؤں بمشکل پانچ منٹ کے لئے رکتی تھی اس نے

مرسٹ کلاس کی ٹکٹ بک کروائی اور اپنے دو عدد بھاری بھر کم بیک اٹھائے سیٹ پر جا بیٹھا اس کے کپار شینٹ میں زیادہ رش نہیں بڑا تھا بس دو بیلیاں تھیں وہ بھی چار چار افراد پر مشتمل تھیں تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اپنی منزل پر جا پہنچا اس نے اپنے دو بیلیاں بیک اٹھائے اور نیچے اتر آیا اپنے دس صندوق اپنے علاقے کی ہوا میں عجیب خارش بھرا سنا ہوا ہے خصوصاً جب انسان بہت عرصے کے بعد اپنے علاقے میں پہنچے تو اسے سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے یہی حال ریحان کا بھی تھا وہ سرشاری کے عالم میں تانگہ اسٹینڈ کی جانب بڑھا لیکن پھر اسے چونک کر رکنا پڑا کیونکہ وہاں کسی قسم کا

میں جھانکا اس کی نظروں میں ایک انتہائی اور پھر وہ انتہا آکھوں کے راستے زبان تک آگئی۔ ”ماما اتنے عرصے بعد تو ہم ملے ہیں اب تو مجھے یوں چھوڑ کر مت جاؤ۔“ وائی جی کے لہجے میں دنیا جہان کی بے قراری تھی۔ اس لئے حنا کا دل بھرا آیا۔ اسے وہ پہلا دن یاد آیا جب وہ اس کے کمرے میں اچانک چلا آیا تھا اور اسے پیار سے ماما کہہ رہا تھا۔ پھر جب اس نے اس کا نام جانا چاہا تو اس نے اپنا نام بتانے کی بجائے اناس سے کہہ دیا تھا کہ میری ماما تم نے میرا نام بتایا نہیں اور پھر کتنے پیار سے اس نے اس کا نام وائی جی رکھا تھا۔ حنا کی آنکھیں بھر آئیں اب تک اسے وائی جی سے بے حد انسیت ہوئی تھی لیکن حقیقت کا سامنا بہر حال اسے کرنا تھا لہذا اس نے خاموشی سے اپنی دوسری چوٹی بھی کاٹ ڈالی اب حنا کے چھوٹے چھوٹے بال کندھے تک آ رہے تھے۔ وائی جی نے جیسے ہی یہ سب دیکھا تو فوراً وہاں سے دھب دھب کرتا ہوا بھاگ گیا۔ حنا وہیں سنگھار میز کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆  
”ہائے کتنی دل فریب کہانی ہے۔“ ساسی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے کہا۔  
”ہاں واقعی بے حد خوب صورت کہانی تھی اب ذرا یہ بھی تو بتاؤ کہ یہ کہانی جو کہ تم بتا رہی ہو کہ دراصل ایک سچا واقعہ ہے تمہیں کس نے سنائی۔“ ہیوری نے پوچھا۔  
”سچ جان کر تم لوگوں کو تھوڑی حیرت ہوگی یہ کہانی مجھے میری مام نے سنائی تھی اور جانتی ہو سب سے دلچسپ بات کیا ہے وہ لڑکی حنا کا از خود میری مام ہیں۔“ مومو کا نے بتایا تو وہ دونوں ایک ساتھ جج پڑیں۔  
”کیا؟ ہاں ہاں یہ سچ ہے۔ اتنا شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔“  
”کیا واقعی وہ لڑکی حنا تمہاری مام



کوئی تانگہ موجود ہی نہ تھا ریمان نے گھڑی پروقت دیکھا ابھی چار بجے تھے تاکہ تو مغرب کے بعد تک موجود ہوتے تھے آج پر کیا ہوا اس نے سوچا پھر چاروٹا چاروہ پیدل ہی چل پڑا بیک خاصے بھاری تھے اور وہ پہلے ہی ایک لمبے سفر سے آ رہا تھا لیکن اسکے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

ہمیشہ سے وہ اپنے والدین کو سر پرانز دیتا آیا تھا اور آج بھی اچانک ان کے سامنے جا کر انہیں سر پرانز دینا چاہتا تھا اس کے والد چوہدری مراد اور والدہ اسے دیکھ کر ہلچلا بہت خوش ہوں گے انہی سوچوں کے ساتھ وہ گاؤں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا امریکہ کی پختہ تارکول کی سڑکوں پر چل چل کر اسے آج مٹی کے بنے اس راستے پر چلتے ہوئے عجیب مزہ آ رہا تھا اور بجائے سستی اور تھکاوٹ کے اس کے جسم میں عجیب چستی سی عود کر آئی تھی تاکہ پندرہ منٹ میں گاؤں پہنچتا تھا لیکن اسے چلتے ہوئے گھنٹہ بھر ہو چکا تھا اب تک اسے کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا چلتے چلتے جب وہ گاؤں کے عین سامنے پہنچا تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا لیکن اذان کی آواز کہیں سے سنائی نہیں دے رہی تھی پھر وہ گاؤں میں داخل ہو گیا وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی نظر آئے تو وہ اسے بیک اٹھا کر جوئی تک ساتھ چلتے کوہے لیکن وہ دوسری ٹکی گھوم گیا اسے کوئی شخص نظر نہیں آیا نہ راستے اس کے اپنے تھے گاؤں اپنا تھا لیکن اسے نظر کوئی شخص نہیں دے رہا تھا نہ کوئی آہٹ نہ آواز مارے حیرت کے اس کا برا حال ہو چکا تھا لیکن اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ دروازے بند تھے ہر طرف ہوکا عالم تھا اسی حالت میں وہ چلتے چلتے اپنی حویلی تک پہنچ گیا۔ حویلی کا بڑا دروازہ بند تھا اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لیکن کوئی جواب نہ آیا وہ کافی دیر تک دھڑ دھڑاتا رہا لیکن کوئی جواب نہ پا کر اس نے دونوں بیک وپن رکھ دیئے اور پچھلی گلی کی جانب بڑھا اور پھر رک گیا۔

اب اس کا رخ اپنے چچا کے گھر کی جانب تھا اس

نے چچا کی حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن یہاں بھی وہی حالت تھی پھر وہ ایک طویل سانس لے کر پلٹ پڑا اندھیرا چل چکا تھا جیسے ہی وہ گلی مڑا اسے زوردار شور مچا گئی اور وہ لڑکھڑاکر شکل سے سنبھلا اور پلٹ کر دیکھا دوسرے ہی لمحے اپنے جسم میں خوف کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی وہ بے یار و مددگار ایک دلیر نوجوان تھا لیکن اسے اب سارے ماحول سے دشت اور خوف سا محسوس ہونے لگا تھا وہ سخت حیران تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اب لاش نے اس کی حیرت میں مزید اضافہ کر دیا تھا وہ پھر حویلی کی جانب بڑھا وہ چلتے ہوئے حویلی کے سامنے جا پہنچا اب اس کے پاس اس کے ادا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ دیوار پھلانگ کر حویلی کے اندر جا پڑے وہ جتنا سانس کا ماہر تھا یہ اسکے لئے کوئی مشکل بات نہیں تھی اس نے پہلے دونوں بیک پھینکے اور پھر اس نے گیٹ کے کنڈے پر رکھا اور چمپ لے کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چلا گیا لگادی پوری حویلی سائیں سائیں کر رہی تھی ہاں سامان سارا ترتیب اور پیلے سے اندر موجود تھا۔ البتہ ان پر گرد مچی ہوئی تھی گاؤں کے چار پانچ گھروں میں ہی بجلی تھی اور پھر وہ تو گاؤں کے بڑے تھے اس لئے ان کی حویلی میں بجلی کا ہونا لازمی تھا اس نے محنت میں گئی ٹیوب لائٹ آن کر دی اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھا دروازہ کھول کر اس نے اپنے کمرے کی بھی لائٹیں آن کی اس کے کمرے کی وہی حالت تھی چیزیں سب ترتیب سے موجود تھیں لیکن گرد کی ایک دبیز تہ ان پر موجود تھی اس نے بیک رکھ کر اپنا بستر چھڑا اور چند ہی لمحوں میں وہ غنیمت کی گہری وادی میں تھا اسے سوئے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک تیز چیخ کی آواز نے اسے بڑا کر اٹھا۔ پر مجبور کر دیا وہ حیرانی سے اوڑھ اڑھ دیکھنے لگا اپنے کمرے کی لائٹ اس نے جلتی چھوڑ رکھی تھی یلغز اسے یوں محسوس ہوا جیسے پچھلی گلی سے اسے کوئی دیکھ رہا ہو اس نے چونک کر گھر کی کی جانب دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس گاؤں سے فوراً باہر نکلنا چاہئے یہاں جو کچھ بھی ہے بہر حال درست نہیں ہے پھر اس کے کہ میں کسی مصیبت کا شکار ہو جاؤں مجھے چاہئے کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤں اس نے سوچا پھر وہ اٹھا اور اپنے دونوں بیک اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھولا دوسرے ہی لمحے اس کے جسم میں خوف کی لہریں دوڑ گئیں اس کے عین سامنے وہی کھڑا تھا جس کی لاش وہ گلی میں پڑی چھوڑ آیا تھا اس نے جلی کی سی سرعت سے دروازہ بند کیا اور چپٹی چڑھا دی خوف کے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے اسے جسم پر پڑتے ہوئے محسوس ہوئے یہ کیسا گورکھ دھندہ ہے یہ سب کیا ہے اس نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ سوچا امریکہ جیسے ملک سے واپسی کے بعد وہ کہاں آ پہنچا تھا اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اب یہاں سے کیسے نکلا جائے جیسے بھی ہو نکلنا چاہئے یہ سوچ کر اس نے اپنے دونوں بیک وپن پر رے اور بجائے دروازے کے گھر کی کی جانب بڑھا اور اسکے درمیان گلی چپٹی ہٹائی شیشے کی گھر کی سے باہر کا منظر واضح دکھائی دے رہا تھا وہ گھر کی کے ذریعے پیچھے راہ داری میں آ گیا اور بے پاؤں بائیں جانب بڑھنے لگا۔ یکا یک جلتے والی ساری لائٹیں آف ہو گئیں اور ہر طرف شدید اندھیرا پھیل گیا۔

ریمان کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے وہ کچھ دیر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا جلد ہی اس کی آنکھیں اس قابل ہو گئیں کہ وہ کچھ نہ کچھ راستہ دیکھنے کے قابل ہو گیا پھر وہ آگے بڑھنے لگا راہ داری کے اختتام پر وہ جونہی بیرونی دروازے کی طرف مڑا اسے ٹھک کر رک جانا پڑا دروازے کے عین پہلوں پر کوئی لمبا ترنگا آدمی تن کر کھڑا تھا اندھیرے کے باعث اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا ریمان وہیں ساکت ہو گیا اور پھر واپس مڑا اب اس کا رخ راہ داری کے دوسرے سرے کی جانب تھا وہاں سے پچھلی جانب تھی دروازہ موجود تھا جہاں سے وہ جاووروں کے باڑے

میں جا کرتا اور پھر وہاں سے گاؤں کے بیرونی راستے کی جانب راہ لیتا یہی سوچ کر وہ اس جانب بڑھا اس نے پچھلے دروازے کی کنڈی اتاری اور دروازہ کھولا لیکن اسے وہیں ٹھک کر رک جانا پڑا چاند کی چاندی میں اسے جو منظر دکھائی دے رہا تھا اس کے لئے ناقابل یقین تھا وہ پلٹیں تک جھپکنا بھول گیا تھا اس کے سامنے بلاشبہ ایک کسرتی جسم کا مضبوط ذیل ڈول والا شخص ہاتھ میں نیزہ تھا سے مین باڑے کے دروازے کے درمیان کھڑا تھا لیکن جو چیز خوف زدہ کر دینے والی تھی وہ اس کا سر تھا ہاں اس کے شانوں پر کسی انسان کا چہرہ نہیں تھا بلکہ تیل کا چہرہ تھا ریمان کا حلق خشک ہو چکا تھا وہ سرعت کے ساتھ واپس مڑا اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گیا اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی تو رات کے بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے ہلچلا ہمارے گاؤں میں شیطانی طاقتوں نے حملہ کر کے یہاں کے باسیوں کو نکال باہر کیا ہے وہ اپنے کمرے کی الماری کی جانب بڑھا وہ یہاں اپنے شکار کے لئے استعمال ہونے والا اسلحہ رکھتا تھا دو تالی بندوق جوں کی توں پڑی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا، کارتوس بھی موجود تھے اب پورے بارہ بج چکے تھے اس لمحے دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا ریمان نے بندوق اٹھائی اور اس کی ٹال کا رخ دروازے کی جانب کر دیا دروازہ ایک مرتبہ پھر دھڑ دھڑایا ریمان مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر جم گیا اس مرتبہ دروازے پر زوردار انداز میں ضرب لگائی اور چپٹی ٹٹ گئی دروازہ دھماکے سے کھل گیا وہ وہی تھا جس کی لاش ریمان دیکھ چکا تھا اس کے خوف ناک دانت منہ سے باہر آ رہے تھے وہ آنکھیں ریمان پر جمی ہوئی تھیں ریمان نے بندوق کے ٹریکر کو دیا یا زوردار دھماکہ ہوا اور گوئی اس کے عین سینے میں گئی وہ جھٹکا کھا کر پیچھے دیوار سے جا گرایا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا اس کی نظر سینے سے بہتے ہوئے خون پر پڑی وہ ریمان کو بھول گیا اور اس کا منہ عین سینے سے جاگ



اور وہ مزے لے لے کر اپنا خون پینے لگا ریحان جبرت میں کم یہ منظر دیکھ رہا تھا پھر اس کی توجہ نہ پا کر ریحان نے جست لگائی اور کمرے سے باہر نکل گیا وہ دوڑتے ہوئے بیرونی دروازے کی جانب جا رہا تھا لیکن اسے ایک مرتبہ پھر رکن پڑا وہ تیل نمالاش دروازے کے عین درمیان میں موجود تھی ریحان نے ایک مرتبہ پھر بندوق سیدھی کی اور ٹیکر دیا اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا ہاتھ اور بندوق سے ٹکٹے والے کارتوس نے اس کی انگلیاں اڑا دی تھیں اس نے چونک کر اپنے ہاتھ کی اڑی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نظر کچھ دور پڑی اپنی کٹی ہوئی انگلیوں پر پڑی وہ فوراً اس طرف لپکا اور اپنی ایک انگلی اٹھا کر اسے بخور دیکھا پھر منہ میں ڈال کر کھانے لگا۔

اس کے چہرے پر پندیدگی کے تاثر ابھرا آئے تھے۔ پھر دوسری انگلی کی جانب بڑھا ریحان نے موقع دیکھ کر دوڑ لگائی اور باہر نکل آیا؟ باہر میں گیٹ بند تھا اس نے دیوار کے قریب پہنچ کر بندوق کندھے سے لٹکائی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ چپ لی اس کے دونوں ہاتھ دیوار کے اوپر جم گئے اگلے ہی لمحے اس نے اپنے جسم کو اوپر اٹھالیا اور دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری جانب چھلانگ لگادی گاؤں سے باہر کی جانب دوڑتے ہوئے اس نے بندوق بھی بھری تھی تب ہی اچانک اس کی نگاہ ایک بڑھیا پر پڑی وہ لاشی جیتے ہوئے چل رہی تھی اس کی نظر جیسے ریحان پر پڑی وہ فوراً بولی۔

”بیٹا میری مدد کرو۔“ ریحان ہمدردی کے تحت اس کی جانب بڑھا اور قریب جا کر پوچھا۔

”جی اماں جی حکم کریں کیا خدمت کروں میں آپ کی۔“ لیکن بڑھیا نے کوئی جواب دینے کی بجائے چھوٹا مارا اور اس کے ہاتھ سے بندوق چھین کر دوڑ پھینک دی ریحان ایک لمحے کے لئے بھونچکا رہ گیا بندوق اس نے نہایت مضبوطی سے پکڑے رکھی تھی لیکن اس دھان پان

کی بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے بندوق ایسے چھینتی تھی جیسے پھولے بیج سے آسانی کے ساتھ کوئی کھلونا چھین لیا جائے۔ وہ پلٹ کر دوڑ پڑا۔ جبکہ بڑھیا بھی لاشی اٹھاتے اس کے پیچھے پیچھے تھی اسے سامنے سے بھی کچھ افراد دوڑتے ہوئے آئے دکھائی دیئے وہ پھرتی سے دائیں جانب والی قلی میں گھوم گیا کمراب بھی بڑھیا سمیت متعدد افراد اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے چاند کی چاندنی میں وہ منظر نہایت بھیانک تھا تب ہی اسے سامنے سے بھی کچھ افراد آتے دکھائی دیئے ان میں سب سے آگے وہی تیل نما آدمی تھا اب وہ چاروں جانب سے بری طرح پھنس چکا تھا وہ قلی کے عین درمیان میں بے بسی سے کھڑا ہوا کیا تب ہی اس کی نظر سامنے پڑی، وہ مسجد تھی، اس نے پوری قوت سے چھلانگ لگائی اور مسجد کے صحن میں جا کر اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا وہ کچھ دیر بولی بے حس و حرکت پڑا رہا اب اس میں اور دوڑنے کی ہمت نہیں تھیں وہ سوچے جا رہا تھا کہ اب وہ سب اس کے سر پر پہنچے اب کے پیچھے لیکن کچھ نہ وہ اس نے چونک کر باہر کی جانب دیکھا وہ سب مسجد کے باہر کھڑے اسے خوف ناک نظروں سے گھور رہے تھے اور اسے باہر آنے کا کہہ رہے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ مسجد میں نہیں آ سکتے اس نے سوچا شدید پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا وہ اٹھا اور اس نے مسجد کے صحن میں موجود کنویں میں ڈول پھینک کر پانی نکالا اور پیاس بجھائی وہ سب لوگ اب بھی مسجد کے باہر موجود تھے اور وہ اسے اشاروں سے باہر آنے کا کہہ رہے تھے یہ ساری شیطانی طاقتیں ہیں اس لئے اندر نہیں آ رہی وہ سوچتے ہوئے صبح کا انتظار کرنے لگا پھر جونہی دن کی روشنی پھیلی گئی وہ سب غائب ہوتے گئے اور بالآخر سب ہی وہاں سے چلے گئے اس نے جھانک کر کھلی کا جائزہ لیا واقعی قلی خالی پڑی تھی اس نے اطمینان بھرا سانس لیا اور باہر کی میں نکل پڑا اس کا رخ گاؤں کے

باہر جانے والے راستے کی طرف تھا لیکن جونہی وہ قلی کا موڑ ملا اسے ٹھٹھک کر رکن پڑا یہاں پانچ افراد ایک لاشی شکلوں والے لائن میں کھڑے تھے ان کے یوں کھڑا ہونے کی وجہ سے قلی سے گزرنے والا سارا راستہ بند ہو گیا تھا۔

ریحان کے پلٹ کر دیکھتے ہی ان کے چہروں پر ایک خوف ناک مسکراہٹ پھیل گئی ان کے دانت ٹوٹوں سے باہر نکل آئے تھے آنکھوں کی رنگت بھی تبدیل ہو گئی۔

ریحان پلٹ کر دوڑ پڑا وہ پانچوں بھی اس کے پیچھے تھے اور ان کے دوڑنے کی رفتار خاصی تیز تھی ریحان کے اور ان کے درمیان قاصدہ بندرتیج کم ہوتا جا رہا تھا ریحان کو راستے میں ایک دروازہ کھلا نظر آیا اس نے بڑی برقی رفتاری سے چھلانگ لگائی اور گھر کے اندر جا پڑا اور قلی چڑھا دی۔

پہنچے آئے والوں نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا ریحان صحن کے اندر عین درمیان میں آن کھڑا ہوا۔

تب ہی اس کی نظر سامنے کمرے میں پڑی جہاں سے ایک شخص برآمد ہو رہا تھا اس کی چال بالکل عین مانسوں جیسی تھی کمرنگی سی خیمہ بازو لے لے جے گھٹے تک پہنچے ہوئے تقریباً سات فٹ تھا ریحان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرا آئے اور پوری قوت سے دونوں بازو کھول کر اس پر چھینا۔ ریحان نے جھٹکی کھا کر خود کو اس سے بچایا اور دیوار سے جا کھڑا۔

اب پہنچے کا کوئی بھی راستہ نہیں تھا سچی دھڑام سے بیرونی دروازہ ٹوٹا اور وہ پانچوں ہمشکل بھی اندر داخل ہو گئے تیل نما آدمی ہلکا لاش ریحان کی گردن پر بوجھ چکی تھی پانچوں ہمشکل دوڑتے ہوئے قریب آئے اور انہوں نے تیل نمالاش کو پکڑ کر پیچھے دھکیل دیا اور خود ریحان کی طرف بڑھے اب ریحان کے لئے باہر سے پہنچے کا کوئی راستہ نہ تھا تب ہی لاش نے پانچوں

کو ایک ہی جملے میں دبوچ لیا لیکن ریحان کی نظریں سامنے اوپر جاتی سیڑھیوں پر پڑی اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہیں لڑتا چھوڑ کر سیڑھوں کی طرف لپکا اور بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچ گیا اور دیوار پھلانگ کر ساتھ والی چھت پر اتر آ۔

اس کی نظریں چھت پر پڑی ہوئی چارپائی پر پڑیں جس پر ایک انتہائی بوڑھا شخص لیٹا ہوا تھا اس کے چہرے پر ان گنت جھریاں تھیں ور انتہائی لاغر دکھائی دے رہا تھا ریحان اس کے ریب سے گزرنے لگا تو اس کی دونوں آنکھیں کھل گئیں۔

ریحان کو اس سے بے پناہ خوف محسوس ہوا وہ بھاگتے ہوئے دیوار پھلانگ کر اگلی چھت پر پہنچا۔ لیکن وہ اچانک رک گیا کیونکہ سامنے دو بونے کھڑے تھے۔

دونوں خوشی سے کلکاپیاں مارتے ہوئے اچھلنے کودنے لگے اور اس کی طرف بڑھے ریحان جم کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا ایک یونا اس کی طرف بڑھا اور اس کی ٹانگ دبوچنے کی کوشش کرنے لگا ریحان نے پوری قوت سے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کر دی وہ پیچھے ہونے لگی گیند کی طرح چار فٹ دور جا گرا۔

دوسرا یونا فضا میں اچھلا اور ریحان یونا زور سے نکرایا اور پیچھے دیوار کے ساتھ جا کھڑا ریحان پوری قوت سے بھاگا اور اگلی دیوار بھی پھلانگ گیا اب آگے گلی آگئی تھی ریحان جتنا سنگ مظارہ کرتے ہوئے گلی میں چھلانگ لگادی اور دوڑنے ہی لگا تھا کہ اسے فوراً ہی رکن پڑا وہ لاشی عورت تھی جس کے بال اس کے چہرے پر گرے ہوئے تھے جس سے اس کا چہرہ پوری طرح ڈھکا ہوا تھا اس نے دونوں بازو پھیلا رکھے تھے جوائے لے تھے کہ گلی کی سائیڈوں کی دیواروں سے چھو رہے تھے عورت مسلسل ریحان کی طرف بازو پھیلائے بڑھ رہی تھیں۔

ریحان تیزی سے مڑا اور دوسری جانب دوڑ لگادی دائیں جانب گلی گھوم کر اس کی رفتار تیز ہو گئی تھی تب ہی اس نے دوڑتے ہوئے ڈرا پیچھے مڑ کر دیکھا





داریت جو یہ بیان کھیل کئی ماہ سے چپکے چپکے لکھ رہا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ

اس کا راز کسی پر فاش ہو جائے۔

ہو جائے گی درمیان کا راستہ سنسان ہے۔ بے شک تم  
میں ہوتے ہی نکل پڑنا۔“ بوڑھے گریڈ فادر نے اسے  
ٹوکا۔

”اوہ نو۔۔۔۔۔ نہیں ہو سکتا مجھے صبح آٹھ بجے دفتر  
پہنچنا ہے۔ باس کے ساتھ ایک اہم میٹنگ میں شرکت  
کرنی ہے۔“ اس نے وال کاک کی طرف دیکھا جو  
رات کے سوا دس بجے کی خبر دے رہا تھا وہ اپنے ہینڈ بیگ  
سے کار کی چابی نکالتی ہوئی بولی۔ ”دیر ہوئی جا رہی ہے  
مجھے اب نکلتا چاہیے۔“

”مگر۔۔۔۔۔ پیار گریڈ مدر نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر کچھ نہیں“ اس نے نانی کی بات کاٹتے

داریت کی تعریف لفظوں میں بیان کرنا  
اشک بات ہوگی۔ مختصر اُتار کدو مردانہ وجاہت کا ایسا  
نمونہ تھا جس کی مثال شاید ہی مل جائے۔ صنف نازک  
تواگ، اس کے ہم صنف بھی اسے دیکھ کر، اپنے دلوں  
کی دھڑکنیں ساکت ہوئی محسوس کر سکتے تھے بلاشبہ  
یہ حسین و جمیل مرد نظر آتے ہیں لا رات تو پہلی نظر میں  
اس پر مرثی تھی اس کی اور داریت کی پہلی ملاقات  
درامائی انداز میں ہوئی تھی وہ اپنی بیارگر ہینڈ کو دیکھنے  
ان کے قہقہے آئی تھی اور اب اپنے شہر روانہ ہونا چاہتی  
تھی۔

”مائی چائلڈ! تمہیں ہوش بچھتے رات مہری

ایسی بات ہوتی تو میں یہ بات تمام گاؤں بلکہ شہروں  
میں پھیل چکی ہوتی۔“ سرور خان نے وین نکالی اور  
آدھوں سے اسلحہ سمیت بھری وین چل پڑی تھی۔  
آدھے گئے بعد وہ رنگ پور میں داخل ہو رہے تھے۔  
گاڑی جیسے ہی گاؤں میں داخل ہو کر حویلی کی جانب  
بڑی ریحان حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں تو معمول کی  
چھل پھل تھی وہ گاؤں تھا ہی نہیں جس میں وہ داخل  
ہوا تھا گاڑی بلا خر حویلی کے میں سامنے پہنچ گئی۔ ان  
کے مزار سے شریفو نے گیت کھولا اور جیسے ہی اس کی  
نظر ریحان پر پڑی وہ خوش خوش شور مچانا اندر کی طرف  
بھاگا۔

”چھوٹے چوہدری صاحب آگئے چھو  
چوہدری جی آگئے۔“ ریحان اپنوں کے جلوس میں انہ  
چلا گیا مہمانوں کے مہمان خانے میں بیٹھا دیا گیا۔  
سارے واقعات چوہدری مراد کے گوش گزار کئے  
تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ حیرانی سے بولے۔  
”یہ ہوا ہے ایوینکین اب یہ سب دیکھ کر مجھے یقین  
نہیں آ رہا۔“

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“ چوہدری مراد نے  
کندھے اچکا کر کہا۔

”اب چھوڑیں ان ساری باتوں کو جو ہوا۔۔۔  
بھول جائیں۔“

”رات کا اندھیرا پھیل رہا ہے میں اب  
چلتا ہوں۔“ سرور خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کھانا کھا کر جانا۔“ جی چوہدری  
مراد نے کہا۔

”نہیں چوہدری صاحب پھر کبھی سہی۔“ سرور  
خان نے کہا اور رخصت ہو گیا اور ریحان پوری حویلی پر  
حیرت سے پھر ایک بار نظریں دوڑاتا ہوا سوچ رہا تھا  
رات کو جو اس کے ساتھ ہوا تھا وہ خواب تو نہیں تھا  
مگر نہیں وہ خواب بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

۴۰

تو پیچھے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا اب  
رات والے بھی اردن والے بھی سب اس کے تعاقب  
میں تھے۔

ریحان بھاگتے بھاگتے تھک کر گر اور بے ہوش  
ہو گیا جب اس کو ہوش آیا تو وہ بستر پر موجود تھا اور کئی  
اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا پچھلے  
واقعات یاد آتے ہی وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اس کے ارد گرد  
اجنبی چہرے تھے۔

”آپ لوگ کون ہیں۔“ ریحان کا لہجہ خوف زدہ  
تھا۔

”بیٹا میں سرور خان ہوں یہ گاؤں دندل پور ہے  
اور میں یہاں کا نمبردار ہوں تم ہمیں یہاں سے کافی  
دور بھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے ملے تھے  
ہمارے آدمی تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے ہیں تم کون  
ہو اور کہاں سے آئے ہو لباس سے تم کسی اچھے خاندان  
کے لگتے ہو۔“

”میرا نام ریحان ہے میں رنگ پور گاؤں کے  
چوہدری مراد کا بیٹا ہوں اگر لکچرل سائنس میں  
میں نے ماسٹر ڈگری کے حصول کے لئے پانچ سال  
امریکہ میں گزارے ہیں اور اب اپنا مقصد پورا کر کے  
واپس آ رہا ہوں، کل ہی یہاں پر واپس پہنچا اور پھر۔۔۔۔۔  
”ریحان نے اپنے ساتھ پیش ہونے والے تمام  
واقعات سرور خان کے گوش گزار کر دیے وہ ہونٹوں کی  
ماندہ منہ بھاڑے سارے واقعات سن رہا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ سرور خان نے حیرت سے  
کہا۔

”یہ سب سچ ہے کہ سرور خان صاحب اور میرے  
ساتھ ہو چکا ہے مجھے حیرت یہ ہے کہ ایسی چیزوں کا تصور  
بھی نہیں کیا جا سکتا میں زیادہ حیران تو اس بات پر ہوں  
کہ میرے ماں باپ خاندان کے لوگ اور گاؤں والے  
آخر گئے کہاں؟“ ریحان نے کہا۔

”نام زیادہ نہیں ہوا میں خود تمہارے ساتھ  
چلتا ہوں رنگ پور کا فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں ہے



ہوئے ان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور اپنا دایاں گال ان کے بائیں رخسار سے چھوئی ہوئی کہنے لگی۔  
”میں چھوٹی، ناکھچہ پچی نہیں ہوں، جو آپ دونوں یوں خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ مجھے اپنی حفاظت کرنی آتی ہے اور ہاں میں ہوش بچنے ہی اپنی خیریت کی اطلاع کر دوں گی۔ بس آپ اپنا فون آئینج مت رکھئے گا اچھا اب خدا حافظ۔“ وہ ان دونوں کو ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ آبادی سے دور نکل چکی تھی۔ ابھی پون گھنٹے کا سفر مزید باقی تھا کہ کار کے ٹائر بری طرح چرچرائے۔  
”اُف خدایا۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ باہر نکل کر دیکھا تو کار کا ایک ٹائر پھٹ کر ہو گیا تھا۔ ”وہ یہ تو بہت برا ہو گیا۔“ وہ پریشانی سے بوڑرائی۔ ایسے کڑے وقت وہ سوائے پریشان ہونے کے کیا کرتی۔ جب اس کے پاس ایکسٹرانٹریر بھی موجود نہیں تھا۔

”بھڑا میں جائے باس اور مینٹنگ۔ مجھے گریڈ فادر کے گھر سے واقعی نہیں نکلتا چاہئے تھا۔“ اس نے خود کو لعنت و ملامت کرتے ہوئے اپنے اطراف کا جائزہ لیا خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ آبادی سے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی تھی آبادی کیا تھی بس دس بارہ مکانات تھے۔ لارا کے خیال میں نیا آباد ہونے والا علاقہ تھا۔

”مجھے ہیلپ ضرور مل جائے گی۔“ اس نے کہے یقین سے سوچا چاند پورا تو تھا مگر قریب کی تاریکیوں کا ضرور تھا۔ سوراستے میں چلنے کی کسی قسم کی دشواری و وقت اٹھانے سے وہ باآسانی بچ گئی تھی وہ بہت جلد سنان آبادی کے علاقے میں داخل ہو گئی تمام مکانات ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بنے ہوئے تھے کبھی مکانات کی بتیاں گل تھیں سوائے ایک دو منزلہ خوبصورت مکان کے۔

”مجھے اسی طرف جانا چاہئے۔“ اس نے روشنی میں نہاے مکان کو دیکھتے ہوئے خیال کیا۔ اس نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر کال ٹیل بجائی چند لمحوں بعد اس کی

آنکھوں کے سامنے ستائیس اٹھائیس برس کا ایک آدمی کھڑا تھا۔

لارا بری طرح ٹھیک گئی تھی۔ وہ آدمی اس قدر خوبصورت تھا کہ وہ اپنی ٹیکس جھپکاٹا بھول گئی۔ بس ایک ایک اسے گھورے جارہی کی اپنی چوبیس سالہ زندگی میں اس نے آج تک اتنے سینکڑوں نہیں دیکھا تھا ”فرمائیے۔“ وہ جس قدر سناٹا کن شخصیت کا مالک تھا اس کی آواز میں اسی قدر اکتاہٹ و بیزارانی شامل تھی لارا کے خیال میں وہ نیند سے بیدار ہونے پر چڑ گیا تھا۔

”اسے مفرد ہونا بھی چاہئے۔“ لارا نے اس کی خوبصورتی کو دل میں سراپے ہوئے سوچا۔ ”میری کار کا ٹائر پھٹ کر ہو گیا ہے اور اضافی ٹائر بھی میرے پاس نہیں مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔“

”آئیے اندر تشریف لے آئیں۔“ اس نے اس دفعہ شائستہ لہجے میں کہا اور ایک طرف ہو گیا۔ وہ قدر قدر جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”کیا آپ اکیلے رہتے ہیں۔“ لارا کو اور کوئی دکھائی نہیں دیا تو اس نے استفسار کیا۔  
”جی ہاں۔“ اس نے مختصر جواب دیا وہ بڑے سے ہال نما کمرے میں لے آیا۔ جو صاف کے لحاظ سے ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔

”تشریف رکھیں۔“ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔ اور کمرے سے باہر نکل گیا لارا سمٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ چلا آیا اس کے دائیں ہاتھ میں ایک عدد ٹائر ہونے کے علاوہ دوسرے ہاتھ میں بائیں ضروری سامان بھی تھا۔ لارا کھڑی ہوئی اور معذرت خواہ لہجے میں بولی۔ ”تکلیف دینے کی معافی چاہتی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بڑی دلکشی سے مسکرایا تو لارا اس کی اس ادا پر فدا ہو گئی۔ ”چلئے میں ٹائر تبدیل کر دوں۔“ وہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا تو لارا نے اس کی

کی ہیر دی کی۔

کچھ دیر بعد وہ نیا ٹائر لگا چکا تھا۔ ”لہجے محترمہ، آپ کا کام ہو گیا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ جھاڑتا ہوا کھڑا ہو گیا اور کار کا فرنٹ ڈور کھول دیا۔ جس کا مطلب تھا کہ لارا کو اپنی منزل کی جانب گامزن ہو جانا چاہئے۔  
”مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔“ لارا نے ڈرائیونگ سیٹ پر براہمان ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مسکراتے لگا۔ ”اور مجھے بھی۔ کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”کب۔۔۔۔۔ کیوں نہیں۔“ لارا کی سانس خوشی سے پھولنے لگیں اس نے براہدالی سیٹ پر پڑا ہینڈ بیگ اٹھایا اس میں سے پین اور پاکٹ سائز ڈائری نکالی اور تیزی سے لکھنے لگی۔ ”یہ میرا موبائل فون نمبر ہے آپ کا موبائل چاہے آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔“ اس نے ڈائری کا صفحہ پھاڑ کر اس کے حوالے کیا۔

”ٹھیک ہے اب جاؤ۔“ یکدم اس کا لہجہ خشک ہو گیا اور وہ لمبے لمبے ڈنگ کرتا ہوا اپنے مکان کے اندر چلا گیا لارا تعجب خیز نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ ”موڈی معلوم ہوتا ہے۔“ اس نے کندھے اچکا کر سوچا اور گاڑی اسٹارٹر کر کے آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ سوزن کے کان کھانے میں مصروف تھی۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتیں وہ کتنا خوبصورت ہے اگر تم بھی اسے دیکھ لو تو بھنا میری طرح پاگل ہو جاؤ۔ اور جب اس نے مجھ سے دوبارہ ملنے کا کہا۔ تب میں خوشی کے مارے بدحواس ہوئی تھی۔“

”اور بھئی اب تمہیں اس نامعلوم نام کے ہیر دی کال کا انتظار ہوگا۔“ سوزن نے تیرہ کہا۔

”کیا نہیں ہونا چاہئے۔“ لارا نے تملاکر الٹا سوال دافا۔ ”اور اگر اس تم سے رابطہ نہیں کیا تو۔۔۔۔۔؟“

”تو بھی میں اس کا تاحیات انتظار کروں گی۔“ مگر عمر بھر کے انتظار کی نوبت نہیں پڑی رات کے

پونے ایک کا وقت تھا وہ بیڈ پر لیٹی سسپنس سے بھرپور ناول پڑھ رہی تھی اور جب وہ انتہائی دلچسپ موڈ پر پہنچی تو موبائل فون کی چمکناٹ ٹیل نے غفل ڈال کر اس کا موڈ خراب کر دیا۔ ”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے منہ ہٹاتے ہوئے سوچا۔ پھر ناچاہتے ہوئے موبائل فون ہاتھ میں لے لیا۔ سی ایل آئی اسکرین پر دیکھی تو سخت متعجب ہوئی۔۔۔۔۔ کیونکہ اسکرین پر بجائے کسی نمبر کے oocall درج تھا۔ اس نے بدستور حیرت زدہ ہوتے ہوئے موبائل فون اپنے کان سے لگا لیا اور مخصوص انداز میں بولی۔ ”لارا اسپیکنگ۔“

”آئی ایم رابرٹ۔“ دوسری جانب سے ایک جانی پہچانی خوبصورت آواز ابھری۔  
”اچھا! تو آپ کا نام رابرٹ ہے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”لگتا ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔“  
”ہاں بھلا! میں اپنے شخص کو کیسے بھول سکتی ہوں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے گہرا سانس کھینچا پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔“ لارا جھوم گئی۔ ”آپ جگہ اور وقت کا تعین کیجئے۔ میں آ جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے پھر وہیں چلی آنا۔ جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔“  
”یعنی آپ کے گھر۔“ لارا نے اپنے اندازے کے تائید جاری کی۔

”ہاں تم درست سمجھیں کل رات بارہ بجے یا بارہ سے کچھ وقت اور بھی تم میرے گھر آ سکتی ہو۔ دراصل میری دفتر سے واپسی ساڑھے گیارہ بجے یا بارہ بجے تک ہوتی ہے پھر پرسوں مجھے بزنس کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے لندن جانا ہے اور میں روانگی سے قبل تم سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی تو لارا نے مطمئن ہو کر ہاں بھری۔



صبح وہ سوزن کو اپنی اور رابرٹ کی ملے شدہ ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی۔ "لارا! تمہیں وہاں ہرگز نہیں جانا چاہئے تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتیں وہ کون ہے؟ اور جانے اس کا مقصد کیا ہو؟ اتنے دیرانے میں وہ بھی اتنی رات گئے جانا دانشمندی نہیں ہے۔" سوزن نے اسے غلصانہ مشورہ دیا۔

"افوہ! ایسی باقی بند کرو" لارا نے جمل کر اسے ٹوک دیا۔ "انھو میرے ساتھ بازار چلو میں آج کی ملاقات کے لئے ایک بہترین لباس خریدنا چاہتی ہوں۔"

سوزن کچھ دیر اسے تاسف سے گھورتی رہی پھر کسی خیال کے تحت ہوئی۔ "تمہاری مرضی مگر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" لارا نے اس کی بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

رات کو وہ دونوں "ورکنگ ڈومس ہاسٹل" سے بہانہ بنا کر رخصت ہو چکی تھیں وہ سوا بارہ بجے کے قریب اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچیں۔ "تم اندر جاؤ۔ میں یہیں موجود ہوں کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتا مجھے میرے موبائل پر فوراً کال کر لینا۔" سوزن بائسکٹ چمچیں مشہور تھی اور اسے اپنی طاقت پر بہت ناز رہتا تھا مگر جانے کیوں وہ اندر جانے سے گھبرا رہی تھی وہ باہر ہی کھڑی رہنا چاہتی تھی۔

"تم حد سے زیادہ ٹکی مزاج ہو" لارا نے ہنستے ہوئے کہا اور روشنی سے پر نور رابرٹ کے مکان کی جانب چل دی۔ اس نے کال بیل بجای تھی کہ رابرٹ نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ "کیا آپ دروازے سے چپکے کھڑے تھے۔" لارا نے اندر داخل ہوتے ہوئے مذاق کیا۔

"مجھے سمجھ لو" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "میں سخت بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"اور میں بھی تم سے ملنے کو بے قرار تھی۔" لارا نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"آؤ چھت پر چلتے ہیں" رابرٹ بولا۔ "مجھے کھلی

فضا میں کپ شپ کرنا اچھا لگتا ہے یہ میرا پسندیدہ شغل ہے۔" وہ دونوں چھت پر چلے آئے اور باتیں کرنے لگے۔

"یہ چودھویں کا چاند کتنا خوبصورت دکھائی دے رہا ہے۔" رابرٹ کی نظریں روشنی بکسیرتے ماہتاب پر ٹھہر گئیں۔ لارا بھی دچکھی کے ساتھ پورے چاند کا دیدار کرنے لگی۔

"چودھویں کے چاند کی کرنیں جب بچہ پڑتی ہیں تو میں آپ سے باہر ہو جاتا ہوں پھر مجھے کوئی دوس بات نہیں رہتا بس پھر میرے دماغ پر ایک ہی بات سوار ہو جاتی ہے۔" رابرٹ نے نظروں کا ڈوبہ بدلا۔ لارا کی صرخی دار گردن کی پھولی پھولی رنگوں کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے غمگین دیکھا۔ دیکھا سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ذرے پھیلنا شروع ہو گئے۔ آگے کے دانت نوکیلے ہو کر باہر نکل آئے۔ اس وقت اس کا خوبصورت چہرہ انتہائی خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

لارا اس کی مدھوش کر دیے والی آواز سننے میں اس قدر گمن تھی کہ اسے رابرٹ میں ہونے والی واضح تبدیلی کا احساس تک نہ ہوا اور جب اس کی نظر بھیا تک وحشی رابرٹ پر پڑی تو وہ بری طرح چپٹی چلی گئی۔

مکان کے سامنے کھڑی سوزن جانے کسی سوچ میں غرق تھی کہ رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی لارا کی چیخیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں سوزن کی تمام تر حسیات بیدار ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے موبائل فون سے فوراً لارا کا نمبر ملایا۔

"نت۔۔۔۔۔ تم" لارا کی حالت غیر ہو چکی تھی وہ بری طرح کپکپانے میں مصروف تھی رابرٹ کا خوبصورت چہرہ اس وقت کسی خوفناک بھیڑیے کی مشابہت اختیار کیے ہوئے تھا اور اس کے حلق سے "خرخر" کی بھیا تک آوازیں نکل رہی تھیں جو لارا کو مزید خوفزدہ کر رہی تھیں۔

وہ اس کی سمت بڑھنے لگا اور اسی وقت لارا کا موبائل فون بج اٹھا اور لارا کے سبے ہوئے چہرے پر قدرے اطمینان پھیل گیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑا موبائل فون رابرٹ کے سامنے لہرائی ہوئی بولی۔ "مم۔۔۔۔۔" میری دوست تمہارے مکان کے سامنے کھڑی ہے تم۔۔۔۔۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہو۔" رابرٹ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ وہ ایک دوہشت ناک مسکراہٹ لبوں پر لا کر رہ گیا جس کا مطلب تھا کہ اسے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ لارا نے نیچے بھاگنا چاہا۔۔۔۔۔ مگر صد افسوس کہ وہ اپنا پچاؤ نہ کر سکی۔

☆.....☆.....☆

سوزن نے بند دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا اس نے دیوار دو دروازے کو دیکھا جو برت انگیز طور پر اونچے ہوتے جا رہے تھے تب اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سوچا کہ اس پاس بسنے کی گھر سے اسے مدد لینی چاہئے وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی ایک کھری طرف دوڑی وہ گیٹ پیٹنے کے ساتھ ساتھ بری طرح چلا رہی تھی چند لمحوں بعد ایک معمر آدمی باہر نکلا اس کی آنکھیں بند سے بند ہو رہی تھیں مگر دروازے پر چپٹی لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ "کیا بات ہے کون ہو تم لڑکی؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ۔۔۔۔۔ وہ ادھر" سوزن کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

"تم کچھ پریشان معلوم ہو رہی ہو۔ اندر آ جاؤ۔"

معمر آدمی نے پراخوں پیش کش کی۔

"نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ وہ مکان آپ دیکھ رہے ہیں ناں"

سوزن نے رابرٹ کے گھر کی جانب اشارہ کیا۔ "ادھر میری دوست آئی ہے رابرٹ سے ملنے لیکن اندر کچھ گڑبگڑتی ہے آپ براہ کرم میری مدد کیجئے۔" سوزن ہلکیانہ لہجے میں بولی۔

"رابرٹ کے گھر؟" وہ آدمی چونکا۔ "مگر کیوں؟ رابرٹ کا مکان تو ایک عرصے سے قفل زدہ ہے کیا وہ رابرٹ کی کوئی رشتہ دار ہے؟ اور تمہیں کس قسم کا خطرہ محسوس ہوا ہے۔۔۔۔۔؟"

"رابرٹ نے اسے آج اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی" وہ تیزی سے کہنے لگی۔ "مم۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ دیکھئے آپ باتوں میں وقت ضائع مت کیجئے بس جلدی سے۔"

"افوہ لڑکی جانے تم کیا کہہ جا رہی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" آدمی نے ہلکا سا اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "رابرٹ کسی کو بھلا کیسے دعوت دے سکتا ہی اس کا انتقال ہوئے دس ماہ گزر چکے ہیں۔"

"واٹ" سوزن پوری قوت کے ساتھ چپٹی۔ "لل۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ آپ دیکھئے اس کا مکان کتنا روشن ہے۔"

آدمی نے پچھلے تاریکی میں ڈوبے مکان کی طرف دیکھا پھر اسے ناگواری سے گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو تم پاگل معلوم ہوتی ہو۔ ذرا آنکھیں پھاڑ کر دیکھو۔"

سوزن نے رابرٹ کے مکان کی جانب دیکھا وہاں واقعی مکمل اندھیرے کا راج تھا۔ "چلو بھائی یہاں سے" آدمی نے اسے ڈپٹ کر دروازہ بند کر لیا۔

سوزن گرتے پڑتے کار کی طرف بھاگی۔ وہ یہاں سے جلد از جلد روانہ ہونا چاہتی تھی لیکن لارا کی طرح اسے بھی جان بچانے کا موقع نہیں ملا۔

رابرٹ کے مکان سے رابرٹ کے دو ہاتھ لیے ہو کر اس تک پہنچنے اور اس کی گردن کو دو بوج لیا۔ سوزن بری طرح تڑپتی رہی مگر کچھ دیر بعد اس کا جسم ڈھیلا پڑتا چلا گیا۔

رابرٹ جو یہ بھیا تک کھیل کئی ماہ سے چپکے چپکے کھیل رہا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر لیتا کہ اس کا راز کسی پر فاش ہو جائے۔

☆



لحہ بہ لحہ بدلتے حالات و واقعات، سسپنس اور خوف میں ڈوبی روداد جو پڑھنے والوں کو اپنی سحر میں جکڑے رکھے گی۔

”ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔ کیا ان دونوں بہن بھائیوں کے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔“

”یہی..... ایک حیران کن بات ہے۔ بظاہر تو اچھے ہیں لیکن اتنے گہرے نہیں۔ جتنے ہونے چاہئیں۔ میرا خیال ہے مبینوں شاہ دل اپنی بہن سے نہیں ملتے۔“

”بہر حال جس سازش کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ وہ اس قدر سادہ انداز میں نہیں کی جاتی اور میں کٹے الفاظ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ تھوڑا سا شبہ شاہ دل کی طرف بھی جاتا ہے۔“

”بظاہر نہیں ہے۔ اگر شاہ دل اتنا ہی سازشی ہوتا تو وہ کوئی ایسا گہرا کھیل کھیلتا کہ خود اس میں ملوث نظر نہ آتا۔ یہ بات میں نے بھی سوچی تھی۔ بہر صورت میری خواہش ہے کہ تم اس سلسلے میں بھرپور کوشش کرو۔ اور ہمیں ہمارے دشمنوں سے روشناس کرا دو۔ اگر وہ

ہمارے اپنے ہی نکلے تو ہم ان سے یہ سوال تو کریں گے کہ آخر انہیں ہم سے کیا شایستگی تھی۔ اگر شاہ دل جاگیر کا کام سنبھالنا چاہیں تو کل سنبھال لیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ حالانکہ جاگیر دار صاحب نے ہمیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ لیکن اس میں ہمارا قصور تو نہیں تھا۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ جو کچھ بھی ہوگا بہتر ہی ہوگا۔ میں خلوص دل سے آپ کو ان الجھنوں سے نکالنا

چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور خانم کی نگاہوں میں عجیب سا تاثر اُبھر آیا۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اور اس وقت ان آنکھوں میں ایک عجیب سی پیاس تھی۔ ایک ایسی تپ جیسے میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس تپ کا پس منظر میں اسے ذہن میں دوڑاتا تو یقیناً مجھے سسپی کا شکار ہونا پڑتا۔ لیکن میں ایک بہت بڑی عورت کے سامنے تھا۔ جو ہماری کاکڑوں بھی تھی۔ اگر اسے میری کوئی بات ناگوار نہ رہتی تو میرے لئے دشواریاں بھی پیدا کر سکتی تھی۔ وہ بہر حال میں نے اس سے اجازت چاہی۔

”بہت بہت شکریہ..... اب ہمارے بھرپور طریقے سے کام کرو۔ ہم تم سے بہت سی باتیں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ شریا میری خوابگاہ ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس سے کہا۔

”جب بھی میں تمہیں دیکھتا ہوں شریا ایک عجیب سا احساس ذہن میں جاگ جاتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ جلدی تو نہیں ہے تمہیں۔“

”نہیں سرکار۔“

”رات کو آ سکتی ہو۔ باتیں کریں گے۔“ شریا شرما گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لئے۔ ”ہاں،..... پھر آؤ گی۔“ میں نے سوالیہ کیا اور اس نے گردن ہا



کی اور باہر بھاگ گئی۔ میرے ذہن میں بے شمار خیالات کروٹ بدل رہے تھے۔ پھر رات کو تقریباً ایک بجے شریا آگئی۔ اس نے اچھا سا لباس پہنا ہوا تھا۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ وہ میرے بستر کے قریب آکر کھڑی ہوئی۔

”تمہارے آنے کی کسی کو خبر تو نہیں ہوئی۔“  
”نہیں سرکار۔“ شریا نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

میں بہر طور شریا کو اس بارے میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”تم ایک عزت دار لڑکی ہو شریا یہ مت سمجھنا کہ میں نے کسی غلط مقصد کے لئے یہاں بلایا ہے۔ بس تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں تمہیں ایک تحفہ بھی دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا اور اس کے بعد میں نے وہ انگلی اس کے حوالے کر دی۔ جو میرے پاس پہلے سے موجود تھی۔ اور میرے سب سے چھوٹی انگلی میں آتی تھی۔ شریا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی پھر میں نے اس سے کہا۔

”میں ہمیشہ ایک بات سوچتا ہوں۔ تم مجھے خانم سے زیادہ اچھی لگتی ہو۔ میرے خیال میں خانم تو تمہیں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے ایک بات بتاؤ۔ بتاؤ گی ناں۔“  
”جی کیوں نہیں۔“ شریا انگلی لے کر مطمئن ہو گئی تھی۔

”یہ ماخانم اپنی راتیں کیسے گزارتی ہیں۔ جو ان خاتون ہیں۔ کسی سے کوئی چکر تو نہیں چلایا ہوا انہوں نے۔“

”نہیں سرکار! ہم نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ ہاں بس ایک بات ہے جسے آپ بُرا سمجھیں یا اچھا۔“

”کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔  
”بدھ کی رات کو وہ بڑے گرجا کے پیچھے جاتی ہیں۔ وہاں کشتیوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ خانم جی کو یہ مقابلے دیکھنے کا بہت شوق ہے اور ایک بات اور بتائیں آپ کو۔ وہ ان کشتیوں میں چھپ کر جاتی ہیں۔“

میں کو نہیں معلوم سوائے ہمارے۔  
”ارے واہ..... تو تم ان کی رازدار بھی ہو۔“

”جی ہاں ایک مرتبہ ہمیں لیکر گئیں تھیں اور یہ تاکید کی تھی کہ کسی کو نہ بتائیں۔ اس کے علاوہ ہم نے رات کو سوتے ہوئے خانم جی کے بستر پر مردوں کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ بچے لگے ہوں انوں کی تصویریں۔ وہ ان تصویروں کو بڑا اچھا کرتی ہیں۔ ہم نے بستر صاف کرتے ہوئے دیکھ لی تھیں۔“

”کبھی ان کی خواہگاہ میں تم نے کسے مرد کو نہیں دیکھا۔“

”کبھی نہیں سرکار۔“

”بہر حال تم اپنے مالک کی بہت وفادار ہو لیکن کیا تم مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟“ میں نے اس پر وار کیا۔  
”سب کچھ بھول کر آپ کے پاس آگئے ہیں تو آپ سے کچھ چھپائیں گے بھی نہیں۔ ہم نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔“

”یہ شاہ دل مجھے بہت چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جانتی ہو اس نے کیا کہا۔“ میں نے دوسرا وار کیا۔  
”کیا سرکار۔“

”کہتا ہے کہ خانم جی اچھے کردار کی مالک نہیں ہیں۔“

”کیا چھوٹے سرکار نے ایسی بات کہی۔“

”ہاں..... تمہیں حیرت کیوں ہوئی۔“

”سرکار وہ تو بڑے اللہ والے ہیں، کسی کی برائی نہیں کرتے ہیں۔“

”کچھ بھی ہے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے ایجنہ کی شہ پر یہ بات کہی ہو۔“

”ارے نہیں سرکار ان دونوں میں کہاں ہنسی ہے۔“

”چاہے چاہے دار صاحب کے زمانے سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ نجانے کیا پیر ہے ان دونوں میں۔ مہینوں ایک دوسرے کی فٹل نہیں دیکھتے۔“

”چھوڑو ان باتوں کو۔ بہر حال اور اس سے زیادہ کچھ اور نہیں معلوم ہو سکا۔ پھر اس کے بعد شریا چلی

گئی۔ میں بستر میں لیٹ کر اس کی باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ماخانم کے بارے میں یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا۔ کہ وہ تھوڑی سی ذہنی طور پر ہنگامی ہوئی ہے۔ بہر حال اس کی وجہ میرے سامنے تھی۔ میں دیر تک خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس کے بعد میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اپنے جگہ سے اٹھ گیا۔ پھر میں نے وہ لباس پہنا جو ایسے مہمانی عمل میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس عمارت میں اچھے خاصی پہرے داری ہوتی ہے۔ بہر حال اس کے باوجود میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ جو کسی بھی طرح مشکوک ہیں وہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ باہر نکل کر میں تاریک راستوں میں آگے بڑھتا ہوا۔ شاہ دل کی رہائش گاہ کی طرف چل پڑا۔

کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی تھی۔ لیکن رہائش گاہ میں روٹی دیکھ کر میں چونک پڑا۔ میں نے کسی ایسی جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ جہاں سے میں رہائش گاہ کے اندر جانا سکوں۔ اور مجھے ایک ایسی جگہ مل گئی۔ بہر حال میں نے دیکھا کہ شاہ دل جائے نماز بچھائے بیٹھا پنج پڑھ رہا ہے۔ اس پاس میں بھی کوئی نہیں تھا۔ اگر یہ شخص اتنا عبادت گزار ہے تو پھر یہ شخص ٹھیک ٹھاک آدمی ہے۔ لیکن وہ شخص جو اس کے کمرے سے نکل کر گیا تھا۔ وہ میرے لئے ابھی تک مشکوک تھا۔ کچھ دیر بعد میں وہاں سے واپس پلٹا اور اب میرا رخ ایجنہ کی طرف تھا۔ یہ راستہ سب سے تکلیف دہ اور بُرے خطر تھا۔

ایجنہ کی حفاظت کے لئے جہاں محافظوں کا تقرر کیا گیا تھا وہ ضرورت سے زیادہ ہی چوکس تھے۔ چنانچہ اس طرف سے داخلہ ممکن نہیں ہو سکا۔ میں نے زیادہ جدوجہد بھی نہیں کی۔ عمارت کا ایک طویل چکر لگانے کے بعد میں آخر کار وہاں لیٹ پڑا اور اس وقت میں ہا خانم کی خواہگاہ کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں نے ان کے محافظوں کو دیکھا جو سوئے ہوئے تھے۔ اور اس کے بعد یہ اندازہ لگا کر کہ ان محافظوں کی موجودگی میں تو ہا خانم خطرے میں ہے۔ میں وہاں سے آگے بڑھا کہ

اچانک ہی مجھے اچھل کر ایک ستون کی آڑ لیٹا پڑی۔ میں نے سیاہ لباس میں ملیوں ایک شخص کو مشکوک انداز میں ہا خانم کے کمرے کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ مخصوص طریقے سے چھپایا ہوا تھا۔ میں چند لحاظ اندازہ لگا تا رہا اور اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ مجھے کام شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ میں شکار کے زد میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس وقت میری کیفیت بالکل ویسی ہو گئی جیسی عموماً کسی شکار پر گھات لگانے والے چیتے کی ہوتی ہے۔ ناظم پاشا نے مجھے اس سلسلے میں چیتا ہی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ میری اس کیفیت سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اور دو تین بار اس نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ کبھی کبھی تم تو بالکل ہی چیتے لگتے لگتے ہو۔ بہر حال جیسے ہی وہ میری زد پر آیا، میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ کسی ایسے شکار کو قابو میں کرنے کے لئے مخصوص طریقہ کار استعمال کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کیا۔ اس طرح کہ اس کی ناک بھی زد میں تھی۔ اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن قابو میں کر کے اس کے دونوں پاؤں مفلوج کر دیئے۔ میرے شکار نے بھرپور جدوجہد کی لیکن وہ اس جدوجہد میں ناکام رہا تب میں نے اس پر ایک مخصوص ضرب لگائی۔

اور اب اس کی گردن کو اپنے ہاتھ میں سمیٹ لیا اور اب وہ بیکار تھا۔ بہر حال میں نے اسے کندھے پر ڈالا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے کمرے میں میرے بستر پر تھا۔ وہ ہوش میں تھا۔ لیکن تکلیف ہے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح رہا اور اس کے بعد میں نے اسے سیدھا کر دیا۔

”ہاں..... جواب شروع ہو جاؤ۔ کون ہو اور کیا ہو اور اگر مجھے جانتے ہو تو بھی اور اگر نہیں جانتے تو بھی۔“

”اوہ..... جج..... جج..... جی میرا نام..... میرا نام..... فیروز خان ہے۔ میں خانم کا ایک خادم ہوں اور







ہوئے ہیں۔ کوئی اہم مسئلہ ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ جب واپس آ جائیں تو اطلاع دینا اور ان سے کہنا کہ مجھ سے بات کریں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ہم لوگ تھوڑے سے اصولوں کے قائل تھے۔ اگر کوئی کسی خاص معاملے میں مصروف ہوتا تھا۔ تو موبائل فون پر اسے فون کر کے اس کے کام کو خراب نہ کرنے کی ذمہ داری ہم سب پر لگی ہوئی تھی۔ پھر میں وہاں سے نکل آیا۔ اور اس کے بعد میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کیلئے میں ایک ہوٹل میں داخل ہوا لیکن وہاں ایک شخص کی طرف دیکھ کر میں ایک دم سے سنبھل گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو شاہ دل کے کمرے سے باہر نکلا تھا۔ میں نے اس کی جانب رخ کیا اور آرام سے کرسی چھیت کر بیٹھ گیا۔  
 ”کون ہیں آپ، اور یہاں کیوں اس طرح بیٹھ گئے ہیں۔“  
 ”آپ مجھے پہچانتے ہیں مسٹر اور مجھے بھی آپ کے بارے میں خاصی معلومات ہیں۔ اب آپ یہ فرمائیے کہ آپ یہاں کس چکر میں آئے ہوئے ہیں۔“ میری آواز اور میرا لہجہ کا رگر ہوا۔ وہ شخص کچھ بولکھلا سا گیا۔ لیکن پھر اس نے سنبھل کر کہا۔  
 ”کیوں کیا کسی جگہ رہنا یا آ جانا کوئی جرم ہے۔“  
 ”نہیں لیکن آپ جو کچھ آج تک کرتے رہے ہیں۔ اس کے سلسلے میں آپ دیکھ لیجئے کہ آپ اس جگہ قیام کو کس نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور پھر کچھ سوالات بھی کرنے ہیں مجھے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ بتائیے کیا بات ہے؟“  
 ”آپ میرے ساتھ آئیں گے ذرا۔ آج کچھ کام ہے۔“ میں نے کہا اور میرے ساتھ آنے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اپنی ڈرائیو کرتے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔“  
 ”میرا نام جمال خان ہے۔“  
 ”گڈ..... تو جمال خان صاحب آپ یہاں دیکھ کر بولا۔“  
 ”کیا۔“  
 ”کک..... کون سی کرسی۔“ وہ چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

کب سے رہ رہے ہیں۔“ میں نے گاڑی کا رخ اس عمارت کی طرف موڑتے ہوئے کہا اور میں نے جب وہاں روکی تو وہ حیران سے بولا۔  
 ”یہ تو غیر آباد معلوم ہوتی ہے۔ اور میرے علم میں ہے یہ کہ یہاں سب زندہ بھی ہے۔“  
 ”بالکل..... آپ کا مجھ سے اس وقت تعارف نہیں ہوا۔ اس عمارت کا آسمان میں ہی تو ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا واقعی آپ اس عمارت میں تنہا رہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔ آپ کے بیوی بچے؟“  
 ”سب ہیں۔ لیکن سب کے سب آسیب۔“  
 ”میں نے کہا۔ اس عمارت میں جو تیاریاں میں کر کے گیا تھا۔ انہیں استعمال کرنے کا وقت بالکل اتفاقیہ طور پر سامنے آ گیا تھا۔“  
 ”آپ ہیں رہتے ہیں۔“ اس نے حیرت سے کہا۔  
 ”ہاں۔ لیکن آپ کو تعجب ہو رہا ہوگا۔ اصل میں ہم لوگوں کے لئے زیادہ ضرورت کہاں پر ہوتی ہے۔ جب ہم بھی اس دنیا میں ہوا کرتے تھے۔ تو ہمیں بھی ساری ضرورتیں ہوا کرتی تھیں۔“  
 ”کک..... کک..... کیا مطلب۔“ جمال خان کا رنگ بدلنے لگا۔  
 ”کیا ایک آسیب کا مہمان بن کر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ اس عمارت میں آسیب رہتے ہیں اور پھر میں ذرا جدید قسم کا بھوت ہوں۔ میرے بیوی اور بچے زندہ انسانوں کے سامنے نہیں آتے۔“  
 ”آپ شاید مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ جمال خان نے کہا۔  
 ”یہ کرسی نظر آرہی ہے آپ کو؟“ میں نے سوال کیا۔  
 ”کک..... کون سی کرسی۔“ وہ چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

”براہ کرم بیٹھیے۔ یہ..... یہ جو کرسی ہے۔“ میں نے کہا اور اس طرح اس کے دونوں شانوں پر دباؤ ڈالا۔ جیسے کرسی پر بٹھا رہا ہوں۔ نتیجتاً جمال خان زمین پر گر گیا۔  
 ”یہ کیا بد تمیزی ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم کسی خاص مقصد کے لئے مجھے یہاں تک لائے ہو۔“  
 ”اتنی جلدی مجھ گئے آپ چلیے۔ پھر باقاعدگی سے ایک دوسرے کو سمجھ لیتے ہیں۔“ میں نے کہا اور آستینیں چڑھا لیں۔ ”تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔ جانتے ہو میں کون ہوں؟“  
 ”یہ ہی تو جانا چاہتا ہوں۔“  
 ”بڑے بڑے لوگ میرے نام سے کانپتے ہیں۔ میرا نام جمال خان ہے۔“  
 ”تو خان صاحب آئے ذرا۔“ میں نے کہا اور وہ تھلا ہٹ میں مجھ پر دوڑ پڑا لیکن میں یہی چاہتا تھا۔ میرے ایک اٹنے ہاتھ نے اسے پھر اپنی جگہ واپس بھیج دیا۔  
 ”ہاں..... جمال خان۔ تمہیں یہاں آنے کی دعوت کس نے دی تھی۔“ میں نے سوال کیا لیکن جمال خان نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چاقو نکال لیا تھا۔ میں خود ہی آگے بڑھا اور اس نے بڑی چھری سے چاقو دالا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ لیکن ناظم پاشا بھی میری چھری اور مہارت کا قائل تھا۔ میں نے پلٹ کر ایک رخ نشانہ لگا دیا اور پھر میرے جوتے کی نوک نے چاقو جمال خان کے ہاتھ سے نکال دیا اور اب وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے مخصوص انداز میں ایک ایسی جگہ پھونکا۔ جو رشتے کے کافی اونچی تھی۔ ایک لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ چاقو لکڑی میں بیٹھ گیا۔  
 ”ہاں..... کس نے تمہیں یہاں بلا یا تھا۔ جواب دو گے۔“  
 ”اور تم کون ہو؟ پہلے مجھے یہ بتاؤ۔“  
 ”سوال صرف میں کروں گا۔ جمال خان صرف میں نے کہا اور جمال خان غصے سے دیوانہ ہو گیا۔

گیا۔ لیکن دیوانگی تو ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اگر وہ میرے بدن کو چھو لیتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ہاں میرے جوتے کی ٹھوکروں نے اس کے بدن پر جگہ جگہ نیلے نشانات بنا دیئے۔ پھر میں اس کو اس وقت تک مارتا رہا۔ جب تک وہ زمین پر ہاتھ لگا کر رکنے کے قابل ہو گیا۔ پھر وہ زمین پر جیت لیٹ گیا اور اب میں نے اپنی پینٹ سے بیٹ نکال لی تھی۔  
 ”سنو! اگر تم نے میرے سوالات کا صحیح صحیح جواب نہ دیا تو تمہارے پورے جسم پر زخم ہی زخم ہوں گے۔“ جمال خان خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔  
 ”میں حالات سے بھی واقف ہوں اور تمہارے آنے کے مقصد سے بھی۔ اس لئے یہ مت بھولنا کہ غلط بیانی تمہاری زندگی چھین لے گی۔ اس آسیب زندہ عمارت میں بہت سے کٹر ہیں۔ جو بہہ کر دور تک چلے جاتے ہیں۔ یہ کٹر تمہاری لاش کا سراغ بھی نہیں کھنڈے دیں۔ ہاں۔ اب جواب دو۔ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے۔“  
 ”سس..... سنو..... میرا مطلب ہے۔ شاہ دل نے..... شاہ دل صاحب نے۔“  
 ”ہوں..... ٹھیک..... بالکل سچ بول رہے ہو۔“  
 ”تم نے میرا جو حال کیا ہے۔ اس کے بعد میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ اس نے جواب دیا اور انکھیں بند کر لیں لیکن میرے ذہن میں ایک بار پھر بے شمار جنس جاگ اٹھیں تھیں۔ شاہ دل بے شک مشکوک تھا لیکن اب یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔ وہ جو نظر آتا تھا وہ نہیں ہے۔  
 ”تمہاری کیا دیوانگی تھی۔“  
 ”دیکھو میری بات سنو۔ مجھے بتاؤ کہ تم خود کون ہو؟“ میں نے تمہیں اس عمارت میں بے شک دیکھا تھا۔ تم شاہ دل کے کمرے ہی کی طرف جا رہے تھے۔ مگر تم ہو کون؟“  
 ”میں جو کوئی بھی ہوں۔ تم اس بارے میں



پریشان نہ ہو۔“

”میں..... میں تمہارے سوالوں کا بہتر طریقہ سے جواب دے سکوں گا اگر تم مجھے اپنے بارے میں بتا دو۔“

”فرض کرو میں بھی تمہاری طرح ہوں اور کسی دوسری شخصیت کے لئے کام کر رہا ہوں۔ ان حالات میں تم کیا کرو گے۔“

میں تم سے دوسری شخصیت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گا لیکن تمہیں ایک پیشکش کر سکتا ہوں۔“

”کیا؟“

”شاہ دل نے جو کام میرے سپرد کیا ہے۔ اس کا ایک بڑا معاوضہ ملے ہوا ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ وہ اتنا معاوضہ ہے کہ آدمی زندگی بڑے آرام سے گزار سکتی ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہیں اس معاوضے کی آدمی رقم پیش کر سکتا ہوں۔ ویسے میں تمہیں یہ بتاؤں کہ بڑے لوگوں کا کھیل ہے اور یہ بڑے لوگ اپنے دماغ کو بہت بڑا تصور کرتے ہیں۔ جبکہ جسمانی طور پر یہ ناکارہ ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنی ذہانت پر بڑا ناز ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہم ان سب کو بیوقوف بنائیں۔ میرا مطلب ہے۔ تم ہا خانم کو اور میں شاہ دل کو۔“ میں نے کچھ لحاظ کے لئے خاموشی اختیار کی۔ ظاہر ہے میں اس کی بات سے متفق تو نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے کھولنا ضروری تھا۔ میں نے کہا۔

”شاہ دل نے تمہارے سپرد کیا کام کیا ہے؟“

”بس یوں سمجھ لو کہ تھوڑی سی ذہنی اور تھوڑی سی جسمانی ورزش ہے۔ ایک طرف سے تم اپنے منوکمل کے لئے کام کر اور میں دوسری طرف سے۔ ان لوگوں میں آپس میں جو بھی نئے، ہم دونوں ایک دوسرے کے خلاف خوب شور مچاتے ہیں۔ اس طرح انہیں یہ احساس دلانا ہو گا کہ ان کے ذہن زبردست چالیں چل رہے ہیں۔ اور ہم اپنا معاوضہ وصول کر کے یہاں سے رٹو چکر ہوجائیں۔“

”عمدہ ترکیب ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ وہ

کام کیا ہے؟“

”تو اب مجھے چھوڑ دو۔ ذرا دوستی کی فضاء سے میرے دوستی قبول نہیں کی۔“ اس نے کہا اور میں نے اسے اٹھ جانے دیا۔ نوہ ہوا۔ ”تم نے دل سے میرے دوستی قبول نہیں کی۔“

”تم نے ابھی تک میرے بات کا جواب نہیں دیا۔“

”ہاں میں بتا رہا ہوں۔ شاہ دل یہ چاہتا ہے کہ میں ہما خانم کو خوفزدہ کرتا رہوں۔ ایسی حرکات کروں کہ وہ خود کو ہر کسے خطرات میں گھرا ہوا محسوس کرے۔ اس پر گولیاں چلائیں لیکن اس طرح کے وہ ذہنی نہ ہوا اور یہ سمجھتی رہے کہ اتنا قیہ طور پر اس کی ذہنی فوج جاتی ہے اور یہ کام میں پچھلے کچھ نفوس سے کر رہا ہوں۔ میں نے کئی بار اس کی خواہش کے چکر بگڑنے لگائے ہیں۔ اور اس بات کی کافی شہرت ہو گئی ہے کہ کوئی ہما خانم کو مارنا چاہتا ہے۔“

”آہ..... تو اس کی خواہش کے گرد نظر آنے والے شخص تم ہو۔“

”تم نے سنا ہے ناں۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”ہاں۔ لیکن تمہاری بات ابھی تک میرے حلق سے نہیں اترتی کیا سمجھے؟“

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی دھوکا نہیں کر رہا۔ میں تمہارے ساتھ۔ کیا سمجھے؟“

میں جمال خان کی بات پر غور کرتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں بتاتا ہوں۔“

”بس تو تمہارے اور ہمارے درمیان رابطہ رہے گا۔ یہ عمارت ہماری ملاقات کے لئے بہترین جگہ ہے۔ بلکہ اگر تم مجھے اجرت دو تو میں اسے اپنی مستقل رہائش گاہ ہی بنالوں۔“

”یہ میری ملکیت نہیں ہے۔ جیسے چاہو کرو۔“

میں نے جواب دیا۔ بہر حال اس کے بعد ہم دونوں الگ الگ ہو گئے۔ بڑی دلچسپ صورت حال تھی۔ مزارا ہا

ہما۔ ناظم پاشا اس وقت بہت یاد آتا تھا۔ وہ ایک بہترین مانتی تھا یہ نہیں کس چکر میں پڑا ہوا ہے۔ فرصت ملنے ہی میرے پاس ضرور آجائے گا۔ بشرطیکہ اس وقت تک یہ ہمارے معاملات ختم نہ ہو گئے ہوں۔ دوسری صبح میں نے ناشتا اپنے کمرے ہی میں کیا تھا۔ ناشتا لانے والی لڑیا ہی تھی۔ لیکن اب یہ لڑکی خطرناک چابت ہو سکتی ہے۔ کسی کو اگر شہ ہو گیا کہ میرے اور اس کے درمیان زیادہ رابطہ قائم ہو گیا ہے تو پھر صورتحال بگڑ سکتی ہے۔

”کیا حال ہے خریا۔“

”ٹھیک ہو..... بس! آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔ صبح جانیں میں ایسی نہیں تھی یہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔“

”نہیں خریا غلط ہوا ہے۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ کسی طرح کسی کو پتہ چل گیا ہے کہ تم نے مجھے ہما خانم کی ساری باتیں بنا دی ہیں۔ خود وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ حالانکہ میں نے منع کیا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ خریا کون ہے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں خود اس تک حرام سے ملٹ لوں گی۔ خریا کا رنگ غید بڑھ گیا۔ پھر وہ لڑتے لڑتے درمیان سے باہر نکل گئی اور میں امینان سے ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ ناشتے کے بعد میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ اور پھر کسی خیال کے تحت میں شاہ دل کے کمرے کی طرف چلا پڑا۔ دستک دی تو اس نے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ مجھ کو دیکھ کر چونک پڑا۔

”ہیلو..... شہزادہ صاحب! کیسے ہیں آپ۔“

”آئیے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

”یوں لگتا ہے کہ میرا آنا آپ کو پسند نہیں آیا۔“

”میں زیادہ لوگوں سے نہیں ملتا۔ یہ کہہ میرے

لئے گوشہ رعایت ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس سکون کو بخر کرے۔“

”بس ایسے ہی دل چاہا کہ آپ کی نیاز حاصل کروں۔“

کروں۔“

”آپ براہ کرم یہاں تشریف نہ لایا کریں۔“

”لیکن مجھے آپ جیسے لوگوں سے ملنے کا بہت

شوق ہے۔ وہ لوگ جو اپنی شخصیت پر اتنا بڑا خول چڑھا

لیتے ہیں۔ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔

اور مجھے اتنے بڑے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔“

”کیا مطلب..... خول سے آپ کی کیا مراد

ہے۔“

”بس نہ جانے کیوں یوں لگتا ہے۔ جیسے آپ وہ

نہ ہوں جو نظر آتے ہیں۔“

”کھل کر گالیاں دیجئے ہمیں۔ اگر آپ کو یہ اختیار

ہما خانم کی طرف سے ملا ہے تو ہم اس میں مداخلت نہیں

کر سکتے۔“

”ارے نہیں میری یہ جرأت کہاں۔ بس ان

دونوں خانم کی ایک الجھن سلجھانے میں مصروف ہوں۔

ویسے ایک پیشکش آپ کے لئے بھی ہے۔“

میں نے کہا اور وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے

لگا۔ میں نے چند لحاظ رک کر کہا۔ ”جو کام آپ

دوسروں سے لیتے ہیں مجھ سے بھی لے سکتے ہیں۔ میں

اس سلسلے میں جمال خان کا نام لے سکتا ہوں۔ اور آپ

مجھے جب بھی طلب کریں گے میں حاضر ہو جاؤں

گا۔ بس اتنا کہنے کے لئے حاضر ہوا تھا۔ میں نے کہا

اور اٹھ کر باہر نکل آیا۔ میں نے پلٹ کر شاہ شل کارڈ عمل

دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بہر حال میں اس کے

بعد اپنے طور پر مصروف رہا اور پورا دن میں نے باہر ہی

گزارہ۔ شام کو جب وہاں پہنچا تو کچھ تبدیلیاں نظر

آئیں۔ ہر شخص جھاگ جھاگ رہا تھا۔ کچھ نئے چہرے

بھی سامنے آئے۔ معلومات کی تو پتہ چلا کہ کچھ غیر ملکی

مہمان جاپان سے آئے ہوئے ہیں اور وہ ہما خانم کے

بہت ہی فرمی مہمان ہیں۔ میں دلچسپی سے سوچنے لگا کہ

یہ کون سے مہمان ہو سکتے ہیں۔

پھر مجھے ہما خانم نے بلب کر لیا۔

”کہاں غائب رہے دن بھر..... نادرا!“



”بس خانم یوں سمجھ لیجئے آپ ہی کی بہتری کیلئے مصروف ہو گیا ہوں۔“

”میں تو تنگ آ گئی ہوں ان الجھنوں سے۔ سوچتی ہوں کہ چند دنوں کے لئے اپنا گھر ہی چھوڑ دوں۔ پریشان ہو گئی ہوں۔“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہ نہیں ہے۔ آپ آرام سے رہیں۔ میں موجود ہوں ناں۔“

”میرے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ سوزی وانگ میری بہترین دوست ہے۔ مگر گھر کی سیر کی چکی ہے رات کو ڈنر پر آ جانا۔ ہم لوگ کچھ پروگرام بنارہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جیسا آپ کا حکم رات کو میں ایک خوبصورت ڈنر سوت پھن کر ڈنر ہال میں پہنچ گیا۔ جہاں ہا خانم اپنے مہمانوں کے ساتھ موجود تھیں۔ میرا مہمانوں سے تعارف ہوا۔ اس وقت فیروز خان خاصی رکش شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن میرے سامنے اس کی شخصیت کچھ دب سی گئی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ان سارے لوگوں میں کوئی بھی مجھ جیسا نہیں تھا۔ میں نے سوزی وانگ کو دیکھا۔ ایک خوب صورت سی عورت تھی۔ عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگی۔ لیکن بے حد رکش اس کی گہری نیلی آنکھوں میں ایک حیران نظار تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے خاص نگاہوں سے مجھے دیکھا ہے اور پھر اس نے جبکہ کراہا خانم سے کچھ کہا تھا۔ اور خانم نے مسکرا کر میر طرف دیکھا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ ڈنر کے بعد تقریباً گیارہ بجے ایک ملازم نے ہا خانم کا پیغام مجھے دیا تو میں تیار ہو کر پہنچ گیا۔ اس وقت ہا خانم ایک خاص حصے میں موجود تھیں۔ یہاں ان مہمان لوگوں کے سامنے بات چیت ہوئی۔ اور یہاں فیروز خان بھی موجود تھا۔

”فیروز خان کا حال ہے؟“

”سوری! میں اس وقت یہاں ڈیوٹی پر ہوں اور آپ مہمان خصوصی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر

”سوزی نے نہیں بہت پسند کیا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارے۔“

”میں آپ کے حکم کا پابند ہوں۔“

میرا خیال ہے۔ تم لوگ بے تکلفی سے ایک دوسرے کیساتھ وقت گزارو۔ میں جو پروگرام ترتیب دے رہی ہوں۔ اس کے بارے میں صبح کو تمہیں بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

بہر حال کافی دیر تک ان لوگوں کے ساتھ نشست رہی۔ اس خصوصی محفل میں خصوصی لوگ ہی آ سکتے تھے اور مجھے خصوصی آدمی ہی سمجھا گیا تھا اور اس لئے وقت دیا گیا تھا۔ دوسرے بے تاشے پر بھی مجھے مہمانوں کے ساتھ ہی طلب کیا گیا۔ اور خانم نے بتایا کہ سوزی بہت ہی تنگ تمہاری باتیں کرتی رہی ہے۔

”یہ ان میڈم کی محبت ہے ورنہ میں اس قابل تو نہیں ہوں۔“

”تم کس قابل ہو اس کیلئے ہمیں رہنے دو خواہ فیصلہ نہ کرو۔“

”معافی چاہتا ہوں۔“

”اچھا اب میری بات سنو..... جو پروگرام میں ترتیب دے رہی ہوں۔ وہ ذرا مختلف قسم کا ہے۔“

”فرمائیے..... اگر بتانا پسند فرمائیں۔ تو بتا دیجئے۔“

”سوزی کی ماں کا تعلق فرانس سے تھا اور باپ کا تعلق لینڈ سے۔ اس لئے اس کا نام سوزی وانگ ہے۔ بہت ہی دولت مند خاندان کی فرد ہے۔ بہت ہی خوش حواں اور میری بہترین دوست۔ یہ شکار کی بہت شوقین ہے اور میں نے اس کی فرمائش پر شکار کا پروگرام

ترتیب دیا ہے۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“

”آپ کا جو حکم.....“ میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔“ وہاں سے واپس آ کر میں نے سوچا کہ جب کی جائے ایسا لگیا ہے۔ جیسے کوئی پاگل خانہ ہو جن حالات میں ہا خانم گھری ہوئی ہے۔ اس کے بعد سیر شکاری کیا

میں شائش رہ جاتی ہے۔ لیکن بہر حال پھر ساری رات تیار کیا کی گئی۔ اور اس کے بعد شکار کا بندوبست کر لیا گیا۔ شکار کا یہ بندوبست ہا خانم کے شایان شان تھا۔

مجھے گاڑیاں تھیں۔ جن میں سے دو پر صرف سامان لدا ہوا تھا۔ باقی چار میں سے ایک پر ہم تمام لوگ سوار تھے اور دوسری تین جھپوں میں دوسرے تمام ملازم، ان میں فیروز خان بھی موجود تھا۔ جو ایک جیب میں سوار تھا۔ بہر حال فیروز خان کے چہرے پر ایک عجیب سی

سوجھ بوجھ ماری تھی۔ ہم لوگ چل پڑے۔

میں کافی دیر بیٹھ کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

جیب ناہوار اسٹوں سے گزرتی رہی۔ مناظر بے حد حسین تھے اور سب اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے کئی بار خانم کو اپنی طرف متوجہ پایا۔ لیکن خود

میں نے اس کی جانب نہیں دیکھا اور سامنے دیکھتا رہا۔

”بڑی خاموشی ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد خانم نے اس جمود کو توڑا اور سب جاگ اٹھے۔

”تم نے راج گڑھ کو کچھ اور دیکھنا دیا ہے، ہا۔“ سوزی نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

”ہاں۔ راج گڑھ کے نواح کا حسن کچھ اور کھرتا جا رہا ہے۔“ خانم نے کہا اور اس کے لہجے میں ایک یاسیت سی ابھرا آئی۔

”کچھ اور کہنا چاہتی تھیں؟ سوزی اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں کچھ نہیں، بس پچھلے کچھ دنوں سے میرے خلاف سازشیں ہونے لگی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چند دشمنوں کی شرارت ہے۔ ورنہ میرے عوام مجھے سے ناخوش نہیں ہیں۔ آج وہ بھی مجھے بہت چاچے

ہیں؟“

”اوہ..... تمہارے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے؟“ سوزی نے عشوئش سے پوچھا۔

”ہاں..... جاگیر دار صاحب اپنی موت کے بعد بڑی ذمہ داریاں ڈال گئے ہیں میرے اوپر۔“ خانم نے ایک تھنڈی سانس لے کر کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی کہ تم پریشان ہو۔ میں بھی سوچتی رہی کہ تم مجھ سے کچھ چھٹی چھٹی ہو۔“

”نہیں سوزی! یہ تمہاری غلط فہمی تھی..... باقی اور تمہیں کیا بتانی؟“

”کون لوگ ہیں..... معلوم نہیں ہو سکا؟“

”ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔ میرا خیال ہے۔ اس ذکر کو جانے دو اور ان الجھنوں اور پریشانوں کو ہم گھر

میں ہی چھوڑ آئے ہیں۔ خواہ مخواہ یہ تو میرے ذہن کو پھر پراندہ کر دے گا۔“ خانم نے کہا اور سوزی خاموش ہو گئی۔

لیکن اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ تیس میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طو ہو گیا۔ چونکہ راستہ ناہوار تھا اس لئے جھپوں نے ست

روہ سے سفر کیا۔ بالآخر ہم گئے جنگلوں میں داخل ہو گئے انتہائی حسین علاقہ تھا۔ جنگلات کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان سے پرے برف پوش پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

جگہ جگہ پر ندوں کے غول بارہ نیچے اور جبل نظر آتے تھے۔ گیارہ شکار گاہ شکار سے بھری ہوئی تھی۔

”یہ شکار گاہ تو تمہاری ملکیت ہے!“ سوزی نے پوچھا۔

”تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی مڑی ہے۔ جس کے ایک کنارے پر ایک بہت بڑی چٹان دیوڑی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بس اس کے سائے میں ہم اپنا شکاری کیمپ لگا سکیں گے۔“

”درندے بے ہوں گے یہاں۔“

”ہاں..... رچھ اور چھوٹے جانور نظر آتے ہیں



شیر بھی کبھی پہاڑوں کی سمت سے آ جاتا ہے۔ میں اس سے شکار کروا لیتی ہوں۔ میں اس جنگل میں شیر اور چیتے نہیں چاہتی۔

”قرب وجوار میں آبادیاں بھی ہوں گی؟“  
”نہیں جنگلوں کے بعد پہلی آبادی راج گڑھ کی ہے۔ پہاڑی سے تقریباً سو میل دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔“ خانم نے جواب دیا۔ چیتیں روک دی گئیں۔ اور ملازمین جلدی جلدی چٹان کے نزدیک خیمے نصب کرنے لگے۔

خوبصورت رنگین شمعوں سے ماحول اور خوبصورت ہو گیا۔ درمیان میں ہا خانم کا خیمہ تھا اور اس کے بعد فیروز خان کا خیمہ تھا۔ دائیں سمت چا پانی مہمانوں کے خیمے تھے اس کے بعد دوسرے ملازمین کے۔ چھوٹی سی آبادی ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہاں میری آمد کا مقصد کچھ اور تھا۔ عام حالات میں ہمیں ایسی دلچسپیوں سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔ حالانکہ زندگی کسی حد تک کھردری ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن فطرت اور نظارے کس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہی تو انسان اور پتھر کی تخصیص ہے۔

چنانچہ اس حسین ماحول میں میرے ذہن پر بھی ایک سرور انگیز کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اور پھر یہاں خصوصی توجہ دل رہی تھی۔ سوزی کی دلچسپی کیوجہ سے خانم بھی کسی قدر بے تکلف ہو گئی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا۔ دوپہر کا کھانا کھلے آسمان کے نیچے ندی کے شفاف کنارے پر کھایا گیا۔ اس دوران دلچسپ گفتگو ہوتی رہی تھی۔ فیروز خان ہماری کمپنی میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ ایک اہم عہدیدار تھا۔ لیکن بہر حال ہا خانم کا ملازم تھا۔ اور ملازموں کو یہ حیثیت نہیں دی جاسکتی تھی۔

کھانے کے بعد آرام کی ٹھہری۔ پروگرام طے ہوا تھا کہ چار بجے تک آرام کیا جائے اس کے بعد شکار پر نکلا جائے۔ میں بھی اپنے خیمے میں چلا گیا۔ آرام کے لئے فولڈنگ بیڈ موجود تھے۔ اس کے علاوہ کینوس کے

استول بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جوتے وغیرہ اتارے اور ہینڈ پر لیٹ گیا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خیمے کا پردہ ہٹا کر سوزی اندر داخل ہوئی۔ اس کی یہ بے تکلفی مجھے بڑی عجیب لگی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
”ہیلو.....“ اس نے کہا اور ایک استول پر بیٹھ گئی۔ پھر بے تکلفی سے بولی۔

”تمہارا شخصیت کافی برا سا رہے۔ ہمارے بھی تمہارے بارے میں کھل کر نہیں بتایا۔ حالانکہ وہ میری بے تکلف دوست ہے۔“

میں کوئی قابل ذکر شخصیت ہی نہیں ہوں۔“  
”خیر میں یہ بات تسلیم نہیں کروں گی۔ اگر ایسی بات ہوئی تو تم ان محفلوں میں شرکت ہی نہ کر سکتے۔ ہا۔ تمہارے حیار کا کافی خیال رکھتی ہے۔ اور مجھے اس غرض بھی نہیں کہ تم دن ہو۔ بس جو کوئی بھی ہو۔ مجھے پسند دے۔“ سوزی نے بے تکلفی سے کہا حالانکہ اس سے قبل میں نے سوچا تھا۔ کہ سوزی کے ساتھ جنگل کا ماحول کچھ اور دلچسپ ہو جائے گا۔ لیکن شاید میری فطرت نے اس کی برتری قبول نہیں کی۔ خیر میں نے اس سے کہا۔

”پسندیدگی کا شکریہ۔“ میں نے سادہ لہجے میں کہا۔

”خود تمہارے نزدیک میں کیا حیثیت رکھتی ہوں۔“ سوزی نے لگاؤ سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ آپ خانم کی مہمان ہیں۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔ اور بس۔“

”نہ جانے تم کیسے انسان ہو۔ میں تمہارے قریب آنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں اپنے قریب سے نوازنا چاہتی ہوں۔ لیکن تم مسلسل اجتناب برت رہے ہو۔ تم مجھے پسند آ گئے ہو۔ ممکن ہے میں تمہیں اپنے ساتھ جاپان چلنے کی بھی پیشکش کر دوں۔ تم میری حیثیت سے واقف نہیں ہو۔ اتنے بڑے بڑے لوگ میرا التفات

حاصل کرنا چاہتے ہیں جو شہر کے شہر خرید کر پھینک دیں لیکن وہ میری ایک نگاہ التفات کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔ تم اس عزت کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو میں تمہیں دینا چاہتی ہوں۔“

”آپ بھی میری حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ خاتون سوزی! اور نہ میں آپ کو واقف کرانا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے چند بیوقوف آپ کے دیوانے ہوں، لیکن میں ان میں شامل نہیں ہوں۔ میں آپ کو اس حیثیت سے قطعی ناپسند کرتا ہوں۔“

”تم میری تو جین کر رہے ہو۔“  
”جی نہیں۔ میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔“ میں نے لا پرواہی سے جواب دیا۔ اور سوزی مجھے خوفناک لگا ہوں سیدھے کہنے لگی۔ پھر بھر رانی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں تم سے اس توہین کا انتقام لوں گی۔ میں تم سے بہت کچھ جین لوں گی۔ تم اس کو قسمی میں نہ رہ سکو گے۔“

”اطلاق کا شکریہ!“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔ ”ویسے میں آپ کے خیمے میں ہوتا تو فوراً باہر نکل جاتا۔“

”اوہ..... تم گدھے ہو..... دلیل انسان ہو۔“  
”اگر آپ عورت نہ ہوتیں تو میں آپ کی زبان کھینچ لیتا۔ تاہم اگر آپ دس سیکنڈ کے اندر یہاں سے نہ نکل گئیں تو میں آپ کی کمر پرتی زوردار لات رسید کروں گا کہ آپ میرے خیمے سے پرواز کر جائیں گی۔“  
”اوہ..... اوہ..... سوزی دانت بیٹتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں اطمینان سے اپنے بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ جس انداز میں وہ بیٹھ گئی تھی۔ اس سے تو یہی اظہار ہوتا تھا کہ ابھی پتھوں نے کرائے کی ادائیگی اور میرے اوپر خالی کر دے گی۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور وقت گزر گیا۔

ٹھیک چار بجے شکار کی تیاریاں ہو چکیں اور پھر ہم شکار کیلئے چل پڑے۔ سوزی بھی ساتھ تھی۔ لیکن مقصد کی عورت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے خانم کو

کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ عورت اپنی توہین کی داستان کبھی کبھی کوئین سنائی۔ لیکن اس کے چہرے پر تو تکدر بھی نہیں تھا اور وہ اسی طرح خوش و خرم تھی۔ البتہ اس دوران اس نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ شکار کھلا گیا۔ دو ہرن شکار کئے گئے۔ ان میں سے ایک خانم نے شکار کیا تھا اور دوسرا سوزی کے ساتھی جیم نے۔ پھر چند پرندوں کے شکار کئے گئے۔ فیروز خان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ لیکن حسب حیثیت وہ دوسرے ملازموں کے ساتھ مصروف رہا۔ خانم کے انداز میں البتہ تھوڑی سی کنکاش پائی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟“

سورج چھپنے تک ہم شکار گاہ میں بھٹکتے رہے۔ شکار کی ضرورت تو پوری ہو گئی تھی۔ اب صرف نشانوں کے شواہد کے لئے جا رہے تھے۔ پیش پیش وہی لوگ تھے۔ میں نے ایک بھی گولی نہیں چلائی تھی۔ البتہ خانم کی فرمائش پر فیروز خان نے کئی پرندے شکار کئے تھے۔ خانم اس کے نشانے کی بڑی تعریفیں کر رہی تھی۔ پھر ہم کیمپ واپس آ گئے۔ ملازم شکار وغیرہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ فضا میں گوشت بھننے کی خوشبو پھیل گئی۔ میں نے لبا تبدیل کر لیا اور پھر پونہ اپنے خیمے سے نکل کر چٹان کی دیوار پر چڑھنے لگا۔ تاریکی پھیل گئی تھی۔ اوپر ایک مسطح جگہ بیٹھ گیا۔ اور نیچے ندی کے گنگناہتے ہوئے پانی کے نغمے سننا رہا۔ پھر اپنے عقب میں ایک آہستہ سن کر میں چونک پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو خانم غدوخال نظر نہیں آ رہے تھے۔ واہ بڑی عمدہ جگہ منتخب کی..... مجھے خانم کی آواز سنائی دی۔

”آپ کی یہ شکار گاہ جنت کا عکس معلوم ہوتی ہے۔“

”بہت پسند آئی؟“  
”تعریف نہیں کر سکتا؟“

”شکریہ۔ ویسے یہ ذوق کی بات ہے۔“ خانم نے کہا۔  
”اب شکریہ میرے اوپر ادھار ہو گیا۔“



”ادھار ہی رہنے دو“ خانم آہستہ سے ہنس پڑی اور مجھ سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ ”بیٹھ جاؤ۔ مجھے افسوس کہ تمہاری تنہائی میں نکل ہوئی۔ کیا سوچ رہے ہو۔“

”کوئی خاص بات نہیں۔ اس خاموشی میں ندی کے پانی کی گنگناہٹ کی فکری گورج میں اتار رہا تھا۔“

”کیوں؟“

”تمہارا پیشہ ذوق لطیف سے دور کی چیز ہے لیکن اس کے باوجود.....؟“

”میرے فطرت انسانی ہی ہے۔“

”ہاں..... یقیناً! لیکن سوزی کو تم سے بہت شکایت ہے۔“

”کیا؟“

”بس یہ ہی کہ تمہارا رویہ اس سے بہت خراب ہے۔“

”کیا ان کی یہ چالپوسی اور ان کی خواہشات کی تکمیل بھی میرے فرائض میں شامل کر دی گئی ہے؟“

”نہیں..... لیکن میں ذاتی طور پر تم سے چند سوالات ضرور کروں گی۔“

”فرمائیے۔“

”کیا تم عورت کی دنیا کے انسان نہیں ہو۔ حالانکہ تمہاری فطرت میں شعریت ہے اور حسن سے متاثر ہوتے ہو جیسے یہ جگہ۔“

”میں عورت کی دنیا سے دور نہیں خانم!“

”تب میرا خیال ہے..... سوزی کو ہزاروں میں انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ اور اس نے سچ ہی کہا۔ اس کے وطن کے ہزاروں افراد اس کے التفات کے طالب ہیں۔“

”تو اس نے ساری تفصیل بتادی آپ کو۔ لیکن خانم صاحبہ! میری اپنی حیثیت کو کیوں نظر انداز کیا گیا۔ اگر وہ اپنا التفات دے کر یہ سمجھتی ہیں کہ میں ان کی ایک نگاہ پر اس کے قدموں میں آؤں گا تو میں اس کے اس

خیال کی تردید کیوں نہ کروں۔ ہزاروں افراد پسند کرتے ہوں گے۔ میں نہیں کرتا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند کی بات ہے۔“

”وہ تمہاری زندگی بنا سکتی ہے۔“

”میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے اور میں کسی کے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔“

”اوہ..... تو تم اس کے لئے کوئی پلنگ پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔“

”کسی قیمت پر نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ اور خانم کے انداز میں کسی قدر اضطراب پیدا ہو گیا۔ وہ کافی دیر خاموش رہی پھر بولی۔ ٹھیک ہے۔ یہ جوان آواز ہے۔ میں ان آوازوں کو بوڑھا سمجھتی ہوں جو غیر نسوانی آواز کے سامنے ہم ہوجاتی ہیں۔ سوزی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ بس وہ تیز آواز میں بول رہی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ سوزی کے نزدیک ہے۔“

”اوہ.....“ میرے ہونٹ بھی مسکرا دیئے۔

ویسے اگر وہ اپنی ناکامی کا رونا آپ کے سامنے روتی تو میرے نگاہوں سے کچھ اور گر جاتی۔“

”اچھا۔ اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ ملازم اپنا کام کر چکے ہوں گے۔“

”بہتر۔“ میں نے جواب دیا۔ اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔ سوزی کھانے کے دوران بھی مطمئن تھی۔

یا تو اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ تھا۔ جس نے اسے اس قدر مطمئن کر دیا تھا۔ یا پھر وہ ایسی عورتوں میں سے تھی جو اپنی ناکامی کو بآسانی بھول جاتی ہیں۔ کھانے کے بعد ندی کے کنارے چاندنی میں چہل قدمی رہی اور پھر جنہیں نیند آ رہی تھی۔ وہ سوئے۔ چلے گئے۔ ان میں خانم بھی تھی۔ مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسلئے میں ندی کے کنارے پر ہی رک گیا۔ چاندنی میں ندی کا پانی بہت حسین لگ رہا تھا۔ اسے چھوڑ کر آنے والی تم ہوائیں، اس خاموشی میں ہولے ہولے گیت گار رہی تھیں۔ بلاشبہ کیف و سرور کی یہ دنیا مجھے یہ حد بھلی لگ رہی تھی اور میں اس میں کھو گیا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میرمیں کی روشنیاں گل ہو چکی تھیں۔ لیکن فضا کا یہ سناٹا ایک بھیاںک آواز سے ٹوٹ گیا۔

اس کے ساتھ ہی کوئی چیز زن سے میرے کان کے نزدیک سے نکل گئی۔ فائرنگ جیسے کس طرف سے ہوا تھا۔ لیکن پہلی ہی آواز سے میں متنبہ ہو گیا۔ ایسے موقع کی حفاظتی تدابیر کیلئے میرے اعضاء سوچ کے پابند نہیں تھے۔ یہ بھرتی کام آئی ورنہ گولیوں کی دوسری بو چھاڑ

میرے بدن میں لا تعداد سوراخ کر دیتی۔ دوسرے لمحے میں نے ندی میں چلاٹنگ لگا دی۔ بچنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ پانی میں گولیوں کے چھپکے سنائی دینے لگے۔

میں مچھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر خود کو گولیوں سے بچانے لگا۔ ندی اتنی گہری نہیں تھی کہ غوطہ کھایا جاتا

اس لئے میں نے تیزی سے آگے تیرنا شروع کر دیا۔ میری تمام تر توجہ ملائیمیں جاگ رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ پانی میں چلائی جانے والی گولیاں

بلندی سے چلائی جا رہی تھیں۔ اور یہ بلندی اس چٹانی دیوار کے علاوہ اور نہیں تھی۔

چٹانچیں میں دیوار کی مخالف سمت تیرتا رہا تھا۔ اگر میں دیوار کی جانب جانے کی کوشش کرتا تو یقیناً شکار ہو جاتا۔ جبکہ عام حالات میں میری جگہ کوئی اور ہوتا تو فوراً

دیوار کی پناہ میں جانے کی کوشش کرتا۔

میری یہ ہی کوشش زندگی بن گئی۔ میں کسی قدر گہرے پانی میں پہنچ کر سانس کر گیا۔ تاکہ حمہ آور

میرے بارے میں اندازہ نہ لگا سکے۔ پھر میں پانی میں چپ ہو کر اور براٹھا اور اب کے صرف ٹاک اور ٹکالی مگر

چند ہی ساعت کے بعد پھر فائرنگ شروع ہوئی۔ یہ جازنگ خیموں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ لیکن نشانہ شاید

میں ہی تھا۔ کیونکہ حملہ آوروں نے اندھا دھند پانی پر گولیوں کی باؤں ماریں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

فائرنگ رک گئی تھی اور پھر اس کے بعد بہت سی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن میں ابھی باہر نکلنے کے بے وقوفی

نہیں کر سکتا تھا۔ میں پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا اور

نکل گیا اور ایک جگہ درختوں کو دیکھ کر کنارے پہنچ گیا۔ پانی سے نکل کر میں چند ساعت حالات کا جائزہ

لیتا رہا۔ پھر ندی سے دور نکل گیا ایک لمبا پتھر کے رے میں خیموں کے قریب پہنچا لیکن اب بھی پوشیدہ رہا۔ میں پورا اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ ندی کے کنارے میری تلاش جاری تھی۔ شاید ملازم پانی میں اتر کر میری تلاش کر رہے تھے۔

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ ساری رات ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہوں گا۔ اور اس کے لئے بہترین جگہ میرے خیمے میں موجود تھی۔ میں نے اپنے لباس کا جائزہ لیا اور اس طرح خیمے میں داخل ہوا کہ نشان نہ مل سکے۔ اس کے بعد میں اطمینان سے میں اپنے کیوس کے بستر کے نیچے لیٹ گیا۔ یہاں میں آسانی سے پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ اس وقت ذہن میں کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ میں باہر سے آنے والی آوازوں کا منتظر تھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد یہ آوازیں سنائی دینے لگیں۔ خانم کی آوازیں تھیں۔

”کوئی نہیں لوئے گا۔ ندی کنارے کنارے پہاڑ کے رخ پر اسے تلاش کرو۔“

”میں نے ملازموں کے پھلا دیا ہے۔“ یہ فیروز خان کی آواز تھی۔

”اسے ملنا چاہیے۔“ خانم کی آواز غصہناک تھی۔

”ممکن ہے۔ وہ بیچ گیا ہو۔“

”لیکن کہاں گیا ملنا تو چاہیے۔“

”ممکن ہے جملہ آسروں کے پیچھے نکل گیا ہو۔“

”فیروز وہ ہمارا مہمان تھا۔ اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ ایک شاندار آدمی تھا۔ بلاشبہ ایک الوکھا انسان۔“

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں خیمے میں داخل ہو گئے۔ میں اگر چاہتا تو درمیان کا پردہ نیچے سے اٹھا کر انہیں جھانک بھی سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی اور سانس دیا۔



”آپ اس سے بہت متاثر تھیں خانم۔“ فیروز خان نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے محسوس کیا اسے خوسہ حیثیت دی جا رہی تھی۔“

”فیروز۔“ خانم کے لہجے میں ایک تشویش سی ابھرائی۔

”جی خانم“

”کہیں..... کہیں تم نے تو..... اوہ..... فیروز کہیں یہ سب کچھ تم نے تو نہیں کیا؟“

”میں چھپ کر دار کرنے والوں میں سے نہیں ہوں خانم اگر وہ زندہ ہے تو اسے کسی بھی دن میری طرف سے لگا دوں۔“

میں نے ان اوقات میں تمہارے چہرے پر ناخوشگوار تاثرات دیکھے ہیں۔ جب میں اس پر توجہ دیتی تھی۔“

”آپ مالک ہیں..... خانم..... آپ کی نگاہ جس جانب ہو جائے کون رک سکتا ہے۔“

”تمہارا لہجہ بتاتا ہے فیروز کہ تم..... تم..... فیروز! اب تو میں تمہاری طرف سے بھی مشکوک ہو گئی ہوں۔ ممکن ہے۔ اس پر میرے توجہ نے تمہیں ہلکا دیا ہو۔ یا پھر..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اپنی اس رات کی شکست نہ بھول سکے ہو۔“

”وہ شکست نہیں تھی۔ صرف اتفاق تھا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر وہ زندہ مل جائے تو طاقت آزمائی کے لئے کسی بھی کھیل میں اسے میرے مقابل لے آئیے۔“

”تو یہ سب کچھ تم نے تو نہیں کیا عادل!“

”آپ ضرورت محسوس کریں تو اس سلسلے میں بھی کوئی کمین مقرر کر دیں۔ آپ کا تہما معتمد میں ہی تو نہیں ہوں۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ فیروز!“

”کبھی کبھی میں اپنی اوقات پر غور کر لیا کرتا

ہوں۔ خاص طور سے ان حالات میں جب آپ کے ہم پلہ لوگ آپ کے ساتھ ہوں۔“

”یہ عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ تم ان حالات سے سمجھوتہ نہیں کر رہے ہو۔ جو ہمیں درپیش ہیں..... تم سارے خطرات منوں لینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں کل ہی تمہاری اصل حیثیت کا اعلان کر دوں گی۔ لیکن اس کے بعد ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہو گا۔ اور ہمارے دشمن ہمارے سینوں پر موگ دیں گے۔ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”نہیں میں پڑھوں انسان نہیں ہوں۔ میں پہلے آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اپنے بارے میں سوچوں گا۔“

”بہر حال غلط فہمیوں کا شکار مت بنو۔ پتہ لگاؤ۔ نادر پر کس نے حملہ کیا اور علمہ آدھ یہاں تک کیسے پہنچے؟“

”ہمارے دشمنوں کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔“

رہی میری بات تو میں نے آپ کے سامنے دشمنوں پر گولیاں برساتی ہیں۔“

”لیکن ایک بات تم نے محسوس کی تھی۔“

”وہ کیا.....؟“

”خیموں پر گولیاں نہیں برساتی تھیں۔ ایک ہی گولی اس طرف نہیں چلائی گئی۔ وہ سب اسی پر گولیاں برساتے رہے۔ گویا وہ یہی چاہتے ہوں۔“

”لیک کیوں!“

”اس کی ذہانت اور مستعدی کا خطرہ محسوس کر کے۔“

”لیکن ان کا مقصد تو مجھے ہی قتل کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنا اصل کام بھی کر سکتے تھے۔ اور ان خیموں میں، میں بھی محفوظ نہیں تھی۔“

”آپ کی بات گھوم پھر کر وہیں پہنچ رہی ہے۔“

فیروز خان نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”یعنی آپ کا کہنا یہ ہے کہ جس شخص نے اس پر گولیاں برساتیں ہیں۔ وہ ان خیموں کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اور ایسا انسان میرے علاوہ

اور کون ہو سکتا ہے۔“

”تمہاری گفتگو زیادتی کی حدود میں داخل ہو گئی ہے۔ میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں۔ تمہارے لئے کیا جزبات رکھتا ہوں۔ تم ان کا مذاق اڑا رہے ہو۔“ خانم نے شکایتی انداز میں کہا۔

”معاف کرنا خانم! تمہارے وہ جذبات اب مجھے مشکوک نظر آ رہے ہیں۔ فیروز خان نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ جس بے تکلفی سے اس نے خانم کو مخاطب کیا تھا وہ کچھ اور ہی کہانیاں سناتی تھیں۔

”لیکن کیوں؟“

”حالات در دنیا کے سامنے میری حیثیت اپنی جگہ لیکن تم نے پہلے مجھے اس طرح ٹوہ..... رائد از بھی نہیں کیا تھا۔ آج کل میں اپنے آپ کو صرف یک ملازم..... ایک خادم محسوس کر رہا ہوں۔“

”تم..... سے علی الاعلان اظہار عشق کرتی پھروں۔ لہوں۔“ خانم کے لہجے میں جھلاہٹ پیدا ہو گئی۔ اور ان الفاظ نے میرے شہسے کی تصدیق کر دی۔

”نہیں۔ بہر حال میں جو کچھ ہوں۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ باقی رہے میرے تصورات تو ممکن ہے ان کو بھی سہارا مل جائے؟“

”تمہارے ان الفاظ نے مجھے سخت بالوں کیا ہے۔ میں تو تمہیں اپنی رگ و جان سے قریب تھی۔ لیکن آج تم نے اجنبیت کا احساس دلایا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس کو اس کا معاذ ضرورے کرواپس بھیج دوں گی۔“

”میں یہ نہیں چاہتا۔“ فیروز خان نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔

”تب میں نہیں جانتی کہ تم کہا چاہتے ہو۔ براہ کرم مجھے تنہا چھوڑ دو۔ چاؤ فیروز اس وقت چلے جاؤ۔“ خانم نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔

”شکریہ خانم!“ فیروز خان نے کہا اور شاید باہر نکل گیا۔ خانم کے خیال سے پھر کوئی آواز نہ سنائی دی۔ لیکن میرے ذہن میں خیالات کا سمندر مژدہ جزن ہو

گیا۔ خانم اور فیروز خان کا کوئی پوشیدہ معاملہ بھی ہے۔ عشق، لیکن فیروز خان کون ہے۔

مغرور خانم نے اسے اپنے قابل کیسے سمجھ لیا۔ معاملات پھر کافی دور چلے جاتے تھے۔

یوڑہا ماہ روز، اس کے دو بچے..... خانم، فیروز خان..... لیکن خانم فیروز خان کو کس طرح اپنائے گی۔ کیا جاگیر دار ماہ روز کو راستے سے ہٹایا گیا ہے۔ ممکن ہے اور اس سازش کی جڑیں بھی گہری ہو سکتی ہیں۔ مثلاً خانم نے کس طرح جاگیر دار ماہ روز کے ساتھ زندگی گزاری۔ لیکن بالآخر اسے ایک منظور نظر مل گیا۔ اس نے اور فیروز خان نے مل کر جاگیر دار کو راستے سے ہٹا دیا اور اس کے بعد اپنے توجہ پوری معذور ہو گئی۔ شاہ دل ہی ایک کا ٹٹا تھا۔ چنانچہ ممکن ہے کہ خانم اور فیروز خان مل کر ہی یہ کھیل کھیل رہے ہوں۔ مقصد شاہ دل کو مجرم قرار دینا ہو۔ تاکہ وہ بھی راستے سے ہٹ جائے۔

کہانی اس طرح جامع ہو گئی تھی کہ مجھے اس کی صداقت کا یقین ہو گیا تھا۔ پھر تو ذہن راستوں پر آ پڑا لیکن پھر یہ جملہ آور۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں جاگ اٹھا۔ کہیں یہ جملہ آور سوزی کی طرف سے نہ ہو۔ اس نے مجھ سے انتقام کی بات کی تھی۔ جملہ آور اس کے دونوں ساتھی بھی ہو سکتے تھے۔ لیکن اب وقت ان کے بارے میں معلوم ہونا ناممکن تھا۔ ہاں، دن کی روشنی میں کچھ کروں گا۔ لیکن فیروز خان اب میری نگاہوں میں مشکوک ہو گیا تھا۔

خانم کے بارے میں نیا انکشاف ہوا تھا۔ اس لئے اب اسے بھی نگاہ میں رکھنا ہو گا۔ لیکن جمال خان کو کس خانے میں رکھوں گا۔ ابھی بہت سے سوالات اٹھتے ہوئے تھے۔ اور انہیں سلجھاتے بٹھاتے مجھے نیند آ گئی۔ صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ جب میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی میں پونے پانچ بجے تھے۔ میں بستر کے نیچے سے نکل کر بستر پر آ لیٹا۔ لیٹنے سے قبل میں نے بیگیا ہوا لباس بدل لیا تھا۔ آنکھوں میں ابھی نیند تھی۔ اس لئے دوبارہ سو گیا اور پھر کسی کے چھوڑنے پر ہی آنکھ کھلی



تھی۔ سب سے پہلے خانم کی صورت نظر آئی۔ وہی مجموعہ رہی تھی۔ اس کے عقب میں دوسرے لوگ بھی نظر آئے۔ جن میں فیروز خان بھی تھا۔

”کیسے ہو..... نادر.....“ خانم نے پوچھا۔  
”بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

”زخمی تو نہیں ہوئے۔“  
”جی“ میں نے حیرانگی سے کہا اور پھر ایک گہری سانس لیکر بولا ”آپ رات کے حملے کی بات کر رہی ہیں۔“

”آپ لوگ بھی جاگ گئے تھے۔“  
”جاگ گئے تھے؟ ارے ہم نے مقابلہ کیا تھا حملہ آوروں سے۔“ خانم نے کہا۔  
”کوئی مارا کیا۔“

”بھاگ گئے تھے۔ وہ چٹان پر تھے۔ میں خود جا کر دیکھ آئی ہوں وہاں خون وغیرہ موجود نہیں ہے۔“ خانم نے جواب دیا۔

”تب پھر جانے دیں وہ دوبارہ آئیں گے تو دیکھ لیا جائے گا۔“ میں نے لاپرواہی سے جواب دیا اور سب ہی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔  
”یوں لگتا ہے جیسے یہ حملہ خود تم نے اپنے اوپر کر لیا ہو۔“ سوڑی نے کہا۔

”ہاں..... لگتی تو بہت سی باتیں ہیں۔ آپ بھی تو یہ کوشش کر سکتی ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”لیکن تم چلے کہاں گئے تھے۔ نادر!“ خانم نے جلدی سے بات کاٹ کر پوچھا۔

”حملہ آوروں کی اسلحہ سیلیوں سے بھرا ہو کر جنگل کی طرف کم بجٹوں کو بچھ نشانے لگانے بھی نہیں آئے۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”اب مسٹر نادر خود کو گنڈر ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ جاپانی مہمان نے کہا اور میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”پستول یا بندوق کا ایک بھی کارٹوس بے کار

شائع ہو جائے تو دوبارہ ہاتھ میں بندوق نہیں اٹھائی جائیے۔ مسٹر جی یہی میرا اصول ہے۔“

”تمہارا اصول، لیکن شکار کے دوران تو تم نے ایک بھی فائر نہیں کیا۔“ سوڑی نے پھر کہا۔

”میں دندوں کا کاری ہوں۔ بہر حال آپ لوگوں کی تشویش کا شکر ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ فکر مند نہ ہوں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

فیروز خان بڑی تیزی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ویسے اس شخص نے خانم کے سامنے چیلنج کیا تھا اور اچانک میرا دل چاہنے لگا تھا کہ میں کسی طرح اسے غصہ

دلا دوں۔ تاکہ وہ اپنی اوقات سے آگاہ ہو جائے۔ اور ناشتے کے دوران اس کا موقع فیروز خان نے فراہم کر دیا۔ اس وقت خانم نے اسے بھی ناشتے میں شامل کیا تھا۔ غالباً بات کی گفتگو کے زیر اثر۔

”نادر صاحب آپ کا نشانہ دیکھنے کو دل چاہتا ہے لیکن اب اس جنگل میں درندے کہاں سے لائے جائیں۔“

”آپ کی خواہش کی تکمیل میرا انکوں پر مسٹر فیروز۔ لیکن میری طبیعت دوسروں سے کچھ مختلف ہے۔ اگر کوئی چلانے کی بات ہو تو پھر اس کے ضمن میں دوسری چیزیں بھی آتی ہیں۔“

”مثلاً؟“ فیروز نے پوچھا۔

”اول تو میں ایسے کھیل کھیلتا نہیں۔ اور جب کھیلتا ہوں تو تندر رہنا پسند نہیں کرتا۔ مثلاً اگر میں کسی درندے کو زخمی کرتا ہوں تو اس طرح کہ وہ ہلاک نہ ہو۔

اور پھر میں اسے خالی ہاتھوں سے شکست دیتا ہوں۔ آپ کسی ایسے شخص کو لایئے جو جسمانی ورزش میں بھی میرے مقابل آسکے تاکہ کھیل مکمل ہی کھیلا جائے۔“

”عجیب بات ہے اگر خانم صاحبہ حکم دیں تو میں خود کو اس کے لئے پیش کر دوں۔“ فیروز خان نے کہا۔  
”آپ.....؟“ میں نے کسی قدر مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

”ارے نہیں آپ شریف اور نازک سے آدمی ہیں۔ آپ کہاں ان جھگڑوں میں پڑیں گے۔“

”تجربہ تو عمدہ ہے کیوں نہ یہ کھیل ہو جائے۔ کیا تم سنجیدہ ہو۔ نادر دیکھو ناں ہم تفریق کے لئے آئے ہیں۔ ان تفریحات میں جو بھی اضافہ کر دیا جائے۔“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ لیکن یہ فیروز صاحب پر جوش نظر آرہے ہیں۔ اگر میرے ہاتھوں سے ٹوٹ پھوٹ گئے تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔“ میں نے بدستور مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا۔ اب میں کیا کرتا۔ فیروز

خان نے خود ہی اپنی شامت کو آواز دے دی۔ میں قطعی ناراض نہ ہوں گی۔ لیکن کھیل کھیل کی حدود میں رہنا چاہیئے۔“

”میں تیار ہوں۔“ میں نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ فیروز خان کا چہرہ مسرغ ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

”تم بھی قواعد کی پابندی کرو گے۔ فیروز!“ خانم نے کہا۔  
”کوشش کروں گا۔ خانم! لیکن میرا استاد ایک ریڈ انڈین تھا۔ اس کا قول تھا کہ جب ہتھیار ہاتھ میں اٹھاؤ تو ہلاک کر کے رکھو!“ فیروز خان نے کہا۔

”آپ فیروز خان کو اجازت دے دیں۔ خانم! ویسے میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں زخمی نہیں کروں گا۔“

”یہ غلط ہے۔ جنگلی کھیل اخلاق کی گرفت میں نہیں آتے۔ تم کوئی رعایت نہیں کرو گے۔“ فیروز خان نے غصے سے کہا اور خانم مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔ بہر حال ہم باہر نکل آئے۔ ویسے میری لاپرواہی نے سب کو متاثر کیا تھا اور فیروز خان جل کر خاک ہو رہا تھا۔

خانم کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار نظر آرہے تھے۔ بہر حال خیموں سے کچھ دور متابلے کا بندوبست کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں پہلے نشانہ بازی کی مشق، پھر خنجر زنی اور آخر میں جسمانی مقابلے کی تھریں۔ ہم دونوں کو نشانہ بازی کے لئے پستول دیئے گئے۔ تمام لوگ ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے اور نشانہ بازی کی جا

منتخب کر لی گئی۔ تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کی سب سے بلند شاخ پر ایک پرندے کو نشانہ بنایا گیا، یہ گولی فیروز خان نے چلائی تھی۔ پرندے کے چھینٹے اڑ گئے۔ سب نے بے اختیار تالیاں بجائیں تھیں۔ اور پھر ہم کسی دوسرے پرندے کے کسی درخت پر بیٹھنے کا انتظار کرنے لگے۔ فائر کی آواز سے پرندے اڑ گئے لیکن اس کثرت سے تھے کہ کہاں جاتے۔

چنانچہ چند لمحوں کے بعد ایک دوسرا پرندہ عین اسی جگہ آ بیٹھا۔

”اب اگر تم بھی اس کو نشانہ بنا لیتے ہو تو مقابلہ برابر ہو جائے گا۔ پھر کوئی۔ دوسری کوشش!“ خانم نے کہا۔

”میں اس نشانے پر ندرت پیش کروں گا۔“ میں نے کہا اور پھر پرندے پر فائر کر دیا۔ پرندہ فضاء میں تھوڑا سا اڑا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے آگرا۔

”اس میں کیا ندرت رہی۔ میرا خیال ہے ٹھیک نشانہ نہیں لگا۔“ سوڑی نے کہا۔

”اس کی صرف چوچ غائب ہوگی۔“ میں نے ہونٹ بھیج کر خانم کو دیکھتے ہوئے کہا اور خانم چونک پڑی۔

”تمہیں یقین ہے۔“ اس نے پوچھا۔  
”ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے کہا اور ایک ملازم کو پرندہ لانے کے لئے دوڑا دیا گیا۔ اور وہ پرندہ اٹھا لا یا۔ پرندے کی چوچ ٹوٹ گئی تھی۔“

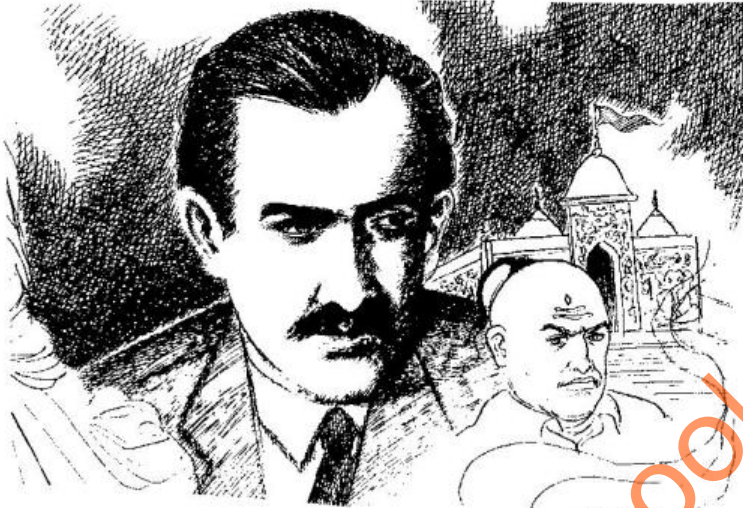
”چونکہ نشانہ ٹھیک نہیں تھا۔ زخمی چوچ دیکھ لی۔“ فیروز خان نے کہا لیکن میری پستول سے لگاتار تین دھماکے ہوئے اور فیروز خان کا جملہ اوجھڑا رہ گیا۔

میں نے اچانک ایک درخت سے پرواز کرنے والے تین کوڑوں کو نشانہ بنایا تھا۔ ان کے صرف پاؤں ٹوٹے ہوئے گئے۔“ میں نے سرور لہجے میں کہا۔

”اوہ خدا کی پناہ تینوں کے؟“ خانم نے تعجباً انداز میں پوچھا۔

”جی..... بیروں کے علاوہ بدن کا کوئی حصہ زخمی





**لوگ** کہتے ہیں اداکاری کا کوئی اسکول نہیں۔  
 اسے کم ہمارے ملک میں ایسی کوئی روایت موجود نہیں  
 لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ برصغیر میں ڈرامہ تو کالی  
 اس سے بھی پہلے کی چیز ہے وہ چھایا ناٹک کے نام سے  
 اُسے ہاں ہزاروں برس سے چلا آ رہا ہے سچ کا فن  
 یا اپنے ساتھ نہیں لائے تھے بلکہ یہ ان کے آنے سے  
 لے ڈراواں کی تہذیب کا ایک جز تھا اور یہی وجہ ہے کہ  
 سرت ڈرامے کے ارتقاء کے باوجود اسے شمالی  
 ہرستان میں وہ قبول عام حاصل نہ ہوا۔ جو جنوبی ہند  
 حاصل ہے مجھے یچین ہی سے ایکٹنگ کا شوق تھا اور  
 نے انڈیا یونوائٹینٹیوٹ آف آرٹس سے چار سال

ایک ایکٹنگ اداکاری سیکھی تھی اور ممبئی ہلکے میں اسٹیج  
 ڈرامے کرتا ہوا پھر پاکستان آ گیا کراچی آ کر میں نے  
 اداکاری ترک کر دی اور گاڑیوں کی ایک ورکشاپ کھول  
 لی لیکن لوگ اب بھی مجھے اداکار ہی سمجھتے تھے۔ اب میں  
 ایک نئی کہانی سناتا ہوں۔  
 گاڑیوں کی ورکشاپ کے اندر ہانس کی چار پائی  
 اور میرا مٹر رکھا رہتا تھا۔ رات کو دوکان کے سامنے یہ  
 چار پائی بچھ جاتی دو تین کرسیاں ہوتی تھیں۔ پرانے  
 عقیدت مند اکٹھے ہو جاتے اور ہم لوگ سیاہ حال اور  
 سنہری ماضی کی باتوں میں کھوجایا کرتے۔ ایک دن ایسی  
 ہی محفل جی ہوتی تھی کہ ایک ہنڈا کار ڈاکٹر قریب ہی

خوفناک کہانیاں 193 مئی 2018ء

”ہاں..... اب کیا منجائش ہے؟“ وہ بولی اور  
میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ دشمنوں کی طرف سے  
لاپرواہی پاگلی بن ہو رہا ہے۔ خانم، فیروز خان کو عجیب  
لگا ہوں سے دیکھ رہی ہیں چہرہ میں نے کبھی اتار دی۔  
اب جسمانی مقابلے کی باری تھی۔ فیروز خان کو دونوں  
کوششوں میں تکلیف ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے  
چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس جسمانی کوشش کا  
نتیجہ بھی اسے معلوم تھا۔ کیونکہ ایک بار تجربہ کر چکا تھا۔  
اس موقع پر خانم نے اس کی مدد کی تھی۔

”تم حیرت انگیز ہو، میں اعتراف کرتی ہوں کہ  
اپنی ذات میں یکتا ہو۔“  
(جاری ہے)

فیروزہ کروش کے بل گرا اور میں نے اس کے خنجر والے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیا۔ اور دوسرے لمحے میرے خنجر کی نوک اس کی گردن سے جا کئی۔ تاخام بے اختیار تالیاں بجانے لگی۔ اور ملازم بھی پاؤں خواستہ اس کے



ڑک گئی میں نے مذاق سے کہا۔ ”اے مشتاق! جا کر کہہ دو ان اندھوں سے کہ درکشاپ بند ہو چکی ہے۔“ کار کار دروازہ کھلا اور دو آدمی اتر کر اس طرف آئے، ان میں سے ایک اپنے لباس سے سمدھی معلوم ہوتا تھا۔ قریب آ کر ان میں سے دوسرے نے کہا ہمیں سلیمان استاد سے ملنا ہے۔

میں لیٹا ہوا تھا۔ اپنا نام سن کر بستر ہی میں اٹھ بیٹھا اور کہا ”تشریف لائیے مجھے ہی سلیمان استاد کہتے ہیں“ فوراً دو کرسیاں مہمانوں کے لئے خالی کر دی گئیں۔ میرا اشارہ پا کر مشتاق چائے کے لئے کہنے چلا گیا۔ ان لوگوں نے پہلے تو میری بڑی تعریفیں کیں اور بتایا کہ ہم نے جس سے بھی پوچھا سب نے یہی بتایا کہ آپ سے بڑا اداکار ملک میں موجود نہیں ہے یعنی ایسا اداکار جس کی عمر بھی پچاس سال ہو، محنت بھی اچھی ہو اور اداکاری جس کی کٹھنی میں پڑی ہو۔ اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ضلع داو کے ایک زمیندار سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کو میری خدمات کی ضرورت ہے اور انہوں نے گاڑی بھیج کر بلوایا ہے میں سمجھ گیا کہ زمیندار صاحب شوقین مزاج ہو گئے۔ اور کوئی تھیٹر قائم کرنا چاہتے ہوں گے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آدمی کا شوق کبھی نہیں مرتا ہے۔ میں خود دلد و جان سے چاہتا تھا کہ کوئی شخص ایسا مل جائے جو تھیٹر کے اجراء کے لئے رقم لگانے کو تیار ہو تو ایک مرتبہ لوگوں کو دکھا دوں کہ تھیٹر فلم کے مقابلے میں کتنی اونچی چیز ہے۔ وہ لوگ مصرعے کے میں اسی وقت گاڑی میں بیٹھ جاؤں لیکن میں اس وقت فوری جانے کے موڈ میں نہیں تھا لہذا میں نے کہہ دیا کہ صبح دس بجے سے پہلے نہیں چل سکتا۔ اتنے میں مشتاق چائے لے آیا اور ان لوگوں نے چائے پی اور رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم لوگ قیاس آرائیاں کرنے لگے میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش زمیندار صاحب مستقل طور پر تھیٹر قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ایسا نہ ہو کہ اپنے کتے کی سالگرہ کی خوشی میں محض ایک شو کرنا چاہتے ہوں۔ میرا دعویٰ تھا کہ اگر وہ مستقل تھیٹر قائم کریں تو کچھ عرصہ بعد وہ صرف

اپنا سارا خرچ خود کمانے لگے بلکہ منافع بھی دینے لگے گا دوسرے دن میں نے صبح اٹھ کر بال کٹوائے، شیو بنایا، بنایا ایک دھلا ہوا جوڑا پہنا دوسرا ساتھ لے لیا۔ تیسرا بھی تنک تیار نہ ہوا تھا کوئی سادس بجے گاڑی آگئی اور مجھے لے کر روانہ ہو گئی۔ وہی دونوں صاحب جو رات میرے پاس آئے تھے گاڑی میں میرے ساتھ کچھ سیٹ پر بیٹھے تھے آگے ڈرائیور کے پاس ایک شخص گولیوں والا بیٹھ گیا۔ میں لٹکائے بیٹھا تھا جس میں پول میں لگا ہوا تھا فضا پار کر یہ کہہ رہی تھی کہ یہ کسی زمیندار کی گاڑی ہے تو کسی شاہراہ سے داود ضلع میں داخل ہونے کے چند میل بعد گاڑی نے پختہ سڑک چھوڑ دی اور ایک پتلی سے نیم پختہ سڑک پر اتر گئی۔ بالکل خیر علاقہ تھا جہاں کہیں کہیں خشک جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا کئی میل چلنے کے بعد چھوٹے چھوٹے گھٹ لہڑ آنے لگے لیکن پہلی نظر میں محسوس ہو جاتا تھا کہ وہ پانی کی کمی کے شکار ہیں کہیں کہیں چند درخت کسی چھوٹے سے ٹکڑی میں موجود کی کا پتہ دیتے تھے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ زمیندار سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے مجھے کیوں بلایا ہے لیکن وہ زبان کھولنے کے لئے تیار نہ تھے مجھے پہلا اندازہ نہیں تھا کہ داود ضلع انتخابی اہوا کا تعلق ہے کسی سڑکوں پر ہماری گاڑی کوئی ڈھائی تین گھنٹے مسلسل چلتی رہی اس کے بعد ہم کھا کھڑو کو گھنٹہ بچھے۔ یہ تین تار زیادہ ہر ابھر علاقہ تھا کھا کھڑو کی حویلی چھوٹے سے قلعے کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ باہر کی فصیل پختہ ہو گئی لیکن اوپر تو مٹی لپی ہوئی نظر آرہی تھی مجھے حویلی کے مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ پکی سڑک کے سفر نے چہرے پر سیروں و حول مل دی تھی گرم پانی سے نہا کر بڑا سکون ملا اس کے بعد کھانا آ گیا اور کھانے کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ آرام کرو مجھے دوپہر کو سونے کی عادت نہیں تھی دکان میں رہتا تھا وہاں دن کو کیسے سوتا دو تین الماریوں میں کتابیں جچی ہوئی تھیں میں نے ان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اکثر یہ سمدھی کتابوں کی تھی۔ اردو میں بھی یا تو مذہبی کتابیں تھیں یا اسلامی تاریخ سے متعلق۔ ایک کتاب سندھ کی داستانوں سے متعلق تھی

میں نے وہی نکالی اور لیٹ کر پڑھنے لگا تو جہاں اس پر تھی کہ کون سی داستان اس سچ پر پیش کئے جانے کے قابل ہے کوئی پانچ بجے ہوں گے کہ ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ سائیں یاد کر رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ گیا۔ کئی پتلی پتلی گولیوں اور برآمدوں سے گزر کر ہم سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کے حضور پہنچ گئے۔ وہ ایک بہت بڑے ہال میں تشریف فرما تھے۔ ہال میں نہایت قیمتی ساز و سامان تھا لیکن اس کے انتخاب اور آرائش میں کسی سلیقے یا اہتمام کا ثبوت نہیں دیا گیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے ایک چھوٹی سی میز پر چائے کا سامان چتا ہوا تھا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور اپنے پاس مجھے بٹھالیا ایک ملازم چائے بنانے لگا میز پر مختلف پھل اور بسکٹ وغیرہ رکھے تھے۔ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو پائلیں اٹھا کر مجھے پیش کرتے رہے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ زمینداروں کے روایتی اخلاق اور مہمان نوازی کی خوبیاں ان میں موجود ہیں چائے کے بعد ملازم برتن لے گئے اور ہال میں ہم دونوں رہ گئے۔ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے کہا۔ ”ہم نے آپ کی بڑی تعریف سنی ہے“ اس میں مجھے آساری سے کام لینا پڑا اور ان سے پوچھا پڑا۔ ”آپ کون سا ڈرامہ کھیلتا جاتے ہیں اور اگر آپ نے کچھ ٹپس لیں کیا ہے تو پھر مجھ پر چھوڑ دیجئے۔“ لیکن انہوں نے بتایا کہ وہ کوئی تھیٹر قائم کرنے یا ڈرامہ کھیلنے کا ارادہ نہیں رکھتے البتہ مجھے ایک کردار انجام دینا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے ایک مہینہ دو مہینے تین یا اس سے زیادہ مجھے یہ اداکاری کرنی پڑے۔ اس دوران میرے سارے اخراجات وہ ادا کریں گے۔ کام مکمل ہونے پر پچاس ہزار روپے مجھے دیئے جائیں گے۔ یہ سنتے ہی میرے ذہن میں پچاس ہزار کی پتلی گھومنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ اگر تین تین ہزار کے میں آغا حشر کا کوئی ڈرامہ کھیلوں تو لوگ ٹوٹ پڑیں گے۔ دل ہی دل میں اداکاروں کا انتخاب کرنے لگا تھا کہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”تمہیں سر مور میر واپلر بننا ہے۔“ میری سمجھ تھیں

نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا استاد آغا حشر مرحوم کی نصیحت تھی کہ بیٹا کوئی بات نہ جانا قصور نہیں ہے لیکن اس کا اعتراف کر لینا قصور ہے۔ میں سوچنے لگا۔ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ”سائیں سائیں! تمہیں سر مور میر واپلر بننا ہے۔“ میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”سائیں پوری بات سمجھا میں۔ یہ سن کر مجھے کیا کرنا پڑے گا۔“ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے میری مشکل حل کر دی اور بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے بتایا کہ۔ ”سر مور میر واپلر آغا حشر کے بہت بڑے ماہر ہیں اور حکومت پاکستان کے مشیر رہ چکے ہیں اور تمہیں ان کی جگہ سر مور میر واپلر بننا پڑے گا۔ میں اس کا انتظام کروں گا کہ کوئی شخص تم سے ملنے نہ پائے اور تمہیں انگریزی بولنے کی ضرورت پیش آئے۔ دوسرے لوگوں سے سر مور میر واپلر انگریزی بھی اردو بولا کرتے تھے۔ سو وہ تم اچھی طرح بول سکو گے تمہیں اپنے ساتھ کھدائی کرنے والے مزدوروں کا عملہ لے کر ایک ٹیلے کی کھدائی کرنی ہے اور پھر وہ سب کرنا ہے جو میں وقتاً فوقتاً بتاؤں گا۔“ انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے سمجھایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ آخر اس سے حاصل کیا ہوگا۔ بہر حال میں نے ان کی پیشکش قبول کر لی اور اس کے بعد انہوں نے مجھے سر مور میر واپلر کی کئی تصویریں دیں جو مختلف اخباروں اور رسالوں میں سے کافی تھیں شاندار موٹھیں اور سر کے بڑے بڑے بال خاصی وجہ شکل تھی ان کا وزن مجھ سے قدرے زیادہ معلوم ہوتا تھا اس کے سوا ان کے جسم میں اور میرے بدن میں کوئی فرق نہ تھا۔ رہ گیا پھر تو اس کے تنک اپ کی مجھے بہت مشق تھی میں تو ایسا تنک اپ کر سکتا تھا کہ سر مور میر واپلر کی بیگم بھی کم سے کم کچلی نظر میں نہ پہچان پاتیں۔ تیار یوں کے سلسلے میں سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے مجھے دس ہزار روپے دیئے اور دو ہزار روپے الگ سے دیئے کہ میں اپنے بال بچوں کو دے آؤں۔ بال بچے تو میرے نہیں



تھے مشتاق اور کچھ شاگرد چھوکرے دکان پر کام کرتے تھے میں نے وہ رقم ان میں بانٹ دی کہ جاؤ اپنی اپنی ماؤں کو دے آؤ۔ میں نے دو ڈبل برسٹ سوٹ سلوائے جیسے سر مورنیر وٹکیر پہنا کرتے تھے، سوالا ہیٹ ٹائیاں مونٹے تلے کا جوتا مونڑے، پائپ تمباکو کے ڈبے غرض وہ ساری چیزیں خرید لیں جو مجھے سر مورنیر وٹکیر بننے میں مدد دے سکتی تھیں میں نے بڑی مشکل سے ایک کاریگر تلاش کر کے بھروسے بالوں کی دگ تیار کرانی مونچھوں کا اہتمام کیا ان ساری تیاریوں میں کوئی دس دن لگ گئے میں نے ایک اعلیٰ درجے کا چمڑے کا سوٹ کیس خریدا جس میں کپڑے رکھے۔ آٹار قدیمہ سے متعلق انگریزی کی دو تین موٹی موٹی کتابیں خریدیں اور پھر ایک خط سائین جمال شاہ کھا کھڑو کے پتے پر ڈال دیا جس میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔ ”اٹلے اہل چکے ہیں“ یہ کوڈرڈ تھے جو سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے ایک انڈیا چھپتے ہوئے تجویز کی تھی اور اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جس کام میں مصروف تھا وہ مکمل ہو گیا ہے پچھلے چار دن سے میں ہوٹل میں پڑا ہوا تھا کیونکہ دکان میں تو میرا سوٹ کیس تک رکھنے کی جگہ نہ تھی غلط میں ہوٹل کا پتہ لکھ دیا گیا تھا اس کے تیسرے دن سائین جمال شاہ کھا کھڑو کے وہی ٹی جوبلی مرتبہ میرے پاس آئے تھے آگے انہوں نے سر مورنیر وٹکیر کے روپ میں مجھے دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا اس کے بعد وہ مجھے ایئر پورٹ لے گئے میں حیران تھا کہ دادو ضلع کے گاؤں کا کھڑو کون سا ہوائی جہاز جاتا ہے ایئر پورٹ سے واپس ہوئے تو ششی جی راسنی میں شہر میں اتر گئے اور ڈرائیور مجھے اور میرا سامان لے کر دادو روانہ ہو گیا۔ ششی جی کے کہنے کے مطابق میں نے ہوٹل سے نکلنے ہی توئی ہوئی ولائی اردو بولنا شروع کر دی تھی۔ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزوں والا لہجہ اختیار کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ ہوا۔ اس مرتبہ میں کھا کھڑو پہنچا تو حویلی سے کچھ فاصلے پر میرا استقبال کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں خود سائین جمال شاہ کھا کھڑو بھی موجود تھے۔ یہاں ایک میدان تھا

جہاں ایک بڑا اور دو چھوٹے خیمے لگے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ سر مورنیر وٹکیر خیموں میں رہنا زیادہ پسند فرماتے تھے۔ بڑے خیمے میں میری ضرورت کا سارا سامان تھا اس سے ملا ہوا ایک چھوٹا خیمہ ہاتھ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جس میں گرم پانی سے بھرا ہوا ٹب بھی موجود تھا میں نے غسل کر کے ٹولیا کا بنا ہوا گاؤں لپیٹ لیا اور اپنے خیمے میں آ گیا۔ تیسرا چھوٹا خیمہ میرے باورچی کا تھا میرے خیمہ میں ایک طرف ستر تھا جس کے پاس کتابوں کا ایک چھوٹا سا ریک تھا اور ایک میز بھی دوسری طرف کھانے کی چھوٹی گول میز اور دو کرسیاں اور ایک آرام کرسی تھی اس وقت باورچی کھانا لگا رہا تھا کھانا بھی وہی تھا جو سر مورنیر وٹکیر کھاتے تھے یعنی اہلی ہوئی بنریاں خیرا درد سلاکس، کھانا کھانے کے بعد میں ایک کتاب لے کر کنوئیس کی آرام کرسی میں لیٹ گیا یہ کتاب قدیم خمریوں سے متعلق تھی جو ٹی کی پختہ تختیوں اور پتھروں پر کندہ دنیا میں مختلف جگہ سے برآمد ہوئی تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے تو انگریزی پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن میں تصور میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہر صفحہ پر اس طرح نظریں دوڑا رہا تھا جیسے سچ پڑھ رہا ہوں۔ دوسرے روز سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے مجھے کراچی کے دو انگریزی اخبار دکھائے جن میں میری وہ تصویریں شائع ہوئی تھیں جو ہوائی اڈے پر پہنچنے لگی تھیں اور ساتھ میں خبر بھی تھی سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے پڑھ کر بتایا کہ اس میں لکھا ہے کہ آٹار قدیمہ کے ماہر سر مورنیر وٹکیر غلطی طور پر پاکستان آئے ہیں وہ ضلع دادو میں ایک زمیندار کے ہاں قیام کریں گے اور ان کی درخواست ہے کہ اس قیام کے دوران ان سے ملاقات کی کوشش نہ کی جائے وہ جس اہم کام میں مصروف ہیں اس میں کوئی مداخلت پسند نہیں کریں گے۔ سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے اپنے ہاں کے ایک پڑھے لکھے ہونہار نو جوان رام چندانی کو بھی میرے حوالے کیا اور کہا کہ یہ آپ کا سیکرٹری ہے اگر کوئی ملے بھی آ گیا تو یہ اس سے منٹ لے گا۔ رام چندانی اچھا ڈرائیور بھی تھا

میں سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے میرے استعمال کے لئے ایک جپ دیدی تھی۔ رام چندانی اس میں مجھے لیے اونچے نیچے کے راستوں سے کوئی چودہ میل دور لے گیا۔ جہاں ایک بہت بڑا ٹیلہ تھا اور مجھے بتایا گیا کہ آپ کو آٹار قدیمہ کی تلاش میں ٹیلے کی کھدائی کرنی ہے۔ ”کیا واقعی یہاں آٹار قدیمہ پائے جانے کا امکان ہے؟“ میں نے پوچھا جس پر رام چندانی نے بتایا کہ اسے کچھ علم نہیں ہے لیکن ڈیریوں کے یہاں سوالات نہیں پوچھے جاتے ہیں بس حکم بجالانا ہوتا ہے۔ جو مجھ سے کہا جائے میں کروں اور جو آپ کو حکم دیا جائے آپ کریں رام چندانی بڑا اچھا لڑکا تھا وہ بہت جلد میرا دوست بن گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ انٹرنیشنل میڈیکل گروپ میں فرسٹ ڈویژن لے آیا تھا لیکن چونکہ سائین جمال شاہ کھا کھڑو کا بیٹا سائین جمال شاہ کھا کھڑو خمر ڈویژن میں پاس ہوا تھا اس لئے سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے رام چندانی کو بھی میڈیکل میں داخلے کی اجازت نہیں دی اور مجبوراً اس کو تعلیم ختم کر دینا پڑی جبکہ سائین جمال شاہ کھا کھڑو حیدر آباد میں بی ایس سی کر رہا تھا۔ میں نے رام چندانی کو پیشکش کی کہ وہ کراچی آجائے اور میڈیکل میں داخلہ لے لے۔ اس کی فیس اور اخراجات کا بلا میں خود اٹھاؤں گا۔ یہ سن کر رام چندانی کی آنکھیں چمک اٹیں۔ اس کا باپ سائین جمال شاہ کھا کھڑو کے کشیوں میں شامل تھا اور وہاں رہ کر یہ بھارے سائین ڈیڑھے کی مرضی کے خلاف چلے گئے تھے۔ سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے مجھے سمجھا یا کہ اب تمہارا کیمپ اس ٹیلے کے دامن میں لگا دیا جائے گا تم وہیں رہنا تمہارے ساتھ مزدور ہوں گے جو دن بھر کھدائی کریں گے۔ تم کھدائی کی نگرانی کرنا رام چندانی بڑے بڑے کراف اور نقشے اپنے پاس رکھا کرے گا۔ تم اپنے ہاتھ میں ایک نقشہ رکھنا اور یوں ظاہر کرنا جیسے ان کے مطابق کھدائی ہو رہی ہے اور کھدائی کے مطابق نقشے تیار کئے جا رہے ہیں۔ دوسرے دن ہمارا کیمپ سائٹ پر منتقل ہو گیا میرے تین خیموں کے علاوہ وہاں اور بھی خیمے لگا دیے گئے۔ ان میں ایک خیمہ رام چندانی

کا تھا اور دو خیموں میں ایک درجن مزدور تھے جن کا کام کھدائی کرنا تھا ہمارے پاس کوئی تین درجن لیپ بھی تھے جن کو سائین جمال شاہ کھا کھڑو کی ہدایت کے مطابق رات کو جلا کر ٹیلے پر چاروں طرف رکھ دیا جاتا تھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی مزدور ایک لیپ اٹھا کر دوسری جگہ لے جا کر رکھ دیتا تھا اس طرح بہت دور سے دیکھنے والوں کو یہ تاثر دینا مقصود ہوتا تھا کہ جیسے رات میں بھی کھدائی کا کام ہو رہا ہے۔ ہم مغرب کے وقت کھدائی بند کر دیے۔ اس کے بعد رام چندانی رات کے دس ساڑھے دس بجے تک میرے ساتھ رہتا وہاں سائٹ پر صرف اسے معلوم تھا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی ہے لہذا اس سے میں معمول کے مطابق باتیں کیا کرتا تھا جبکہ دوسرے کی موجودگی میں سر مورنیر وٹکیر کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے ٹولے ہوئے غلط سلسلہ جملوں میں اردو بولنا پڑتی تھی۔ سائین جمال شاہ کھا کھڑو تیسرے چوتھے روز ایک چکر لگا جاتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ اہلی ہوئی بنریاں کھا کھا کر میرا برا حال ہو گیا ہے اس لئے وہ جب آئے تو فتن کیریئر میں میرے لئے گوشت کے تے ہوئے پارچے، کباب مرغ مسلم وغیرہ لے آتے تھے اور میں تین چار دن کی کسر ایک ہی دن میں نکال لیا کرتا تھا۔ سائین جمال شاہ کھا کھڑو نے کراچی اور حیدر آباد کے اخبارات دکھائے جن میں لکھا تھا کہ آٹار قدیمہ کے مشہور ماہر سر مورنیر وٹکیر ضلع دادو میں ایک ٹیلے کی کھدائی کر رہے ہیں خیال ہے کہ یہاں مونچھوڈو سے بھی قدیم کسی تہذیب کے آٹار قدیمہ ہوں گے۔ میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا کہ آٹار قدیمہ کیوں رچا جا جا رہا تھا۔ سائین جمال شاہ کھا کھڑو کچھ بمانے کے لئے تیار نہ تھے۔ رام چندانی بھی کچھ کچھ جانتا تھا لیکن زبان کھولتے ڈرتا تھا بہر حال رفتہ رفتہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جا رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جلد ہی اس سے کچھ نہ کچھ اگلوں گا۔ اور پھر ایک رات رام چندانی نے مجھے بتایا کہ رانی جی مجھ سے ملنا چاہتی ہیں مجھے بڑا تعجب ہوا کہ یہ رانی جی کون ہیں اور وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔ رام



چندانی نے بتایا کہ رانی جی سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کے بڑے بھائی سائیں مثال شاہ کھا کھڑو کی بیوہ ہیں وہ اپنے بچے کے ساتھ دادو شہر میں رشتی ہیں جائیداد کا ادھار حصہ اس بچے کا ہے اور یہاں رہ کر اس بچے کی جان لینے کی دو مرتبہ کوشش کی جا چکی ہے۔ رام چندانی نے بتایا کہ مرحوم سائیں مثال شاہ کھا کھڑو اپنے بھائی سائیں جمال شاہ کھا کھڑو سے دس برس بڑے تھے لیکن نہایت شریف آدمی تھے جائیداد کے کاموں میں انہوں نے بھی دلچسپی نہیں اور سب کچھ اپنے چھوٹے بھائی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ گویوں، سازندوں، رقاصوں، صوفیوں اور سنیسیوں وغیرہ کی صحبت میں اپنا سارا وقت صرف کیا کرتے تھے۔ بھائی سے انہوں نے آمدنی کا بھی حساب نہیں لیا اور جو انہیں دے دیا جاتا خاموشی سے لے لیا کرتے تھے لوگ ان سے کہا بھی کرتے کہ تمہارے حصے کے ایک روپے میں سے دو آنے بھی نہیں دیئے جارہے ہیں مگر وہ کہنے والے کو ڈانٹ دیا کرتے تھے کہ خبردار جو میرے بھائی کے خلاف ایک حرف بھی کہا لوگوں کا یہ بھی کہتا ہے کہ سائیں مثال شاہ کھا کھڑو کی موت قدرتی نہیں تھی اس لئے کہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے اپنے بیٹے سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کی سالگرہ کے موقع پر انہیں بلایا تھا کھانا تو سب نے ساتھ کھایا تھا مگر کھانے کے بعد اکیلے سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے بڑے بھائی کو کھیر کا ایک پیالہ دیا جسے کھانے کے بعد ان کی حالت خراب ہو گئی یہ بات صرف میرے باپ کو معلوم ہے کہ ان کی حالت کھیر کھانے سے خراب ہو گئی تھی سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے نہ ان کے گھر اطلاع کروائی نہ کسی ڈاکٹر کو بلایا رات کو ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ پتائی کہتے ہیں انہیں کئی مرتبہ خون کی تھوہری دوسرے دن چھپ چھپاتے انہیں دفن کر دیا گیا اور مشہور کر دیا گیا کہ دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوا ہے۔ اس کے بعد سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے اپنے بھائی کی بیوہ سے نکاح کرنے پر زور دینا شروع کر دیا لیکن انہوں نے سختی سے منع کر دیا اس کے بعد انہیں وہمکنیوں دلوائیں گئیں ایک

مرتبہ گھر میں زہریلے سانپ چھڑوا دیئے گئے ایک مرتبہ گھر کو آگ لگا دی گئی لیکن دونوں دفعہ رانی جی دادو میں اپنے رشتے کے ایک بھائی کے ہاں رہنے لگی ہیں اور اب انہوں نے جائیداد کے بٹوارے کے لئے مقدمہ دائر کر رکھا ہے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ رام چندانی نے مجھ سے رازداری کا وعدہ لینے کے بعد یہ ساری باتیں بتائی تھیں اس نے کہا تھا کہ اگر کسی کو بھنگ بھی پڑ گئی تو سائیں جمال شاہ کھا کھڑو سے پہلے خود میرے پتائی مجھے جان سے مار دیں گے۔ اس لئے کہ وہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کے انتہائی وفادار ہیں ہمارے ہاں آقا سے وفاداری کو بھگوان سے عقیدت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اب سب کچھ میری سمجھ میں آ چکا تھا لیکن یہ میں نہیں جان سکتا تھا کہ خزانہ جی مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟ بہر حال مجھے ان سے دوسری پیدا ہو گئی تھی اور میں اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکے ان کی مدد کروں گا کیپ میں رام چندانی پر تو مجھے پورا بھروسہ تھا لیکن اس کے علاوہ وہاں ایک بار پتی اور ایک درجن مزدور تھے ظاہر تھا کہ سب سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کے آدمی تھے اور کیپ کی ایک بات ان تک پہنچاتے ہوں گے ایسی صورت میں نہ تو رانی جی یہاں آ کر کچھ سے مل سکتی تھیں نہ میں ان سے ملاقات کے لئے نکل سکتا تھا میں تو ایک طرح سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کی قید میں تھا البتہ رام چندانی آ کر ادھار دے دن چپ لے کر نکل جاتا اور میری ضرورت کی اشیاء خرید لایا کرتا تھا برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا کبھی کبھی چھینٹے پڑ جایا کرتے تھے ایک رات بارش کا امکان تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے مطابق رام چندانی دن کو ہی چپ لے کر چلا گیا تھا اور کیپ میں یہ کہہ گیا تھا کہ وہ دوسرے دن آئے گا بلکہ میرے بار پتی کے سامنے اس نے مجھ سے چھٹی ماگنی تھی اور میں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ چھٹی منظور کرتے ہوئے کہا تھا ”ویل رام چندانی! تم سویرے رات ٹائم آنا مالک کل بوت کام سمجھا! جی صاحب بالکل سمجھ گیا“ رام چندانی نے بڑی سعادت

مندی کے ساتھ سر کھلا کر جواب دیا تھا اور کوئی چار بجے وہ جیب لے کر چلا گیا تھا اس رات میں نے کھانا نہیں اور باور پتی سے کہہ دیا تھا ”ڈیکھو کھانا مان ہم ڈرنہیں مالک! مارا سر ڈکھتا! چائے مالک سمجھا۔“

”جی حضور سمجھ گیا“ کہتا ہوا چلا گیا اور چائے بنالایا چائے پی کر میں نے چند منٹ بعد اپنے خیمے کے دونوں لیپ گل کر دیئے یہ کیپ والوں کے لئے اس بات کا اشارہ تھا کہ میں سو چکا ہوں۔ خیمہ کا پردہ ڈالنے کے بعد میں نے ایک چھوٹی سی موم بتی جلائی اور اس کے اطراف میں بھی کتاہیں کھڑی کر دیں تاکہ روشنی بالکل باہر نہ جائے پھر میں نے ایک سندھی مزدور کا میک پا کیا رام چندانی کے ذریعہ میں سندھی جوتی پہنے اور ایک پتلی ہوئی اجڑک پہنے یہی منگو چاکا تھا کوئی آدھ گھنٹے کے اندر میرا میک اپ مکمل ہو گیا موم بتی بجھا کر میں خیمے کا پھلا پردہ اٹھا کر نکلا اور چلتا ہی رہا کسی نے دیکھا بھی ہوگا تو یہی خیال کیا ہوگا کہ کوئی مزدور جوان ضروری کام کے لئے جا رہا ہے یونین پر نہ لگی تھیں یہ اور بھی اچھی بات تھی کوئی ایک گھنٹے پیدل چلے کے بعد میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں رام چندانی جیب لے کر ہوئے میرا انتظار کر رہا تھا میرے پیٹھے ہی جیب چل پڑی رام چندانی نے لائٹ نہیں جلائی تھی بادلوں کی وجہ سے اور زیادہ اندھیرا تھا لیکن رام چندانی کو یہاں کے چپے چپے سے واقف تھی اس نے کھا کھڑو گاؤں کو اتنی دور چھوڑ دیا کہ جیب کی آواز بھی وہاں تک نہ پہنچ سکے اور دور کے راستوں سے نکال کر جیب کو بڑک پر لے آئے اب اس نے لائٹ جلا دی اس لئے کہ بڑک پر تو گاڑیاں گزرتی رہتی ہیں جلد ہی ہم دادو پہنچ گئے رانی جی کے رشتے کے بھائی کا چھوٹا لیکن پختہ دو منزلہ مکان تھا ہمارا وہاں انتظار ہی ہو رہا تھا۔ رانی جی ایک چادر لپیٹے ہوئے آئیں آٹھ سو سال کا ایک بچان کی ہڈی پکڑے ہوئے ساتھ آیا دونوں نے مجھے سلام کیا میں نے رانچی جی کو بتائی کہہ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بچے کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ رانی جی نے مجھے بتایا کہ جس لینے پر کھدائی کر رہا ہوں اس کا نام ہنومان ہے کسی زمانے میں

دیوالی کے موقع پر اس ٹیلے پر راویں کا پتلا جلا یا جاتا تھا اور علاقے کے سارے ہندو کھٹے ہو کر اپنا تہوار منایا کرتے تھے انہوں نے بتایا کہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے عدالت میں یہ عذر پیش کیا ہے کہ چونکہ آثار قدیمہ کے مشہور ماہر سر مور میر ویکٹر علاقے میں کھدائی کر رہے ہیں اور وہاں موٹو جوڑو سے بھی زیادہ قدیم تہذیب کے آثار برآمد ہونے کے امکان ہیں اس لیے اس وقت تک زمین کی تقسیم ملتوی رکھی جائے کیونکہ آثار قدیمہ برآمد ہونے کے بعد یہ پورا علاقہ قومی تحویل میں چلا جائے گا اور صرف بقایا زمین تقسیم کرنا پڑے گی بصورت دیگر یہ علاقہ بھی تقسیم کئے جانے میں شامل ہوگا مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی میں نے کہا ”تو کوئی معقول عذر نہیں ہے عدالت اسے کیسے مان لے گی“ رانی جی نے بتایا کہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو بڑا با اثر آدمی ہے اس نے علاقے کے قومی اسمبلی کے ممبر پر زور دے کر حکمہ آثار قدیمہ سے بھی اجازت لے لی ہے کہ وہ اپنے علاقے میں جی طور پر کھدائی کرے گا اور عدالت سے بھی اسے آرڈر مل گیا ہے دوسری طرف وہ زمینیں رہن رکھ کر پیسہ اکٹھا کر رہا ہے اس کو روکوانے کے لئے عدالت سے رجوع کیا ہے۔

”لیکن جی تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں نے دریافت کیا جس پر رانی جی نے مجھ سے کہا کہ آپ نے زبان سے مجھ کو یہی کہا ہے تو اب بیٹی کے لئے عملی طور پر بھی کچھ کر کے دکھائیں آپ اعلان کر دیں کہ اس ٹیلے کے نیچے اور پورے علاقے میں پرانی تہذیب کے آثار موجود نہیں ہیں آپ کے اس اعلان کو سر مور میر ویکٹر کا اعلان سمجھا جائے گا جو آثار قدیمہ کے مستند ماہر ہیں اس بات کو کئی جھٹلائیں کے گا جی کہ سائیں جمال شاہ بھی اس کی تردید نہیں کر سکے گا اور پھر عدالت بھی مجبور ہو جائے گی کہ جلدی اس قصبے کا تصفیہ کرے میں نے رانی جی تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور انہیں بتایا کہ اس میں کم سے کم دو قبائلیں موجود ہیں پہلی تو یہ کہ میں یہ اعلان کس طرح کروں گا اگر پریس کانفرنس طلب کروں تو سب پر ظاہر ہو جائے گا کہ میں سر مور میر ویکٹر نہیں ہوں اس لئے



کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا گو ابھی تک میری خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس طرح ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ ادھر میں نے سائیں شاہ کھڑو کی مرضی کے خلاف یہ اعلان کیا اور ادھر وہ مجھے غدار کی کہہ رہے تھے۔ ڈالے گا۔ اگر مجھے قتل کر کے اس نے نیلے میں دفن کروایا تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ اس بات تک وہ خاموش رہے لیکن اس موقع پر بولے کہ وہ آپ کا بال بھی بیگا نہیں کر سکتا ہم موجود ہیں۔ میں نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس نے اپنے بڑے بھائی کو قتل کر دیا تو آپ لوگوں نے کیا کر لیا جواب کچھ کر لیں گے۔ میری اس بات نے دونوں بہن بھائی کو لا جواب کر دیا۔ رانی جی کی آنکھوں میں تو بے بسی کے آنسو آ گئے۔ لیکن میں نے ان کو ملی دی اور کہا کہ بیٹی مجھ پر بھروسہ رکھو میں تمہارا کام ضرور کروں گا۔ لیکن اس کے لئے مجھے سوچنے کا وقت دو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی ترکیب ایسی نکالوں گا کہ تمہارا کام بھی ہو جائے گا اور مجھے بھی تڑپ نہیں پہنچے گی۔ یہ سن کر رانی جی نے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا کہ مجھے معلوم ہے سائیں جمال شاہ کھڑو نے آپ کو پچاس ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا ہے اگر آپ نے میرا ساتھ دیا تو یہ رقم آپ کو نہیں ملے گی۔ لیکن آپ اطمینان رکھیے مقدمہ جیت جانے کے بعد ہم آپ کی اس سے زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ فی الحال بے شک ہمارا ہاتھ تنگ ہے کورٹ فیس جمع کرنے کے لئے بھی مجھے اپنے زہور رہن رکھنے پڑے ہیں۔ میں نے کہا بیٹی مجھے پیسے کا لالچ نہیں تم اطمینان رکھو میں بغیر کسی لالچ کے تمہارا کام کروں گا لیکن یہ کام جس طرح سے کیا جائے گا وہ میں خود سوچوں گا۔ رانی جی اور ان کے بھائی دونوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور رام چندانی مجھے جیب میں بٹھا کر واپس ہوا۔ بڑک چھوڑ کر جب میں اس نے جیب کے میں ڈالی تو پہلے کی طرح بتیاں بجا دیں اور کھڑو کو گھر سے بہت دور چلنے ہوئے مجھے اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے میں پہلے سوار ہوا تھا۔ میں پیدل چلا ہوا کمپ میں آیا سب سوئے پڑے تھے کیونکہ صبح کے پونے چار بج رہے تھے میں اپنے

ختم کر کے سر مور میر و ہلکری حیثیت سے اخبارات میں بیان شائع کرانا تھا کہ ضلع دادو میں ہنومان نامی مقام پر یا اس کے آس پاس کسی پرانی تہذیب کے آثار ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بیان جاری کرتے ہی مجھے یہاں سے فرار ہو جانا تھا۔ ورنہ سائیں جمال شاہ کھڑو سے تو بچد نہ تھا کہ وہ میرے نکلنے کے روا کے اسی ہنومان دڑو میں دفن کروا دیتے اور اب وہ مصر تھے کہ کھدائی بند کر دینے کے بعد بھی میں چند روز یہاں قیام کروں کروں۔ رانی جی کی مظلومیت کا علم ہو جانے کے بعد مجھے اس ظالم کے پچاس ہزار روپوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی ایک بڑھے آدمی کو جس کے کاندھوں پر کوئی بار بھی نہ ہوا خراسے روپے کی کمی ضرورت ہے۔ پھر میری تو گاڑیوں کی درکشاپ سلامت تھی جس سے میرا ریسرے تین چار شاگردوں کا پیٹ پل رہا تھا۔ یوں تو رانی جی نے بھی وعدہ کیا تھا کہ اپنا مقدمہ جیتنے کے بعد وہ مجھے اس سے زیادہ رقم دیں گی لیکن انہیں میں بیٹی کہہ چکا تھا اور بغیر کسی لالچ کے میں ان کی مدد کرنا چاہتا تھا میں نے سائیں جمال شاہ کھڑو سے صاف کہہ دیا کہ اب تک میں اندھیرے میں رہ کر آپ کے ارادے پر چلتا رہا۔ مگر اس دوران میں شدید ذہنی عذاب میں مبتلا رہا ہوں میری رائی فرما کر اب اپنے پتے کھول دیتے اور کم سے کم مجھے بتا دیجئے کہ اس سارے ڈرامے سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ سائیں شاہ کھڑو نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا تمہیں اپنے پچاس ہزار روپے سے غرض ہونی چاہیے وہ ہمیں مل جائیں گے پھر ساری بات کیوں پوچھتے ہو۔ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ سائیں میں انسان ہوں کھڑو بتلی نہیں مجھے پیسے کا لالچ نہیں بلکہ اسلحے کے فن کو دوبارہ زندہ کرنے کا شوق ہے میں یہاں یہ سوچ کر آیا تھا کہ آپ شاید کوئی تحریک یعنی قائم کریں گے اور اس طرح میری برسوں کی آرزو پوری ہو جائے گی۔ لیکن آپ نے تو ایک ایسا کھیل شروع کر دیا جس کا سر پیر اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن اب میں اس کا چکا ہوں آپ اگر پچاس ہزار روپے دیتا نہ چاہیں تب بھی

میں شکایت نہیں کروں گا۔ لیکن میں اندھیرے میں نہیں رہ سکتا یا تو مجھے پوری بات بتائیں یا پھر آج ہی مجھے چھٹی دے دیجئے میں باز آیا۔ میری بات سن کر سائیں جمال شاہ کھڑو سوچ میں پڑ گئے کچھ دیر بعد ان کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور پھر انہوں نے کہا۔ ”خدا کرتے ہو تو سن لو مگر کسی سے کہنا مت۔ میں نے یہ سارا ڈرامہ ایک خاص مقصد سے کھیلا تھا اسنے دن تم یعنی سر مور میر و ہلکری آثار قدیمہ کی تلاش میں کھدائی کرتے رہے یہ بات سب کو معلوم ہو گئی اور ظاہر ہے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ سر مور میر و ہلکری جیسی شخصیت جسے آثار قدیمہ کا اتنا طویل تجربہ ہے بے مقصد لندن سے تو یہاں آ کر اسنے روز کھدائی نہیں کرے گا اب میں نے کھدائی بند کر دادی ہے صرف تم یہاں رہو گے میں یہ مشہور کر دوں گا کہ ہنومان دڑو میں ایک بڑے دھننے کے آثار ملے ہیں اس لئے مزدوروں کو ہٹا دیا گیا ہے لوگ اس بات پر یقین کر لیں گے۔ پھر چند روز بعد لوگ اخبار میں پڑھیں گے کہ سر مور میر و ہلکری کو کسی سانپ نے کاٹ لیا ہے جس سے شدید بیمار ہو گئے ہیں اور فوری طور پر لندن واپس چلے گئے ہیں۔ یہ اعلان تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد کیا جائے گا۔“

”لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا کہ لوگوں کو دھننے والی بات پر یقین آ جائے گا۔“

”عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ زمین میں جو پرانا خزانہ دفن ہو اس کی حفاظت کا لالچ کرتا ہے ناگ نے تمہیں ڈس لیا اور تم جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے لندن بھاگ گئے اس سے لوگوں کو احساس ہوگا کہ ابھی دھننے کا لالچ نہیں جاسکا ہے اور تمہارے جانے کے بعد جانک میں بیمار پڑ جانے کا بہانہ کروں گا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانپ سانپ کہہ کر چیخا کروں گا جھاڑو نے پھونکنے والے آئیں گے اور پھر گاؤں کے مولوی صاحب ایک مختصر چلہ کھینچنے کے بعد اعلان کریں گے کہ انہیں بشارت ہوئی ہے زمین کا یہ کیکر امیرے لئے منحوس ہے اگر میں نے اسے بچ نہ دیا تو میں مرجاؤں گا۔“



دھننے والی بات تو بھیلی ہوئی ہوگی لوگ بڑھ چڑھ کر پائیکس کریں گے اور عام زمین سے ایک ہزار گنا زیادہ قیمت پر زمین کا پکیرا سچ ڈالوں گا اس کے بعد مجھے پرواہ بھی نہ ہوگی بڑی بھائی نے جو مقدمہ کیا ہے اس کے فیصلے کے مطابق ان کے حصے کی زمین انہیں دے دوں گا اور جو زمین میرے حصے میں آئے گی اسے میں سچ کر ایک ٹیکسٹائل مل لگا لوں گا۔ سمجھ گئے میرا پروگرام۔“

سائیں جمال شاہ کھاکھڑو اپنا بیہوش بیان کر رہے تھے اور میں حیرت کے ساتھ سوچ رہا تھا کہ گاؤں کا رہنے والا یہ شخص کس قدر چالاک ہے۔ میری ساری عمر اس پر گزری تھی لیکن اتنا براڈ ریمہ میں بھی نہیں کھیل سکتا تھا۔ سائیں جمال شاہ کھاکھڑو چلتے وقت مجھے یہ ہدایت بھی دے گئے کہ میں رام چندانی کے ساتھ کدالیں لے کر خود ٹیلے کے کسی خاص حصے کو کھودنا نظر آیا کروں تاکہ دور سے دیکھنے والوں کو پتہ چلے کہ مزدوروں کو ہٹا کر میں خود دفینہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنے کہنے کے مطابق سائیں جمال شاہ کھاکھڑو نے سارے مزدوروں کو اسی دن چھٹی دے دی وہ اپنے دونوں خیمے اکھاڑ کر چل دیے۔ ان سب کے چلے جانے کے بعد رام چندانی جو سائیں جمال شاہ کھاکھڑو کی موجودگی میں مجھ سے ذرا دور رہا کرتا تھا قریب آیا میں نے ساری باتیں اسے بتائیں اس نے تو میرے پیڑ پر میرا وہی بیان ٹائپ کر لیا تھا جو پروگرام کے مطابق مجھے اخباروں میں شائع کرنا تھا لیکن اب ہم ایسا نہیں کر سکتے تھے سائیں جمال شاہ کھاکھڑو کی ہدایت کے مطابق میں اور رام چندانی دونوں ہاتھوں میں کدالیں لئے ہومان وڈو پر بے مقصد ادھر سے ادھر کھوتے رہے باتیں کرتے رہے رام چندانی نے مجھے مشورہ دیا کہ اگر میں یہاں سے فرار ہوتا چاہوں تو وہ رات کو جیپ میں مجھے دادو پہنچا سکتا ہے جہاں سے میں بس یا ٹیکسی کے ذریعے لکراچی جاسکتا ہوں۔

لیکن اس کام میں مجھ سے زیادہ خود اس کے لئے خطرہ تھا وہ اگر خود بھاگ جاتا تب بھی میرے فرار میں

مدد دینے کے جرم میں سائیں جمال شاہ کھاکھڑو اس کے پورے خاندان کو سزا دیئے بغیر نہ رہتا تھا بے نے مجھے سکھایا ہے کہ جب کسی مسئلے کا کوئی حل نہ آئے تو خاموشی کے ساتھ انتظار کرتے رہو۔ کسی نہ کسی مرحلے پر حالات ضرور ایسی کرکٹ لیں گے کہ راستہ نظر آنے لگے گا۔ رام چندانی کی یہ تجویز بھی میں نے بالکل مسترد نہیں کی تھی کہ ہمیں فرار ہو جانا چاہئے مناسب موقع کا انتظار تھا۔ اس رات بڑی تیز موسلا دھار بارش ہوئی اور کئی گھنٹے ہوئی رہی رام چندانی کو میں نے اپنے پاس ہی روک لیا تھا۔ صبح اٹھ کر خیمے سے باہر نکل کر دیکھا تو ہر طرف جل تھل ہو رہا تھا۔ بارش اس وقت رکی ہوئی تھی اور بڑی ریزہ ریزہ پڑ رہی تھی ہوا چل رہی تھی حسب معمول ہم دونوں کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں یوں سمجھیں کہ ان دنوں کدال میری شخصیت کا جزو بن چکی تھی ٹیلے ٹیلے ہم نے دیکھا کہ مزدور کئی روز سے جس جگہ کھدائی کرتے رہے تھے وہاں ٹیلے کا ایک کنارہ پھسل کر نیچے جا گرا تھا اور اپور ایک گڑھا بن گیا تھا ہم گڑھے کے کنارے جا کھڑے ہوئے وہ کون دھونٹ کر اہوگا۔ اور اندر پانی بھر گیا تھا رام چندانی اس گڑھے میں اپنی کدال ڈال کر یونہی بے مقصد ادھر ادھر گھمانے لگا اچانک کدال کسی سخت چیز سے ٹکرائی رام چندانی کدال سے اس چیز کو کھینچنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیابی نہیں ہوئی میں نے کہا۔ ”چھوڑو کوئی پتھر ہوگا۔“

لیکن وہ کہنے لگا۔ ”یہ کوئی ایسا چھید ہے جس کے اندر کدال کی ٹوک چلی جاتی ہے پتھر نہیں ہو سکتا“ میں نے اس کے ہاتھ سے کدال لے کر پانی کے اندر ٹھول کر دیکھا تو ذرا سی کوشش کے بعد وہ سخت چیز مجھے مل گئی اور پھر میں نے وہ سوراخ بھی تلاش کر لیا جس کے پارے میں رام چندانی کہہ رہا تھا۔ یہ بالکل کسی چیز کا کٹھہ لگ رہا تھا۔ پتھر میں اس طرح سوراخ عام طور سے ہوا نہیں کرتا میں نے کدال نکال لی اور پھر چام چندانی کو لے کر وہاں سے ہٹ آیا میں نے رام چندانی کو بھیج کر باورچی کو بلایا اور اسے سامان کی ایک لمبی

چوڑی فہرست دیدی کہ یہ سب لے کر آؤ۔ اس نے پانی کا عذر پیش کیا تو میں نے انگریزوں والے لہجے میں ڈانٹ کر کہا۔ ”ویل یہ سب چیز آنا مانگا“ رام چندانی نے اس سے کہا صاحب ناراض ہو رہے ہیں فوراً چلے جاؤ نہیں تو یہ سائیں جمال شاہ کھاکھڑو سے شکایت کر دیں گے۔ وہ غریب شلوار اوپر چڑھا کر گھٹنوں گھٹنوں پانی سے ہوتا ہوا چلا گیا میں نے چیزوں کی جو فہرست رام چندانی کو اردو میں لکھوا دی تھی اس میں پھل میوے وغیرہ کے علاوہ بعض ایسی اشیاء بھی شامل تھیں جو کھاکھڑو کو گھٹ میں دستیاب نہ تھیں بلکہ ان کے لئے اسے دادو جانا ضروری تھا مقدمہ یہ تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ دیر میں واپس آئے جب وہ چلا گیا تو رام چندانی باورچی خانے سے پلاسٹک کی بائلی اٹھا لیا اس کی مدد سے ہم نے باری باری گڑھے سے پانی نکالنا شروع کیا کوئی ایک گھنٹہ بعد ہم نے خاصا پانی نکال دیا۔ اب میں نے کدال سے پتھر ہٹائی تو کسی دھات کی بنی ہوئی سطح نظر آئی اور اس میں ایک ہوتا سا کندہ بھی لگا ہوا تھا۔

رام چندانی نے فوراً کہا۔ ”سر اس کے اندر ضرور دفینہ ہوگا لیکن مشہور ہے کہ دفینے کی حفاظت سانپ کرتے ہیں“ میں نے اسے بتایا کہ یہ سب تو بات ہیں سانپ میں اتنا شعور کہاں کہ خزانے اور گنجینہ میں تیز کر سکے۔ پہلے ہم نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ گڑھے کے اندر زمین سخت ہے اور اس کے مزید دھنسنے کا امکان نہیں ہے اس کے بعد ہم دونوں نے پھاؤڑے لے کر اندر سے ٹکی نکالنا شروع کر دی بارش کی وجہ سے مٹی بھٹی ہو چکی تھی اس لئے کھدائی میں تو کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی لیکن زمین میں پتھر بہت تھے کوئی پتھر اتنی مضبوطی کے ساتھ لڑا ہوا ملتا کہ ہمیں پھاؤڑے رکھ کر کدالیں سنبھالنی پڑیں اور کھد کر اسے نکالنا پڑتا تھا۔ خاصی کوشش کے بعد آتا کھودنے میں کامیاب ہو گئے کہ اس چیز کا پورا اوپر کا حصہ نظر آنے لگا۔ یہ تانبے کی بہت موٹی چادر کا ایک بے ڈول سا تیز بن تھا جس کے دونوں طرف موٹے موٹے مضبوط کٹڑے لگے ہوئے

تھے اس کے منہ پر تانبے کا وہی ایک بہت موٹا تور کھا ہوا تھا اور اگلے کے ٹانگے سے اسے برتن کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا گیا تھا۔ ہم نے کدال کی باریک ٹوک سے رائگے کے ٹانگوں پر ہلکی ہلکی جوش مارنا شروع کیا مسلسل چوٹوں سے رائگا کٹنے لگا اور کوئی دو گھنٹے سے ہم نے رائگا بالکل کاٹ دیا۔ اس کے بعد رام چندانی نے کدال کی ٹوک کو برتن اور اس کے ڈھکن کے درمیان احتیاط سے رکھا اور میں نے ایک بڑا پتھر لے کر کدال کی دوسری مخالف سمت کی ٹوک سے جوش مارنا شروع کیا کچھ چند منٹ بعد کدال اندر داخل ہوئی اب ہم دونوں نے کدال کے دسے کو پکڑ کر نیچے کی جانب زور لگانا شروع کیا تاکہ ٹانگے ٹوٹ جائیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی آخر ایک بڑا پتھر لے کر کدال کے دسے سے پھر نیچے کی جانب ضربیں لگانا شروع کر دیں اس طرح ٹانگے ٹھٹھنے لگے رام چندانی نے دوسری کدال بھی اس میں اتار دی اور ہم دونوں نے ٹھوس ٹھاس کر توڑے کا بڑا حصہ رائگے کے ٹانگوں سے آزاد کر لیا۔ پھر کدالوں کی مدد سے ہی زور لگا کر اسے ٹھوک کر کھڑا کر لیا عام طور پر خزانے دیگ میں دفن کیے جاتے ہیں مگر یہ دیگ نہیں تھی بلکہ گول کنستر کی شکل کا برتن تھا۔ لیکن تانبے کی اتنی موٹی چادر کا بنا ہوا تھا اگر یہ خالی ہوتا اور زمین میں دھنسا ہوا نہ ہوتا تب بھی میں اور رام چندانی مل کر اسے اٹھا نہیں سکتے تھے برتن کے اندر نرم نرم راگھی بھری ہوئی تھی میں نے کدال کی ٹوک سے ٹٹوٹا جانا تو پوری ٹوک اندر چلی گئی راگھ بہت ہلکی اور بھر بھر کی قسم تھی میرا خیال تھا کہ شاید اس میں کچھ کاغذات اور دستاویزات وغیرہ ہوں گی جن کو دیمک چاٹ گئی اور جب دیمک کے لئے خوراک ختم ہوگئی تو وہ خود بھی ختم ہوگئی ہوگی۔ رام چندانی اس راگھ کو اپنے ہاتھوں سے ٹٹکنے لگا لیکن میں نے روک دیا اور اس سے کہا کہ باورچی کے خیمے میں جا کر کھینچ لے آئے رام چندانی دوڑا گیا اور دو کھینچ لے آیا۔ ان کی مدد سے ہم نے راگھ نکالنا شروع کی برتن کا قطر کوئی سوا فٹ کا تھا اور گہرائی



ایک گز سے کم رہی ہوگی شاید اس میں ساری راکھ ہی بھری ہوئی ہے رام چندانی نے کہا ہم نے ساری راکھ نکال لی لیکن برتن کی تہہ ہموار نہیں بلکہ بہت زیادہ اونچی نیچی تھی اس لئے پوری راکھ نکالنا ممکن نہ تھا۔ رام چندانی نے ایک ترکیب نکالی اور وہ یہ کہ اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیا اور کشیک سے اسے گھولنے کے بعد میرے پٹنگ کی چادر اندر ڈال دی جس نے پانی جذب کر لیا چادر باہر نکال کر ہم نے اسے نچوڑ لیا راکھ پانی میں کھل کر لپٹی رہی چند مرتبہ ایسا کرنے کے بعد ہم اس برتن کی تہہ تقریباً صاف کرنے میں کامیاب ہو گئے رام چندانی نے جھانک کر دیکھا اور بتایا کہ اس میں چھوٹی چھوٹی ایشیں پڑی ہیں ہم نے کشیک کی مدد سے ایک اینٹ کو نکالا اور دھو کر دیکھا میرا شہجہ کھلایا خالص سونے کی بنی ہوئی تھی میں نے اسے ہاتھ میں تول کر اندازہ کیا اس کا وزن تین چھٹانک کے لگ بھگ ہوگا ہم نے ایشوں کو نکالنا شروع کیا یہ دیکھی تھا کہ بارودچی نہ آجائے ہم اس کے آنے سے پہلے یہ کام ختم کرنا چاہتے تھے بارش پھر شروع ہوگئی لیکن ہم لوگ سمجھتے رہے اور کام کرتے رہے برتن میں کچھ پانی اکٹھا ہو جاتا تو چادر ڈال کر ہم اسے نکال لیتے اور پھر اپنا کام شروع کر دیتے یہ بھی اچھا ہی تھا کہ بارش تیز شروع ہوگئی تھی بارودچی ضرور نہیں پناہ لینے ڈک گیا ہوگا اور اس طرح ہمیں اپنے کام کے لئے خاصا وقت مل گیا تھا تھوڑی ایشیں اکٹھی ہو جائیں تو ہم انہیں خیمے میں منتقل کر دیتے اس لئے کہ اگر ایک کوئی آ جاتا تو فوری طور پر انہیں ہٹانا مشکل ہو جاتا شام ہونے سے پہلے ہم نے پورا برتن خالی کر دیا۔ رام چندانی نے ایشوں کی آخری کھپ کو خیمے میں منتقل کرنا شروع کر دیا اور میں نے برتن کے ڈھکنے کو کدال سے ٹھونک ٹھا کر دوبارہ بند کر دیا اس کے بعد گڑھے میں پتھر بھرنا شروع کر دیئے جب اوپر تک پتھر بھر گئے تو ہم نے جو گیلی مٹی کھود کر نکالی تھی اس میں ڈالنا شروع کر دی۔ اس وقت بارش ہو رہی تھی جو ہمارے کام میں بے حد مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ ہمیں مٹی کو کافریا ٹھونکنا

نہیں پڑ رہا تھا بلکہ گیلی ہو کر خود ہی نیچے پھسل جاتی تھی اور پتھر دھڑکے درمیان خلا کو بھرتی جاتی تھی بہت جلد ہم نے گڑھے کو اچھی طرح سے بھر دیا اور اوپر بھی احتیاطاً پتھر اس طرح ڈال دیئے جیسے وہ قدرتی طور پر پڑے ہوں۔ اس سے فراغت کے بعد ہم خیمے میں آئے رام چندانی تو ایشیں گنتے بیٹھ گیا اور میں دوبارہ سر مور میر دھیر کا میک اپ کرنے بیٹھ گیا اس لیے کہ بارش نے سارے میک اپ کا بیڑا غرق کر دیا تھا رام چندانی چونکہ اکثر رات کو میرے پاس رہ جاتا تھا اس لیے اس نے دو جوڑے کپڑے لا کر رکھ چھوڑے تھے میں نے نہانے کے بعد نیا میک اپ کیا اور پھر اسے بھی نہانے بھیج دیا۔ اس کی ایشوں کی گنتی شاید مکمل نہ ہو سکی تھی اس کا کہنا تھا کہ اس نے تین مرتبہ گنا اور تین دفعہ مختلف جواب آیا۔ آدی اچانک خوشی سے گھبرا جائے تو یہی عالم ہوتا ہے جتنی دیر میں رام چندانی نہا کر آیا میں نے ایشوں کو گن لیا یہ چھوٹی بڑی تھیں اور ان کی بناوٹ میں کوئی یکسانیت یا ہمواری نہیں تھی البتہ سونا بالکل کھ اور بڑی جلدی میں بنایا گیا ہے۔ البتہ سونا بالکل کھ اور ملاوٹ سے پاک تھا ایشیں دوسو چندہ میں اور ان کا مجموعی وزن ایک من کے قریب ہوگا۔ اس زمانے میں سونے کا بھاد کوئی چار ہزار روپے تولہ تھا۔ میں نے حساب لگایا کہ اس سونے کی مالیت کیا ہوگی اتنے میں رام چندانی نہا کر کپڑے بدل کر آ گیا اور آئینے کے پاس کھڑا ہو کر بال بنانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیوں تمہارے خیال میں یہ سب لکٹی مالیت کا ہوگا۔“

خونفک کہانیاں [204] مئی 2018ء

ساتھ برسوں جو بے انصافی ہوئی ہے وہ زمین میں ان کا حصد مل جانے کے بعد بھی پوری ناہوشی کی۔“ میں نے اسے شاباشی دی اور کہا ”میں بھی اس دھینے کو انہی کا حق سمجھتا ہوں لیکن اسے ان کے پاس پہنچانے کا کیا انتظام کیا جائے۔ رام چندانی نے میرا سوٹ کیس کھول کر سارے کپڑے نکال دیئے اور ان ایشوں کو ہم دونوں نے اس کی تہہ میں چھپنے کے بعد اوپر سے کپڑے رکھ دیئے اس کے بعد رام چندانی اسی وقت جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے کہا کہ بیٹے بارش اگرچہ بند ہو چکی ہے لیکن سارے راستے میں پانی بھرا ہوا ہے اور اب اندھیرا بھی ہو چکا ہے ایسے میں تم کہاں جاؤ گے۔ لیکن وہ ہمت والا لڑکا نہ مانتا اس نے کہا ہمیں کچھ نہیں معلوم کر لیا ہوگا ہو سکتا ہے ہمارے پاس یہی آخری رات ہو سکے تو سائیں جمال شاہ کھا کھڑو آ جائیں اور آپ سے کہیں کہ آج ہی یہ مکمل ختم کر دیجئے جب کیا ہوگا؟ اس کا جواب سن کر میں بھی لا جواب ہو گیا۔ میرے سوٹ کیس میں ایک فلیش لائٹ پڑی تھی جو میں نے اسے دے دی اور رخصت کر دیا۔ بارودچی نہیں آیا تھا اور مجھے بھوک لگی ہوئی تھی کیونکہ سارا دن شدید محنت کی تھی اور اس دوران ہمیں کھانے پینے کا ہوش ہی نہ رہا تھا۔ رام چندانی تو خیر نوجوان تھا لیکن مجھے تو اس محنت نے تھکا مارا تھا۔ میں بارودچی خانے میں گیا لیپ روشن کرنے کے بعد کچھ آلو ابال لیے چائے بنائی اور اس طرح اپنی پیٹ کی آگ بجھائی اس کے بعد میں اپنے خیمے میں آ کر لیٹ گیا شاید پونے دو بجے ہوں گے کہ رام چندانی واپس آ گیا۔ اس کے پاس مہربان چھوڑے کے دو تھیلے تھے آتے ہی اس نے بارودچی کے بارے میں پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ بارش اور پانی کے باعث وہ نہیں آیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا رام چندانی خود کھانا کھا آیا تھا میرے لئے پرائے اور کباب لایا تھا وہ کہتا رہا کہ بارودچی خانے میں جا کر انہیں گرم کر لاتا ہوں مگر میں نے اسے ایسے ہی جلدی جلدی کھالیا اس دوران رام

چندانی سونے کی ایشوں کو چھڑے کے تھیلوں میں بھرنا رہا اس نے بتایا کہ جب جس کی نیکی بھری ہوئی ہے ایک اونچی جگہ کھڑی کر آ یا ہوں رانی کی کوا طلاع دیدی ہے وہ انتظار کر رہی ہے میں راتوں رات ان کی امانت ان تک پہنچا دوں گا رام چندانی مصر تھا کہ دونوں تھیلے ایک ہی چکر میں اٹھا کر لے جائے گا اس لئے کہ جب ہنومان دڑو سے کوئی دو میل کے فاصلے پر کھڑی تھی اور ایک ہی چکر چار میل کا ہوگا پانی کچھڑ اور اندھیرے کی وجہ سے آدی یوں بھی تیز نہیں چل سکتا اگر دو چکر لگائیں گے تو صبح تک نہیں ہو جائے گی۔ لیکن میں نے اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ میں اس کے ساتھ چپ تک جاؤں گا اور ایک تھیلہ میں اٹھاؤں گا یہ طے ہو جانے کے بعد اس نے ایک تھیلے میں وزن کم اور دوسرے میں زیادہ کر لیا بھاری تھیلہ خود اٹھایا اور ہلکا مجھے دیا ہم دونوں جیسے سے نکل کر پانی اور کچھڑ میں چلنے لگے۔ رام چندانی چونکہ اس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے وہ آگے تھے۔ البتہ نارنج میرے ہاتھ میں تھی جس سے میں اسے بھی راستہ دکھاتا جاتا تھا تھوڑی دور چلنے کے بعد میری تو سانس پھول گئی لیکن چونکہ میں ایک نیک کام کر رہا تھا اس لئے میں نے تھکان برداشت کیا اور اپنے قدموں کو ست نہیں پڑنے دیا دو میل کا فاصلہ ہم نے کوئی ایک گھنٹے میں طے کیا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ رام چندانی محض میری وجہ سے چھوٹے چھوٹے قدم رکھ رہا ہے ورنہ وہ دیہات کا بڑا بڑا نوجوان اتنا وزن لے کر بھی کافی تیز چل سکتا تھا۔ دونوں تھیلے جب میں رکھ لئے گئے میں نے رام چندانی سے کہا۔ ”ہوشیاری سے جانا تم پر بڑی ذمہ داری ہے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”مجھے پورا احساس ہے آپ اطمینان رکھیں جب تک پانی اور ملاوٹ نہ ہو اور مجھے اس کے انجن پر پورا بھروسہ ہے کہ یہ بند نہیں ہوگا۔“ رام چندانی نارنج میرے پاس ہی چھوڑ گیا اس لئے کہ جب میں نئی بیڑی تھی اور اس کی لائٹ بہت تیز تھی۔ میں اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ ایک ٹیلے کی آڑ میں کچھ



کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس وقت میں نے ٹارچ جلا کر وقت دیکھا سوا چار بج رہے تھے میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے قیام کر لوں صبح کی سفیدی نمودار ہو تب چلوں۔ اس لئے کہ اب رام چندانی میرے ساتھ نہیں تھا اور مجھے بالکل علم نہ تھا کہ پانی سے ڈھکی ہوئی زمین میں گہرے گڑھے اور کھائیاں کس جگہ ہیں۔ میں نے کچھ وقت اور وہیں گزارا تو تھوڑی دیر میں مشرق کی سمت آسان سرخسی ہونے لگا اور گہرے سورج عموماً ہونے لگا۔ اتنی روشنی ہو گئی کہ ٹارچ جلائے بغیر میں راستہ دیکھ سکوں میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں بہت احتیاط سے چل رہا تھا پہلے پیر سے ٹول کر دیکھ لیتا کہ پیر زمین کو چھو رہا ہے کہ نہیں اس کے بعد اس پر وزن ڈالتا۔ میں کب کے قریب پہنچا تو دن نکل آیا تھا اب مجھے پرانی تھکان طاری تھی کہ ایک قدم چلنا دو بھر تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا اپنے خیمے تک پہنچا جیسے ہی میں نے خیمے کے دروازے کا پردہ ہٹایا مجھے ایسا لگا جیسے میرے دائیں پیر کے فٹنے سے کوئی ایک انچ اوپر کسی نے دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو۔ میرے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا اور پھر میری نظر ایک سانپ پر بڑی جوتیزی سے رینگتا ہوا شیب میں اتر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے سانپ نے ڈس لیا ہے ہمت سے کام لے کر میں اپنے کمرے میں پہنچا اور ایک چادر بچا کر اپنی پنڈلی، گھٹنے سے نیچے اور گھٹنے سے اوپر اور ران پر خوب کس کس کر پٹیاں باندھیں اس کے سوا تو اور میں کچھ کر نہ سکتا تھا۔ کہتے ہیں جس جگہ سانپ کاٹے وہاں گہرا شگاف کر کے زیادہ سے زیادہ خون نکال دینا بھی مفید ثابت ہوتا ہے لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی اس کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا ایک تو تھکان دوسرے زہر کا نشہ فوراً ہی مجھے گہری نیند آگئی یا مجھ پر گہری بے ہوشی طاری ہو گئی جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو کھا کھڑو گھوٹ میں سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کی حویلی میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوا پایا۔ آنکھیں کھولنے ہی میں نے ادھر ادھر دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن کسی نے مجھے پکڑ کر میرے پیچھے گاؤ

تک بکھڑا دیا اور میں نیم دراز حالت میں لیٹا رہا پھر میرے منہ سے گرم دودھ کا پیالہ لگا گیا جسے میں نے پی لیا۔ دودھ پینے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ابھی تک میرا ذہن پوری طرح سے چوک نہیں ہوا تھا لیکن دودھ سے جسم میں طاقت آئی اور میں گزرے ہوئے واقعات یاد کرنے لگا۔ رام چندانی کی روانگی اپنی واپسی اور سانپ کے کاٹنے کے واقعات یاد آئے۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول کر اپنے دائیں پیر کی طرف دیکھا اس پر پٹی باندھی ہوئی تھی میرے ارد گرد جو آدمی تھے وہ میرے شناسا نہیں تھے مگر کسی شخص نے سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کو اطلاع دیدی کہ مجھے ہوش آ گیا ہے۔ وہ فوراً دوڑے چلے آئے اور مجھے مبارکباد دینے کے بعد میرے سر پر باندھ گئے۔ دوسرے تمام لوگوں کو چلے جانے کا حکم دے کر انہوں نے خلیہ کر لیا اور پھر مجھے بتایا کہ سارا کام ان کی مرضی اور منصوبے کے مطابق ہو گیا۔ باورچی صبح پہنچا تو اس نے تمہیں بے ہوش پایا وہ اسی وقت دوڑا ہوا میرے پاس آیا میں نے نہ جھاڑنے پھونکنے والوں حکیموں، ڈاکٹروں غرض سب کا انتظام کیا۔ آج تیسرے دن کو ہوش آیا ہے خدا کا شکر ہے تمہاری جان بچ گئی مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ مجھے تیسرے دن ہوش آیا اتنے میں مجھے رام چندانی کا بھی خیال آیا۔ اور پھر میں سوچنے لگا کہ خدا جانے وہ دفعہ رانی جی تک پہنچ گیا ہوگا کہ نہیں۔ ویسے میرا خیال تھا کہ پہنچ ہی گیا ہوگا ورنہ کوئی دوسری بات ہوتی تو سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کا رویہ بھی بدلا ہوا ہوتا سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے تو پروگرام بنایا تھا کہ وہ جھوٹ موٹ یہ مشہور کرویں گے کہ سر مور میر و ہیل کو سانپ نے کاٹ لیا لیکن اتفاق دیکھئے کہ مجھے صبح آج اس حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے یہ مشہور کر دیا کہ سر مور میر و ہیل کو اس حادثے کے بعد کراچی روانہ کر دیا گیا لیکن انہوں نے اپنے خاص راز دار آدمیوں کی مدد سے میرا ایک اپ اور دو اگر مجھے اپنی حویلی میں ٹھہرایا تھا۔ یہاں میرا اچھی طرح علاج کروایا گیا اور

اس طرح میری جان بچ گئی لیکن سب سے زیادہ پریشانی مجھے اس بات کی تھی کہ رام چندانی نہیں آیا تھا۔ دوسرے دن میں چلے پھرنے لگا اور چونکہ کئی روز لیٹے رہنے کی وجہ سے تھک گیا تھا اس لئے کھا کھڑو گاؤں کے بازار میں ٹھٹھکے لگ گیا وہاں مجھے اچانک رام چندانی مل گیا ہم دونوں دوڑ کر ایک دوسرے سے لیٹ گئے اس نے پوچھا کہ میں کب آیا؟ میں نے بتایا کہ میں گیا ہی کب تھا۔ دراصل غلط فہمی یہ ہو گئی کہ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے مشہور کر دیا کہ سر مور میر و ہیل کو سانپ نے ڈس لیا ہے اور وہ کراچی کے لئے ہیں چونکہ یہ منصوبہ پہلے ہی سے بنا گیا تھا اس لئے رام چندانی یہی سمجھا کہ سانپ کے کاٹنے کا شخص بہانہ کیا گیا ہے وہ مجھ سے ملنے کراچی بھی گیا تھا اپنی گاڑیوں کی ورکشاپ کا پتہ میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ وہاں جا کر اسے معلوم ہوا کہ میں واپس نہیں آیا ہوں۔ اس پر وہ بے چارہ پریشان ہو گیا تھا اس نے مجھے بتایا کہ سراسر اسونا بحفاظت تمام رانی جی کو پہنچا دیا گیا ہے وہ آپ کو بے حد دعا میں دے رہی ہیں اور آپ سے ملنے کو بے قرار ہیں۔ میں نے کہا۔

”اب ذرا سائیں جمال شاہ کھا کھڑو سے چھٹی لے لوں، تب ہی آزادی کے ساتھ میں جاسکوں گا اور رانی جی سے بھی مل لوں گا۔“ اسی شام سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے مجھے ایک قیمتی سندھی اجڑا اور پچاس ہزار روپے دے دیئے۔ ان کا کام ان کی مرضی کے مطابق میں کر چکا تھا۔ اور باقی کام میں نے اور رام چندانی نے اپنے ضمیر کے مطابق انجام دیا تھا۔ سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کی گاڑی مجھے کراچی چھوڑ گئی اگلے روز صبح رام چندانی میرے پاس آ گیا میں اس کے ساتھ دادو گیا جہاں ہم نے رانی جی سے ملاقات کی۔ ان بیچاری کی شکرگزاری کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بڑی عقیدت کے ساتھ انہوں نے میرے پاؤں چھوئے اور میں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ایک قطعتری میں رکھ کر انہوں نے کچھ نقدی اور سونے کی ڈس انیشیں مجھے پیش کیں لیکن میں نے اپنی طرف سے وہ

چیزیں ان کے بچے کو دے دیں اور کہا کہ بیٹیوں کو دیا جاتا ان سے کچھ لیا نہیں جاتا انہوں نے بتایا کہ رام چندانی نے بھی ان سے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے خاندان نے ہمیشہ آپ کے خاندان کا نمک کھایا ہے آپ کے ساتھ برسوں سے بے انصافی ہوتی رہی جسے دیکھ دیکھ کر ہم کڑھتے رہے لیکن کوئی مدد نہ کر سکے یہ تو قدرت کی طرف سے ان بے انصافیوں کا ازالہ کیا گیا ہے جب آپ کو زمین میں آپ کا جائز حصہ مل جائے گا تب اس کی آمدنی میں سے جو انعام دیتے گا میں شکر یہ کے ساتھ قبول کر لوں گا۔

یہ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے مجھے سائیں جمال شاہ کھا کھڑو نے جو پچاس ہزار روپے دیئے تھے اس میں سے میں نے دو سینکڑہ پینڈ گاڑیاں خرید لیں اپنے شاگردوں کے لیے اور ان کو دکان میں حصہ دار بنالیا۔ رام چندانی کو میں نے ڈاکٹر میڈیکل کالج میں داخل کر دیا وہ ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر بن گیا۔

رانی جی کو ان کی زمین مل چکی تھی سائیں جمال شاہ کھا کھڑو ہنومان دوڑ کو اچھی قیمت پر بیچنے میں کامیاب تو ہو گئے تھے لیکن یہ روپیہ ان کے کام نہیں آ سکا تھا اس لئے کہ ایک رات بستر میں کھس کر سانپ نے انہیں ڈس لیا تھا اور صبح کو وہ مردہ پائے گئے۔ ان کے بیٹے سائیں کمال شاہ کھا کھڑو کو رانی جی نے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اپنے بچے کے ساتھ انہوں نے اس کو بھی بہترین تعلیم دلوائی۔ عدالت نے سائیں کمال شاہ کھا کھڑو کی املاک کا مگر ان بھی رانی جی کو مقرر کر دیا۔ اس کی پوری آمدنی بچے کے نام بینک میں جمع کرانی رہیں۔ وہ بھی وہ کراچی میں مجھ سے ملے آتی ہیں۔ رام چندانی نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اپنا کلینک کھول لیا ہے۔ آپ نے دیکھا اس کہانی میں حقدار کو اس کے حق سے زیادہ مل گیا اور ظالم کو سزا بھی ملی لیکن یہ انصاف اس سانپ نے کیا جس نے سائیں جمال شاہ کھا کھڑو کو ڈس لیا تھا۔



# رنگ دھنک

آپ کی بیاض، پسندیدہ اشعار کا انتخاب

کچھ الگ تھا کہنے کا انداز ان کا  
کے سنا بھی کچھ نہیں کہا بھی کچھ نہیں  
کچھ اس طرح بکھرے ان کے پیار میں ہم  
کے ٹوٹا بھی کچھ نہیں اور بچا بھی کچھ نہیں  
(ثناء اکرام۔ فیصل آباد)

کوئی رلاتا ہے کوئی ہنساتا ہے  
دل میں رہنے والا دل توڑ ہی جاتا ہے  
بڑا مشکل ہو جاتا ہے بنا ان کے جینا  
جب کوئی اپنا بنا کے چھوڑ جاتا ہے  
(صہب شاہد۔ خانیوال)

جینے کی اس نے ہمیں نئی راہ دی ہے  
خوش رہنے کی اس نے دعا دی ہے  
اے خدا اس کو سارا جہاں دینا جس نے  
اپنے دل میں ہمیں جگہ دی ہے  
(مریم آصف۔ کراچی)

ہر اک دریا کے ہونٹوں پر سمندر کا ترانا ہے  
یہاں ہر فرد کے آگے سدا کوئی بہانہ ہے  
وہی باتیں پرانی ہے وہی قصہ پرانا ہے  
تمہارے اور میرے بچ میں پھر سے زمانہ ہے  
(لائق خان۔ پشاور)

یہ کیا سلسلہ ہے تیرے اور میرے درمیان  
فاصلے تو بہت ہے مگر محبت کم نہیں ہوتی.....!  
(نواز حمید۔ فیصل آباد)

تعلق بعد میں تبدیل ہو کر جو بھی رہ جائے  
محبت سے وہ پہلا مسکراتا یاد رہتا ہے  
کسی کی لاکھ باتیں ایک پل میں بھول جاتی ہیں  
کسی کا ایک جملہ بھی پرانا یاد رہتا ہے  
(فاطمہ زہیر۔ لاہور)

دور رہ کر بھی ہم سے واسطہ رکھنا  
ملاقات کی نہ سہی پر باتوں کا سلسلہ رکھنا  
چھوڑوں آسمان کو تم یہ ہماری تمنا ہے  
پر ہم تک وہاں آنے کا راستہ رکھنا  
(عبدالرحمن۔ کجھڑہ)

بس اک معافی ہماری توبہ کی جواب ہم سنائیں تم کو  
لواب ہاتھ جوڑے، کان پکڑے، اب کیسے سنائیں تم کو  
(آمنہ راحیل۔ شوروٹ)

دیوانگی ہماری راز کھول دیتی ہے  
خاموشی ہماری ہر بات کھول دیتی ہے  
شکایت ہے تو صرف اس دنیا ہے  
جو دل کے جزبات پیسوں سے تول دیتی ہے  
(زہیر اعوان۔ شوروٹ)

اواس مت رہا کر ہم سے برداشت نہیں ہوتا  
ہم تو اپنے غم بھلا دیتے ہیں تمہیں خوش دیکھ کر  
(نعمان رحیم۔ راولپنڈی)

جینے کا حق سماراج نے چھین لیا  
اتھو مرنے کا حق استعمال کرو  
ذلت کے جینے سے مرنا بہتر ہے  
مٹ جاؤ یا قصر ستم بامال کرو  
(انتخاب۔ رانا خالد۔ سکھر)

وہ خوشی تھا امید تھا اک احساس تھا  
بعد میں یہ گماں ہوا، بس پل دو پل کا ساتھ تھا  
رہتا ہے انتظار آج بھی اس آنکھ کو کسی اپنے کا  
وہ جا کر آج بھی ساتھ ہے جو بھی ہمارے پاس تھا  
(ذیشان شرازی۔ قادر پور راول)

کیا ضرورت تھی مجھ سے دور جانے کی  
پاس رہ کر بھی کون سا ساتھ تھے تم؟؟  
(مارین سندس۔ چکوال)

چاہے تو آزمائے مجھے کسی اور سے زیادہ  
میری زندگی میں کچھ نہیں تیری محبت سے زیادہ  
(شوکت علی۔ قصور)

رو پڑا آسمان بھی آج میری وفا دیکھ کر  
بات تیری بے وفائی کی بادلوں تک جا پہنچی  
(سید خیرین۔ حیدر آباد)

# غزل

آپ کی پسندیدہ غزلوں کا انتخاب

اردو ہے میرا نام میں "خسرو" کی پہیلی  
میں "میر" کی ہرگز ہوں "غالب" کی سہیلی  
دکن کے ولی "ولی" نے مجھے گودی میں کھلایا  
"سودا" کے قصیدوں نے میرا حسن بڑھایا  
ہے "میر" کی عظمت کہ مجھے چلنا سکھایا  
میں داغ کے آگن میں کھلی بن کے چنبیلی

اردو ہے میرا نام میں "خسرو" کی پہیلی  
"غالب" نے بلندی کا سبق مجھ کو سکھایا  
"حالی" نے مروت کا سبق یاد دلایا  
"اقبال" نے آئینہ حق مجھ کو دکھایا  
"مومن" نے سچائی میرے خوابوں کی حویلی  
اردو ہے میرا نام میں "خسرو" کی پہیلی

ہے "ذوق" کی عظمت کہ دیئے مجھ کو سہارے  
"چکسبت" کی الفت نے میرے خواب سنوارے  
"فانی" نے سچائے میری پلکوں پہ ستارے  
اکبر نے رچائی میری بے تک ہتھیلی  
اردو ہے میرا نام میں "خسرو" کی پہیلی

کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ  
دیکھا تھا کبھی میں نے بھی خوشیوں کا زمانہ  
اپنے ہی وطن میں، میں ہوں مگر آج ایکلی  
اردو ہے میرا نام میں "خسرو" کی پہیلی  
(انتخاب: ام الغنیم فاطمہ۔ چکوال)

دل میں چھپے ہوئے ہیں گو جذبات بے بہا  
انظار جن کا کر نہیں سکتے ہیں برہما  
کتنے ہی رزم ان کو دکھانے سے رہ گئے  
ترک تعلقات کا جب سانچہ ہوا  
ہم جو وفا شناس تھے ناکام ہو گئے  
جو بے وفا تھا منزل مقصود پا گیا

چلیے ہوئے چار سو گہائے رنگا رنگ  
جن کی ہے شکل اور ہے خوشبو جدا جدا  
اس عشق نامراد کا ہے روگ بالیقین  
چارہ گردوں کے پاس بھی جس کی نہیں دوا  
بس قافلہ سالار کی نیت خراب تھی  
یوں تیز گام چل کے بھی نہ راستہ سنا  
گرداب سے نکل کے ہوئے پار سارے لوگ  
ناداں قمر کنارے پر ہی سوچتا رہا  
(ریاض حسین قمر۔ منگل ڈیم)

☆☆☆  
ہجر میں خون رلاتے ہو کہاں ہوتے ہو  
لوٹ کر کیوں نہیں آتے ہو کہاں ہوتے ہو  
جب بھی ملتا ہے کوئی شخص بہاروں میں  
مجھ کو تم کیسے بھلاتے ہو کہاں ہوتے ہو  
یاد آتی ہیں اکیلے میں تمہاری نیندیں  
کس طرح خود کو سلاتے ہو کہاں ہوتے ہو  
مجھ سے پھڑپھڑے ہو تو محبوب نظر ہو کس کے  
آج کل کس کو مانتے ہو کہاں ہوتے ہو  
شب کی تنہائی میں یہ خیال آتا ہے اکثر  
اپنے دکھ کسی کو سناتے ہو کہاں ہوتے ہو  
شہر کے لوگ بھی واحد بھی کرتے ہیں سوال  
اب بہت کم نظر آتے۔۔۔ ہو کہاں ہوتے ہو  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گینگوی۔ کراچی)

☆☆☆  
ٹھہرا ہے اب بام گدرد کیوں نہیں جاتا  
پورا ہے اگر چاند تو گھر کیوں نہیں جاتا  
چہرے پہ رکھتا ہے کئی غول چڑھا کے  
اندر کا جو انسان ہے سندر کیوں نہیں جاتا  
جس پل نے مرے بخت کے چہرے کو بگاڑا  
وہ پل مرے صے کا سنور کیوں نہیں جاتا  
جو بے وفا تھا منزل مقصود پا گیا  
☆☆☆



کچھ روز مرے گھر میں ٹھہر کیوں نہیں جاتا رہتا ہے مرے دل میں تو ہر وقت متید پھر تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر کیوں نہیں جاتا بس اپنے مقدر سے عامر کو گم یہ ہے جس سمت میں جاتا ہوں اُدھر کیوں نہیں جاتا (عامر زمان عامر..... پورے والا)

☆☆☆

بن اس کے اب چپ چپ رہتا اچھا لگتا ہے خاموش رہ کر درد کو سہنا اچھا لگتا ہے جس کی یاد میں آنسو برستے ہیں!! سامنے اس کے کچھ نہ کچھ کہنا اچھا لگتا ہے مل کے اس سے بچھڑنے جاؤں کہیں اس لئے بس دور ہی رہتا اچھا لگتا ہے اس کا ملنا نہ ملنا مقدر کی بات ہے۔ پل پل اس کی یاد میں ترپنا اچھا لگتا ہے بن اس کے تمام خوشیاں عجب لگتی ہیں وہی رو رو کے اس کی یاد میں سوتا اچھا لگتا ہے (انتخاب: صاحبہ اسلم..... گجراتوالہ)

☆☆☆

دل کے دامن پہ اک بجلی سی گر گیا کوئی کس بے رخی سے آج مجھے ٹھکرا گیا کوئی چپ ہوں تیری بزم میں آکے سب کچھ لٹا دیا چپکے چپکے سے اس دل میں سا گیا کوئی خاموش تھیں لگا ہیں اب دل میں تنہا نہیں کوئی پھر سے میرے ٹوٹے دل میں آگ لگا گیا کوئی خبر کیا تھی سورج بھی میرا تماشا بن گیا ہوگا مدھوشی کے عالم میں یوں رسوا کر گیا کوئی حسن والے اڑاتے ہیں میری مفلسی کا مذاق ایک نیا داغ میری زندگی پہ لگا گیا کوئی کن سوچوں کی دنیا میں مگن ہو گیا تم جاوید پیار سے دل میرا جلا کے چلا گیا کوئی (محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

☆☆☆

زندگی میں ملا تھا چند لمحے تم سے تب سے لاپتہ ہوں خود سے

بہت پر رونق تھی زندگی میری یہ عکس عینیت میں ملیں ہیں تم سے تڑپ تڑپ کر مر نہ جاؤں کہیں روکو اپنی یادوں کو یہ التجا ہے تم سے تجھ سے بچھڑ کے جی رہا ہوں کہتے مت پوچھو احوال اس زندگی کے آنکھیں بھی پوچھتی ہیں بے بس ہو کر نام تیرا کیسے بتاؤں یہ آنسو تھے جس لئے ہیں تم سے آیا ہوں پرستان سے ہو کر صائم کسی کو حسین نہ پایا بڑھ کے تم سے (ظہور احمد صائم..... انارکلی لاہور)

☆☆☆

کہیں دور جب، دن ڈھل جائے سانجھ کی دہن، بدن چرائے چپکے سے آئے میرے خیالوں کے آگن میں، کوئی پہنوں کے دھپ جلائے کبھی یونہی جب ہوئی بوجھل سائیں پھر آئیں بیٹھے بیٹھے جب یونہی آنکھیں تپتی ہل کے پیار سے مل کے، چمکے کوئی مجھے نظر نہ آئے کہیں دور جب دن ڈھل جائے سانجھ کی دہن، بدن چرائے چپکے سے آئے کہیں تو یہ دل کبھی مل نہیں پاتے کہیں نکل آئیں جنوں کے ماتے جی جی تھی ابھن مری اپنا من اپنا ہی ہے دور پرانے کہیں دور جب دن ڈھل جائے سانجھ کی دہن بدن چرائے چپکے سے آئے دل جانے میرے سارے مجید یہ گہرے ہو گئے کیسے میرے سینے سنہرے یہ میرے سینے یہ ہی تو ہے اپنے مجھ سے جدا نہ ہو گئے ان کے یہ سائے کہیں دور جب دن ڈھل جائے سانجھ کی دہن بدن چرائے چپکے سے آئے میرے خیالوں کے آگن میں کوئی پہنوں کا دھپ جلائے (شرف الدین جیلانی..... ٹنڈوالہ یار)

☆☆☆

کوئی رشتہ ٹوٹ جائے دکھ تو ہوتا ہے اپنے جو ہو جائیں پرانے دکھ تو ہوتا ہے ہم مرجائیں عہد وفا بھاتے بھاتے اور ان کو یقین نہ آئے دکھ تو ہوتا ہے مانا ہم نہیں پیار کے قابل ساگر جی مگر اس طرح کوئی ٹھکرائے دکھ تو ہوتا ہے جس کی خاطر سچائی ہم نے یہ محفل وہی اس میں نہ آئے دکھ تو ہوتا ہے ہم روز ان کو یاد کریں اپنوں کی طرح انہیں کبھی ہماری یاد نہ آئے دکھ تو ہوتا ہے (اسلم ساگر..... لاہور)

☆☆☆

سنوا تم نے کبھی ساحل پر بکھری ریت دیکھی ہے سمندر ساتھ بہتا ہے اس کے مقدر میں ہمیشہ پیاس رفتی ہے سنوا تم نے کبھی صحرا میں چلتے چڑ دیکھے ہیں کبھی کو بجائیں دیتے ہیں گران کو سیلے میں دھوپ لاتی ہے سنوا تم نے کبھی شاخوں سے بچھڑتے پھول دیکھے ہیں وہ خوشبو بانٹ دیتے ہیں بکھرنے جانے تلک سنوا تم نے کبھی میلے میں بچتے ڈھول دیکھے ہیں عجب ہے المیہ ان کا بہت شور کرتے ہیں مراد سے خالی ہوتے ہیں یہ ہی اپنا فسانہ ہے، یہ ہی اپنی پہیلی ہے ہم بھی جوڑ کر ٹوٹتے ہیں، ہم بھی سنور کر بکھرتے ہیں (عروج ماہین طہ..... راولپنڈی)

☆☆☆

ہن کے نظم غزل پھر کتابوں میں جتے ہیں دیکھ کر اس حسین کو لوگ شاعر بننے ہیں اس کے ہونٹ شعر کی دو سطریں ہو چسپے اس کی آنکھوں کو ہم غزل لکھتے ہیں اور بھی خوبصورت ہو جاتی ہے میری شاعری اس کے خط جب میرے اشعار میں ڈھلتے ہیں کرتے ہیں تذکرے میرے پیچھے، مجھ سے محبت کے مرے سامنے آکر بظاہر وہ ہنستے ہیں بکھری ابھی زندگی کی بس یہ ہی حسرت ہے سنور جائے زندگی جیسے اُس کے بال سنورے ہیں (احسان عمر..... میانوالی)

ایک مدت تک میں اس کی ضرورت بنا رہا پھر یوں ہوا کہ اس کی ضرورت بدل گئی چلتا رہا ساتھ میرے وہ بہت دیر تک پھر یوں ہوا کہ اس کی منزل بدل گئی وہ اکثر کہتا تھا عادت یہ میری ٹوٹ کر پیار کرنا پھر یوں ہوا کہ اک دن اس کی عادت بدل گئی اس نے خواب میں تعمیر کیا تھا اک تاج محل پھر یوں ہوا کہ اس کے خواب کی تعمیر بدل گئی یاد آیا وہ آج بہت شدت سے پھر یوں ہوا کہ میری زندگی کی شام ڈھل گئی (محمد وسیم..... ٹنڈوالہ)

☆☆☆

غربت کے صحرائیں اندھیری راہوں پہ چلتے چلتے جب بھی میں نے روشن صبحوں کے طلوع ہونے کا دل ناداں کو مشرودہ سنایا پھٹ پڑا یہ جھوٹے کہیں کے تمہارے مقدر میں تو سدا کی تاریکیاں ہیں کیوں مجھ کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہو وہ دکھ جو سدا میں نے سنے ہیں ان کو سننے سے لگا ہے تمہارے سنگ زندگی کے دریا پر محسوس ہوں کیوں میرا درد بڑھاتے ہو راہ میں بچے کا ٹٹوں کی آبیاری کرتے ہو

(مہر پرویز احمد دولو..... میان چنوں)

☆



یہ یاد رکھو تم میرے مرید نہیں ہو، تمہیں پاکستان میں ایک بزرگ خود ملیں گے تم ان کے مرید ہو جانا اور ان سے ارادت کے بعد تمہاری ساری قوتیں بے حد بلند ہو جائیں گی۔

**میں** کانپور سے قنوج جانے والی سڑک کے کنارے پر آباد ایک چھوٹے سے قصبے پلوہ کارہنے والا ہوں۔ میرے والد ایک معمولی کا شکار تھے تمام دن کھیتوں پر مل چلاتے اور کڑی دھوپ میں محنت کرنے کے باوجود ان کو زمیندار کی گالیاں ہی نہیں مار بھی کھانا پڑتی۔ معمولی سے معمولی ضلع دار بھی ان کے لئے چنگیز خان سے کم نہیں ہوتا تھا ان کی تقریباً ساری کمائی ان ہی بڑوں آدمیوں کی نذر ہو جاتی تھی اور ان کے ساتھ میں اور میری والدہ انتہائی تنگی و ترشی کے ساتھ دن گزارتے رہے تھے یہی وجہ تھی کہ مجھے بجائے مدرسے میں پڑھانے کے اپنے ساتھ لگایا تھا بارہ برس کی عمر تک البتہ میں نے ایک پڑوسی سے اردو پڑھ لی تھی جس کی بدولت میں کہانیوں کی کتابیں پڑھ لیتا تھا۔ اور کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھ بھی لیتا تھا بارہ سال کا ہوتے ہی مجھے والد کے ساتھ کھیت پر جانا پڑتا تھا اور وہ جو بھی کام بتاتے تھے اس کو کرتا تھا ان کاموں کے علاوہ ان کو گھر سے روٹی لا کر کھانا بھی میرے ذمے تھا میں بچپن ہی سے خاموش اور شکر قسم کا تھا اپنے باپ کے بے بسی و مظلومیت اور تنگ دستی کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ میں سوچتا تھا کہ زمیندار اور ضلعدار سے کیونکر انتقام لوں کم عمری اور کم علمی کے باعث کوئی طریقہ انتقام میری سمجھ میں نہیں آتا تھا ایک دن مجھے ایک کہانیوں کی کتاب پڑوسی کے یہاں سے مل گئی اس میں الدین کے چرائے کا واقعہ درج تھا اس کہانی کو پڑھ کر میری قوت متحیلہ نے مجھے جنات کا قاتل کر دیا اور میں فکر میں رہنے

لگا کہ میں جنات کو کیونکر قابو میں کروں۔ میرا مقصد نہ دولت تھا نہ مال مقصد تھا صرف انتقام۔ اس کتاب میں اور بھی بہت سی جادوئی کہانیاں تھیں جن کو میں نے کئی بار بہ اشتیاق پڑھا جنات کے علاوہ جادو و سحر کا اعتقاد بھی میرے دل میں بیٹھ گیا میں چونکہ خاموش طبیعت کا لڑکا تھا لہذا باپ بڑوں کے لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلتا تھا اور نہ ملتا تھا کھیتوں سے گھر واپس آنے کے بعد جب تک مجھے نیند نہ آتی تھی میں جادو و جنات و میرہ کے متعلق ہی سوچتا رہتا تھا یہاں تک کہ میری عمر اٹھارہ سال کی ہو گئی میں اپنے پڑوس کے تمام لڑکوں سے زیادہ ہوشیار اور خوبصورت تھا اب میں والد صاحب کے بجائے کھیتوں پر کام کرنے لگا میری جوانی نے والد صاحب کو آرام پہنچایا لیکن زمیندار کی سختیاں میرے جوان ہوتے ہی اور بڑھ گئیں آئے دن کے مطالبات سے میرے والد صاحب کی صحت پر برا اثر پڑا۔

اور وہ بیمار رہنے لگے ایک دن میں تو کھیتوں پر گیا ہوا تھا میرے والد کو زمیندار کا کارندہ بلا کر زمیندار کی حویلی میں لے گیا جہاں بیٹگی لگان کے لئے میرے والد پر دباؤ ڈالا گیا زمیندار کو شادی کے سلسلے میں روپے کی شدید ضرورت تھی میرے والد کے انکار پر زمیندار کے کارندوں نے انہیں اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئے بے ہوشی کے عالم میں ان کو گھر بھیج دیا گیا جہاں پہنچتے ہی ان کا انتقال ہو گیا میں اس وقت کھیتوں پر تھا جب مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو میں بھاگا بھاگا گھر پہنچا اور





حالات معلوم ہونے کے بعد میرا جذبہ انتقام اتنا بڑھا کہ میں آپے میں نہ رہا، میں رپورٹ درج کرانے کے لئے جب تھا تو وہاں سے دھککڑایا گیا اب مقدمے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا قہقہے فٹن کے بعد جب گاؤں والوں سے مشورہ کیا تو سب نے اللہ پر چھوڑ دینے کے لئے کہا کوئی گواہی دینے پر تیار نہ تھا ہر شخص کو اپنا گھریا راور عزت عزیز بھی اس صورتحال سے میں کھول کر رہ گیا اور میں نے سوچا کہ مجھے جادو اور سحر سیکھنا ہی چاہئے تاکہ میں اس کے زور سے زمیندار اور اس کے کارندوں سے انتقام لے سکوں اس خیال نے اس پختگی سے میرے ذہن میں قیام کیا کہ میں نے اس حکمت کو اپنے ماموں کی تحویل میں دے دیا اور والدہ کو ان کے سپرد کیا اور پچاس روپے لے کر کانپور آ گیا کانپور آئے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ مجھے معلوم ہوا کہ اے بی روڈ کی ایک گلی میں ایک پنڈت رہتے ہیں جن کے گنڈے بہت زوردار ہوتے ہیں خلقت روزانہ ان کے پاس آتی ہے اس خبر کے ملنے ہی میں سیدھا ان کی تلاش میں آ نکلا آدمی مشہور تھا ان کا گھر ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی میں جب پہنچا تو میں نے ایک موٹے سے سیاہ فام آدمی کو تنگ دھڑنگ صرف ایک دھوئی ہاتھ دیکھا۔

وہ ایک مرگ چھالے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے کئی سومر اور عورتوں کا بیج تھا جس سے ہر ایک کو باری باری بلا کر گنڈا یا کوئی اور چیز دے دیتا تھا میں یہ تماشا دیکھتا رہا میرے ہی سامنے کئی آدمی مٹھائیوں کی ٹوکریاں بھی لے کر آئے ان لوگوں کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے کام گنڈا لیتے ہی پورے ہو گئے میرا یقین یہاں اور پختہ ہو گیا میں دوپہر تک اس تماشے کو دیکھتا رہا آہستہ آہستہ آدمی کم ہونے لگے دن کے تقریباً دو بجے ہوں گے کہ میں تنہا رہ گیا اس پنڈت نے مجھ سے پوچھا۔ ”بتاؤ تم کو کیا کام ہے؟“

میں نے کہا۔ ”مہاراج میں آپ کا علم سیکھنا چاہتا ہوں“ وہ میرے اس جواب سے حیران رہ گئے اور بولے

”کیوں؟“ میں نے کہا یہ ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کیجئے گا؟“

پنڈت نے اصرار کیا تو میں نے کہا ”میں ایسی طاقت چاہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لے سکوں“ اس نے کہا ”کیا تم بھڑک ہو؟“ میری داڑھی منڈی ہوئی تھی، صرف چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں اور دیہات کی سکونت کے باعث میں دھوئی اور کرتا پہنتا تھا میں نے کہا ”میں نہیں مسلمان ہوں“

اس نے کہا ”اس علم کو سیکھنے کے لئے تمہیں اپنا دھرم چھوڑنا پڑے گا کیا تم تیار ہو؟“

میں نے کہا میں اپنے دھرم کو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں میں نے آج تک نماز نہیں پڑھی اور نہ مجھے معلوم ہے کہ نماز کیسے پڑھتے ہیں میں ٹھیک سے کلمہ بھی نہیں جانتا۔

اس نے کہا یہ تو اچھی بات ہے لیکن اس کے سیکھنے میں بڑی مصیبتیں جھیلنا ہوں گی۔ جان جس کام کا نام ہے اس کو ”کالاہلم“ کہتے ہیں۔

میں نے کہا ”مہاراج میں ہر مصیبت بخشی جاتی ہے کو تیار ہوں میں تو اپنے گھر کو، اپنے بھتیگوں کو، اپنی ماں کو، سب کو چھوڑ کر یہ سیکھنے ہی کے لئے آیا ہوں۔“

اس نے میرے جواب پر میرے چہرے کو بغور دیکھا غالباً میرے چہرے کے آثار سے مطمئن ہو کر اس نے کہا۔

”تو اس کے لئے تم کو کھنکھو میرے گرد کے پاس جانا ہوگا میں ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں ان کا نام پنڈت رام پرشاد جی ہے وہ آئینہ چار باغ کے نزدیک محلہ کشیش سراج کی ایک گلی میں رہتے ہیں جولال کنویں والی گلی کہلاتی ہے وہ بہت مقبول ہیں اور مشہور بھی وہ لال کنویں والے پنڈت بھی کہلاتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ابھی روانہ ہو جاؤں گا..... مجھے کچھ لینا لوانا نہیں ہے سرائے میں دو جوڑے کپڑے اور ایک بستر ہے۔“

وہ ”بولے اچھی بات ہے تم ابھی تین والی گاڑی پکڑ لو ڈاک گاڑی شام کو پانچ بجے کھنکھو پہنچ جائے گی وہ تم کو گھر پر ہی ملیں گے رات میں ان کے پاس بہت ہی لوگ آتے ہیں وہ چھ بجے روزمرگٹ جاتے ہیں اور تم چھ بجے سے پہلے ان سے مل لو گے“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک کانڈ پر ہندی زبان میں کچھ لکھ دیا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔

”دیکھو یہ تین والی گاڑی نہ چھوڑنا“ میں خوشی خوشی وہ خط لے کر سرائے آیا سامان ہی

کیا تھا ایک درمی ایک تکیے کے ساتھ ہی دو جوڑے کپڑے تھے بستر بغل میں دبایا اور سیدھا آئینہ پہنچا ٹکٹ بھی فوراً ہی مل گیا اور میں گاڑی میں بیٹھ گیا گاڑی

جوں جوں لکھنؤ کے قریب پہنچ رہی تھی میرا دل اندر سے محال ہو رہا تھا میں اپنے تصور میں زمیندار کو خون تھوکتا

اور اس کے کارندوں کو اپنا یا رنگڑتا ہوا دیکھ رہا تھا یہاں تک کہ گاڑی لکھنؤ پہنچ گئی یہ لکھنؤ کا چار باغ آئینہ تھا میں زندگی میں پہلی بار لکھنؤ آیا تھا آئینہ کی خوبصورتی دیکھ کر

حیران رہ گیا باہر نکلا شام کے چھ بجے تھے لوگوں سے پوچھتا ہوا میں نے پہنچا آئینہ سے شکل سے دفتر لاگت کا قافلہ ہوگا لال کنویں والی گلی بھی آسانی سے مل گئی اور

پنڈت کا مکان سمجھان کے مکان کے سامنے ایک چوتھرہ تھا اور اس چوتھرے پر ایک کنواں تھا جب میں ان کے مکان پر پہنچا تو محلہ نسان نظر آ رہا تھا میں نے دروازہ

کھٹکھٹایا ایک ادھیڑ عمر کا موٹا تازہ آدمی باہر نکلا اس کی رنگت گہواں تھی ماتھے پر چندن کے کئی نشانات تھے

مجھے یقین ہو گیا کہ یہی پنڈت رام پرشاد ہیں میں نے وہ درختان کو دے دیا انہوں نے پڑھ کر مجھ سے کہا۔

”اس چوتھرے پر بیٹھ جاؤ..... میں چھ بجے نکلوں گا تب تم سے بات کروں گا“ میں بیٹھ گیا امید و تم کے جذبات میرے دل میں ابل رہے تھے، ٹھیک چھ بجے وہ برآمد ہوئے ان کے ہاتھ میں لٹیا تھی اور دوسرے میں ایک تھلا انہوں نے مجھے ساتھ آئے کا اشارہ کیا۔

گلی سے باہر نکلتے ہی ایک بیکہ ان کا منتظر تھا مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا میں بیٹھ گیا بیکہ تیل دیا وہ برابر کسی چاب میں مشغول رہے بیکہ کوئل کے نیچے انہوں نے رکوا یا اتر پڑے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا نیچے بیڑھیاں تھیں جو ایک مندر میں ٹٹکی تھیں بیڑھیوں کے خاتمے پر ایک کوٹھری تھی پنڈت جی اسی میں چلے گئے اور مجھے بھی اشارے سے اندر آئے انے کہا میں اندر داخل ہوا اندر کئی تیل کے چراغ جل رہے تھے اس کوٹھری کی تمام کی تمام دیواریں سیاہ تھیں کوٹھری کے بچوں سچ ایک سیاہ بت اونچائی پر رکھا ہوا تھا یہ ایک عورت کا بت تھا جو بالکل برہمن تھا اس کی لال لال زبان باہر نکلی ہوئی تھی اس کی ہاتھوں سے خون بہتا دکھائی دے رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں تلواری تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک انسانی سر رکھا ہوا منظر بڑا ڈراؤنا تھا لیکن مجھے خوف محسوس نہ ہوا۔

پنڈت نے مجھ سے کہا ”تم مسلمان ہو“ میں نے کہا ”نام کا.....“

وہ بولے ”نام کا یہ بعد کی باتیں ہیں اس مورتی کو دیکھ رہے ہو یہ کالی مائی کی مورتی ہے اور کالاہلم اس دیوی کے پجاریوں کو آتا ہے باقی لوگوں کو جادو ٹوٹے آتے

ہیں۔ کالاہلم جادو اور ٹوٹوں سے بھی زیادہ تیز کام کرتا ہے اور اس کا ٹوکرم ہی لوگوں کو معلوم ہے مجھ پر ہے ہو۔“

وہ بولے ”کالاہلم جاننے والا بتائی، برہادی موت، بیماری، مصیبت کو منوں میں پیدا کر دیتا ہے اس کا سیکھنے والا دنیا کی ہر دولت آسانی سے پالیتا ہے۔“

میں نے کہا ”مہاراج مجھے دولت نہیں چاہئے..... میں تو انتقام کی آگ میں پھنک رہا ہوں۔“ وہ بولے ”مجھے اس سے سروکار نہیں تم اس کالے

اہلم کو سیکھنے کے بعد دنیا کا ہر کام کر سکتے ہو تم کو میرے سب سے بڑے شاگرد بننے چاہیے اسی لیے میں اتنی باتیں کل کر رہا ہوں۔“

میں نے کہا ”آپ کی بڑی مہربانی۔“ وہ بولے ”اس اہلم کو جاننے کے لئے تم کو اپنا دھرم چھوڑنا پڑے گا تم کھانا ہوگی کہ تم کلمہ بھی نہیں پڑھو گے



نماز کے قریب نہیں جاؤ گے اور کبھی اللہ کا نام نہیں لو گے  
ورنہ یہ ایلم جاتا رہے گا۔“

میں نے کہا ”میں وعدہ کرتا ہوں۔“

وہ بولے ”یوں وعدے سے کام نہیں چلے گا تم کو  
کنکو کا بیٹا بننا ہوگا۔۔۔۔۔ انسانی ماس کھانا ہوگا اور ہر وہ  
چیز استعمال کرنا ہوگی جو مسلمانوں میں حرام ہوتی ہے۔“  
میں بولا ”میں تیار ہوں۔“

اس کے بعد اس پنڈت نے مجھ کو کیا کھلایا یا کیا  
پلایا مجھ سے نہ پوچھے اور نہ میں یہاں بیان کروں گا۔  
بہر حال میں اپنے مذہب اور دین سے ہاتھ دھو کر  
رہا، اس مرحلے کے بعد پنڈت نے کہا۔

”اب تم کو میں اپنا چیلہ اس دیوی کے سامنے بنانا  
ہوں۔“

یہ کہہ کر مجھے دوڑاؤ ہونے کا حکم دیا اور کچھ زور  
زور سے پڑھتا رہا آپ یقین مانیں میں نے اسے اتھری  
مورتی کو تجسم انسانی عالم میں دیکھا وہ چوتھے سے  
اتری، اس نے پہلے پنڈت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر  
میرے سر پر اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک سے میرا جسم  
کا پتہ لگا، میں بے ہوش سا ہو گیا، جب مجھے ہوش آیا تو  
میں پنڈت کے ساتھ باہر بیڑھیوں پر تھا۔

پنڈت نے کہا ”اب آؤ ذرا گومتی میں اشانان  
کر لیا جائے تم پر دیوی نے بڑی کرپا کی ہے۔“

میں ان کے ساتھ مندر کی بیڑھیوں سے نیچے اترا  
بیڑھیاں دریاے گومتی کے اندر تک چلی گئی تھیں پنڈت  
نے وہاں اشانان کیا تھیلے سے سوکھے کپڑے نکال کر پہنے  
میں نے بھی دوسرا جوڑا نکال کر بدل لیا پنڈت اب مندر  
سے اوپر چڑھ کر سرک پر آئے یکے انتظار میں کھڑا تھا  
یکے پر بیٹھنے کے بعد پنڈت سے مجھ سے کہا۔

”میں تمہیں ائین آباد کے گھنہ گھر والے پارک

کے سامنے جو گرم شالہ ہے وہاں اتارے دیتا ہوں وہاں  
کانیج بھی میرا چیلہ ہے تم آج رات کو آرام سے سو رہو گا  
صبح سے تم کو منتر پڑھنا ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔  
کونسلے سے ایک گول گھیرا بنا کر اس میں تم کو جاپ کرنا ہے

دوپہر کو تمہیں بکرے کا خون پینا ہے اور کچھ نہیں منجیر یہ خود تم  
سب بچاؤ گے گا میں شام کو تمہارے پاس آؤں گا۔“

میں شالے میں اترنے کے بعد اس نے منجیر کو  
کچھ سمجھایا اور چلا گیا منجیر نے مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ بتایا  
جہاں میں بستر بچھا کر بیٹھ گیا رات کو منجیر ہی ایک پورے  
کا دونا مجھے دے گیا جس کو کھا کر میں سو رہا خوب نیند آئی  
صبح میری آنکھ کھلی تو منیر کھڑا ہوا تھا اس نے ایک کونسلہ  
میرے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔۔۔ میں بیٹھ کر شالے سے  
فارغ ہو کر ایک گول گھیرا بنا کر اس میں بیٹھ گیا تمام دن  
پنڈت کے بتائے ہوئے منتر کی جاپ کرتا رہا ٹھیک  
دوپہر کو منجیر ایک بڑا سا پیالہ میرے پاس لایا جو بکرے  
کے خون سے لہا لہا بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ گرم گرم گاڑھا خون  
اب مجھے سرخ کر جرت ہوتی ہے کہ میں نے وہ خون کیسے  
پیا، مجھے کوئی صدمہ نہیں آئی، میں ایک ہی سانس میں وہ  
خون چڑھا کر پھر جاپ میں مشغول ہو گیا وقت گزرنے  
لگا مجھے احساس تک نہ ہوا یہاں تک کہ شام کے چھ بجے  
پنڈت کا یکہ رکنے کی آواز آئی، وہ اندر آئے اور مجھے  
دیکھ کر بولے ”شباباش بیچے آج سے تمہارا نام بلرام  
ہے، بلرام، اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔“

میں ساتھ ہولیا، وہ کپے پر مجھے لیے ہوئے گومتی  
کے کنارے پر بنے ہوئے مرگھٹ پر لے گئے۔ مرگھٹ  
کے شروع میں بنے ہوئے دروازے پر یکہ رک گیا وہ  
اترے اور مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کرنے کے بعد آگے  
بڑھے مرگھٹ کا سارا ماحول بے حد ڈراؤنا، سنسان اور  
عجیب و غریب تھا لیکن مجھے ذرا سا بھی خوف محسوس نہ ہوا  
میں اپنے آپ کو نشے میں محسوس کر رہا تھا خدا جانے یہ  
اس شیطانی قوت کا اثر تھا یا خون پینے کا وہ کافی دور اندر  
جا کر کے اور بولے۔

”میں ایک کنڈل کھینچ دیتا ہوں تمہیں اس کے اندر  
بیٹھ کر جو جاپ بھی میں بتاؤں گا اسے ساری رات کرنا  
ہے خبردار کنڈل سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا خواہ تمہیں  
کون جان پہچان کا بھی بلائے یا کوئی خوف کا چیز تم پر حملہ  
کرنے آئے، حتیٰ کہ تم کو پیشاب یا ٹی کی ضرورت محسوس

ہو تو بھی اس کنڈل کے کنارے کر لینا، دھونا، دھلانا،  
پاکی ناپاکی یہ سب مسلمانوں کے دھرم میں ہے ہمارے  
یہاں نہیں کالا بھلا ولا جس قدر گندہ رہے گا اسی قدر  
کامیاب ہوگا۔ تمہارے کھانے کے لئے ایک دونا دیئے  
جاتا ہوں اور پینے کے لئے ایک منڈکا پانی۔“

یہ کہہ کر پنڈت نے مجھے جاپ بتادی اور چلے گئے  
جب تک ان کے پیروں کی جاپ سنائی دیتی رہی سناٹا کم  
محسوس ہوا اور ان کے جانے کے بعد ایک عجیب سناٹا اور  
دیرانی محسوس ہونے لگی لیکن مجھے کوئی خاص خوف یا  
دہشت محسوس نہیں ہوئی میں نے جاپ شروع کر دی،  
خون پینے کے بعد سے میں نے اپنے میں ایک خاص  
سرور کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ آدھی  
رات گزر گئی مجھے کچھ بھوک محسوس ہوئی میں نے دونا  
کھلا اس میں کچی کچی رکھی ہوئی تھی آپ کو تعجب ہوگا کہ  
مجھے صدمہ نہیں آئی میں نے بڑی رغبت سے وہ کچی کھائی

پانی پی لیا میں غالباً کوئی شے ٹپٹی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ مزے  
میں فرق نہ لیا لیکن میں نے کوئی پرواہ نہ کی کھانے کے بعد  
میں نے پھر جاپ شروع کر دی اچانک میں نے محسوس  
کیا کہ میرے کنڈل کے چار جانب سیاہ سیاہ ہیبت  
ناک انسان کھڑے ہیں میں نے کوئی پرواہ نہ کی پڑھتا  
رہا، یہاں تک کہ وہ صورتیں غائب ہو گئیں اب مجھے شیر  
نظر آئے جو اپنے پیروں میں جھک کر مست لگانے کے  
لئے تیار کھڑے تھے میں نے ان کی بھی کوئی پرواہ نہ کی  
یہاں تک کہ صبح کا ڈب کے آواز نمودار ہو گئے اور شیر بھی  
ان آثار کے بعد غائب ہو گئے صبح صادق ہو رہی تھی کہ  
مجھے پیروں کی جاپ سنائی دی اور تھوڑی ہی دیر میں  
پنڈت بھی آئے ہوئے نظر پڑے مجھے آرام سے بیٹھا  
دیکھ کر وہ کھل اٹھے اور میرے پاس آ کر بولے۔

”دھنیہ ہو۔۔۔۔۔ بلرام اگر ایسی ہی محنت کرتے  
رہے تو کالی مائی کی کرپا سے جلد ہی بچت ہو جاؤ گے  
چلو۔“

میں ان کے ہمراہ ہولیا وہ مجھے لے کر صبح شالا پہنچے  
اور مجھے وہاں منجیر کی نگرانی میں چھوڑ کر گئے یہاں نشتے میں

دودھ اور گرم گرم جلیبیوں مجھے ملیں لیکن آپ یقین مانیں  
مجھے کوئی لذت نہ ملی میری زبان کچی کچی اور تازہ گرم خون کی  
طالب بھی میں ناشتہ کرتے ہی سو گیا جب میری آنکھ کھلی تو  
شام کے چار بج رہے تھے منجیر نے اس وقت مجھے ایک  
پیالہ خون دیا جس کو پی کر میں نے اپنی ساری تھکان دور  
ہوتی ہوئی محسوس کی شام کے چھ بجے پنڈت جی آئے اور  
مجھے اسی وقت مرگھٹ لے گئے اور اس طرح کنڈل میں  
بٹھانے کے بعد ایک دوسری جاپ بتا کر چلے گئے اس  
رات بھیا تک صورتیں چاروں طرف سے گھیرے رہیں  
لیکن میں نے جاپ میں کوئی کمی نہ کی اب درود کا بھی معمول  
ہو گیا پنڈت جی مجھے روز مرگھٹ لے جاتے اور ہر روز جی  
جاپ بتاتے اور مجھے ساری رات مرگھٹ میں گزرتی پڑتی،  
نئی نئی عجیب عجیب شکلیں مجھے آ کر ڈراتی تھیں لیکن میں نہ  
ڈرا یہاں تک پندرہ دن گزر گئے سلیپوں دن دھرم شالے  
پہنچنے پر پنڈت نے کہا۔

”بلرام تمہارے بھاگ بہت اچھے ہیں اور تم پر  
کالی مائی بہت کرپا کر رہی ہیں آسے تمہارا دوسرا سبق  
شروع ہوتا ہے اس کا سامان بھی کالی دیوی نے کیا اس  
سبق کے لئے مجھے ایک سال کی مدت گزارنی پڑی تھی تم  
کو سلیپوں دن ہی بیوقوف قتل کیا۔“

وہ بولے ”چار بجے میں آ کر تم کو پھر مرگھٹ لے  
جاؤں گا اور میں بتاؤں گا تم تیار رہنا آج وقت سے دو  
گھنٹے پہلے ہی پہنچنا ہے۔“

میں خاموش ہو رہا ٹھیک چار بجے پنڈت جی  
آئے اور مجھے ساتھ لے کر مرگھٹ پہنچے راستے میں  
پنڈت جی نے ایک دس گز لمبا بانس ایک دکان سے لیا جو  
نگنی بانس جوڑ کر بانس میں بنایا تھا اس بانس کو میں نے  
کے میں بیٹھ کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مرگھٹ میں دن  
کی روشنی چار جانب چھلی ہوئی تھی مرگھٹ سے پنڈت  
جی دریا کے کنارے پہنچے اور بولے۔

اس بانس کو سیدھا رکھ کر تم اپنی نظریں دریا پر  
گاڑھے رکھنا شام ہوتے ہی تمہاری آنکھیں اندھیرے



میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی۔ لہذا تم دریا کو غور سے دیکھتے رہنا جب تم کو کفن میں لپی ہوئی لاش دریا میں تیرتی ہوئی نظر آئے تو پاس کے ذریعے اس کو کھینچ کر اپنے پاس لے آنا میں نے پاس کے سرے میں ایک کب لگا دیا ہے یہ کفن میں پھنس جائے گا۔

میں نے کہا ”اس کے بعد؟“

وہ بولے ”تم اس لاش کو لے کر مرگھٹ کے اندر جانا اور جہاں تم روز چاپ کرتے ہو وہاں کنڈل بنا کر بیٹھ جانا اور لاش کا کفن بھاڑنا اور لوہے چاقو، اس سے لاش کا سینہ چیر کر اس کا دل اور کیچڑ کا لیتا۔“

میں نے کہا۔ ”پھر؟“

وہ بولے ”پھر تم یہ منتر چیتا اور ایک لہا تو کا کالے رنگ کا پیر تمہارے پاس آئے گا اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں انکارے کی طرح روشن ہوگی جس کی روشنی ہر طرف پھیل جائے گی۔ وہ تم سے پوچھے گا۔ مجھے کیوں بلایا ہے؟ تم کہنا شکر تمہاری بھینٹ موجود ہے وہ اپنا منہ کھول دے گا۔ خبردار اس کے منہ میں دل نہ دینا صرف کٹی دینا۔ اور وہ کبھی بھی اپنے ہاتھ سے کھانا جب وہ کبھی کھانے کے بعد اور مانگے تو تم اس سے کہنا ”شکر تمہارا بھونجی تم کو تھوڑا تھوڑا اس وقت لے گا جب تم میرا کام کر دو گے“ یہ سن کر وہ چلا جائے گا۔

”میں نے پوچھا ”پھر مہاراج“

”پھر تمہارا کام یہ ہوگا کہ اس لاش کو دوبارہ کفن میں لپیٹ کر دریا میں بہا دینا اور اسی بانس سے دھکیل دینا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا لاش کوئی دوسری نہ ہو جو لاش تمہیں حاصل کرنا ہے وہ ایک کنواری لڑکی کی ہوگی عمر کوئی سولہ سترہ سال کی ہوگی اس نے اپنے آپ کو کفن کر کے دہر کھا تھا شکر کے بھوک کے لئے ایسی ہی کنواری لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے جو اپرا دمی ہو مجھے ایک سال انتظار کرنا پڑا تھا تم تو واقعی تقدیر کے اچھے ہو۔“

یہ کہہ کر پنڈت جی چل دیے اور میں اکیلا رہ گیا باوجود کامل سنائے اور دیرانی کے خوف کا کوئی پتا نہ تھا

رات ہوتے ہی میں دریا کے کنارے بیٹھ گیا کوئی گھینٹ بھر کے بعد مجھے ایک لاش تیرتی ہوئی نظر آئی میں نے بانس ڈالا اور اس لاش کو نکال لیا اور احتیاطاً تھوڑا سا کفن کھول کر اس کی صورت دیکھی یہ ایک مرد کی لاش تھی میں نے اسے دریا میں دھکا دے دیا آدمی رات تک اسی قسم کی پانچ چھ لاشیں مجھے میں جو پاس لڑکے کی تھیں یا بوڑھے کی میں نے سب کے سرے دیکھ کر ان کو پھر دریا میں بہا دیا غائب آدمی رات گزر چکی تھی مجھے وہ مطلوبہ لاش مل گئی میں نے پنڈت کے احکام کی قیل کی شکر آ یا اور کبھی کھاکر چلا گیا۔ دل میں نے اپنی جیب میں محفوظ کر لیا تھا میں صبح تک اسی مرگھٹ پر بیٹھا رہا، آج میری طبیعت گھرائی، کوئی شغل نہیں تھا کہ رات گزرتی صبح ہوتے ہی پنڈت جی آگئے اور بولے۔

”دھنیا ہو تمہارا کام بن گیا، تم نے آج ایک ایسے پیر کو قہقے میں کر لیا ہے جو تباہی بربادی اور موت لانے میں سب سے زیادہ تیز ہے اب چلو۔“

میں پنڈت جی کے ساتھ ہولیا، دھرم شالے میں پنڈت جی کے حکم سے ایک مانی دوا گیا اور میرے سر کے بال منڈوا دیئے گئے داڑھی چھروا دی گئی اور اب میں پنڈت جی کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا جہاں ایک بڑے کمرے میں مجھے بٹھانے کے بعد پنڈت جی نے وہ دل لے کر دھوپ میں رکھوا دیا گرمیوں کے دن تھے دن بھر میں دل سوکھ گیا شام کو پنڈت جی مجھے ہمراہ لے کر اٹین آباد کے بازار آئے اور وہاں سے ایک کوری ہانڈی خریدی اور ایک دیا بھی خریدا اور تھوڑا سا کر و اتیل لیا اور اسی بازار میں پنڈت جی نے ایک لوہار کی دکان پر جا کر لوہے کے متعدد چھوٹے چھوٹے کٹڑے خریدے اور سان رکھنے والے سے ان پر سان رکھوا کر مجھے مرگھٹ لے گئے آج پنڈت جی خود بھی ٹھہر گئے رات ہوتے ہی پنڈت جی نے مجھے ایک منتر بتایا اور کہا۔

”اس کی چاپ کرتے ہوئے اس ہنڈیا میں دیا روشن کر دو، تیل خوب بھلرنا اور اس دیئے کے چاروں طرف یہ دھاردار لوہے کے کٹڑے رکھ دو۔“

میں نے فوراً قیل کی پھر وہ بولے۔

”نپکارو، شکر شکر شکر“ میرے پکارتے ہی شکر آ موجود ہوا پنڈت جی کے حکم سے میں نے اس سے کہا۔

”اس ہانڈی کو اڑا کر لے جاؤ اور مکھو دودھ والے کی سب سے اچھی بھینٹ پر اتار دو۔“

میں حیران رہ گیا وہ ہانڈی ہوا میں بلند ہوئی اور پتھر مارتی ہوئے شہر کی طرف بڑی گھائیں گھائیں کی آوازیں میں صاف سن رہا تھا اس کے نظر سے غائب ہوتے ہی پنڈت جی نے اس سوکھے ہوئے دل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور بولے۔

”جب شکر کام کو آئے تو اس کے منہ میں دے دینا، اس سے جب بھی کام لینا ہو یہی ترکیب کرنا۔ چھوٹا سا ہی ٹکڑا دینا جب تک یہ دل تمہارے پاس رہے گا یہ تمہارا غلام رہے گا۔“

کوئی پندرہ منٹ کے بعد شکر آتا ہوا دکھائی دیا اس کا منہ کھلا ہوا تھا اس کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں، میں نے دل کا ٹکڑا اس کے منہ میں دے دیا اور وہ غائب ہو گیا اس کے ہاتھ کے بعد پنڈت نے کہا۔

”چلو مکھو کے ہاں چلتے ہیں دیکھیں وہاں کیا حال ہے؟“

میں اور پنڈت جی پھر کیے پر بیٹھے اور سیدھے ڈالنی گج کی طرف ہوئے ”وہاں ایک بڑا بھینٹ کا بازار تھا مکھوں وہاں کا دودھ والا تھا وہاں کچھ ہی ایک شور دیکھا جو چہار جانب سے بلند تھا کچھ پر معلوم ہوا کہ کسی نے مکھو کی سب سے بڑی بھینٹ پر موٹھ اترا دیا ہے وہ پنڈت جی کو دیکھتے ہی رونے لگا اور سیدھا بھینٹ کے جسم میں جا بیٹھا وہی لوہے کے کٹڑے آ پار ہو گئے تھے میں نے اس منظر کو دیکھ کر بہت مسرت محسوس کی میرا پہلا ہی حملہ کار گھر ہو گیا پنڈت جی بھی میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور وہاں سے واپسی پر مجھ سے بولے۔

”بلرنا تم نصیب کے بہت دھنی ہو کہ اتنی جلدی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ جس ہانڈی کے ذریعے ہلاکت بھیجی جاتی ہے وہ موٹھ کھاتی ہے اور اس کا کٹڑے

والا جس سے چاہے دھونس دے کر کام لے سکتا ہے تم پہلے آدمی ہو جس پر میں نے کالی مائی کو اتنا مہربان دیکھا ورنہ جانتے ہو شکر کو قافلو کرنے کے لئے کتنے دن لگتے ہیں؟“

میں نے کہا ”جی نہیں“

وہ بولے ”کم از کم دو سال..... عام طور پر کسی کنواری لڑکی کی لاش ملنا ناممکن ہے اور یہ میرا ہی کے تابع ہے۔“

میں نے کہا ”تو کیا اگلی چاپ جو میں پندرہ دن تک کرتا رہا پکا ہوگی؟“

وہ بولے ”نہیں بھائی، اس چاپ کے ماتحت لوٹا چہاری، کلوایر اور کچھ چھوٹے چھوٹے پیر ہیں وہ بھی تمہارے قابو آگئے ہیں تم نے پندرہ دن کی تعداد پوری کر لی یہ چھوٹے چھوٹے پیر معمولی پریشانیوں گھریلو الجھنیں منکسل بہاریاں کاروبار میں نقصان غریبوں میں جو تالات چلانے کا کام کرتے ہیں لیکن جان لینے کا کام صرف شکر کے اختیار میں ہے جس کا منہ تم آج دیکھ چکے ہو۔ دو دو سال تک لوگ ایسی لاش کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں جب کہیں جا کر شکر قابو میں آتا ہے۔“

میں نے کہا ”تو پھر مجھ کو اجازت ہے کہ میں گھر جا کر اپنے دشمنوں سے بدلہ لوں۔“

وہ بولے ”تم جاسکتے ہو مگر یاد رکھو یہ موٹھ دریا پار کام نہیں کرے گی اور یہ موٹھ صرف دیوانی کے تین دن انسانی جان لے سکتی ہے اور دیوانی کے پہلے اور بعد صرف جانوروں کے لئے ہی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اگر کوئی کسی دریا کے پار چلا جائے تو موٹھ کام نہیں کرے گی اور اس کو سوچ مجھ کر بھیجنا ورنہ کام نہ کرنے کی صورت میں یہ پلٹ کر واپس آئے گی تو تمہیں فوراً اپنے جسم کا تھوڑا سا خون اس پر چھڑکنا ہوگا۔“

میں نے کہا ”میں سمجھ گیا“

وہ بولے ”دریا پار جان لینے کی دوسری صورت یہ ہے کہ تم کو خود تھوڑے دنوں تکلیف اٹھانا ہوگی وہ بھی تم کو بتا دوں گا، کالی مائی تو تم پر مہربان ہے ہی، میری مہربانی کا سبب یہ ہے کہ آج تک جتنے لوگ آئے ان کو شوق تو



تھا لیکن سیکھنے کے وقت کی غذا کھیں اور ٹکڑیاں ان کو پسند نہ تھیں ان کو کراہت سی آتی تھی۔ جب تک وہ کراہت دفع نہ ہوئی ان کے قابو میں کوئی بیر نہ آیا، برخلاف اس کے باوجود مسلمان ہونے کے تم نے ہر غذا بغیر کسی گھن کے کھائی اور ہر چاب پوری تندہی سے کی اور ساتھ ہی ساتھ تم نے کوئی خوف محسوس نہ کیا۔“

میں نے کہا ”مہاراج پھر مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اپنے گاؤں واپس جاؤں، مجھے گھر چھوڑے ہوئے کافی دن ہو چکے ہیں نہ جانے زمیندار اور اس کے کارندوں نے میری عدم موجودگی میں میرے ماموں اور میری ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو؟“

وہ بولے ”جاؤ لیکن اس کی احتیاط رکھنا کہ تمہارا کھانا مسلمانوں کی طرح پاک نہ ہو جو بھی کھاؤ گندہ کھاؤ دوسرے تیسرے دن ایک پیالہ بکرے کے گرم خون کا تم کو پینا ضروری ہے۔“

میں جب دوسرے دن گاؤں پہنچا تو ہر شخص مجھے حیرت سے دیکھنے لگا بعض تو ٹھیک سے مجھے پہچان بھی نہ سکے میں جب گھر میں گھسا تو میری ماں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو کہاں تھا رے..... یہ تیرے چہرے پر شیطانی پینکار کیسے برس رہی ہے تو تو بڑا خوبصورت تھا یہ تجھے کیا ہوا؟“

میں نے آئینہ دیکھا واقعی میرا چہرہ بدل گیا تھا وہ بھولپن اور وہ نور جو میرے چہرے پر تھا اس کا کہیں پتہ نہ تھا میری آنکھیں ابلی ہوئی تھیں سرخ سرخ لال لال انگارہ جیسی میرے چہرے پر خباثت کے آثار پوری طرح رونما تھے چھوٹی سی داڑھی نے میرے حلیے کو اور بھی بدل ڈالا تھا میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں ماں، باہر کی آب و ہوا کا اثر ہے کچھ دنوں گاؤں میں رہوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

ماموں کے متعلق معلوم ہوا کہ زمیندار نے بلا کر میرے ماموں کی خوب ٹھکانی لگائی کہ بتا تیرا بھانجا کہاں ہے ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہے ورنہ ہم

تجھے زمین سے بے دخل کر دیں گے وہ مار کھانے کے بعد یہاں بلٹائی نہیں بلکہ سیدھا اپنے گاؤں چلا گیا میں نے آنے کے بعد آرام بھی نہیں کیا اور سیدھا اپنے کھیتوں پر گیا اس کی فصل زمیندار کے آدمی کاٹ رہے تھے اس کا کارندہ رکھویر موٹا سا ڈنڈا لئے ہوئے کھیت کے بیچ میں کھڑا ہوا تھا میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

”ٹھاکر صاحب یہ آپ میری بولی ہوئی فصل کیوں کٹا رہے ہیں؟ آپ کو اس کا اختیار کہاں سے ہے؟“

وہ بولے ”ڈنڈے سے“

میں نے ٹھاکر صاحب سے کہا ”میں لگان ادا کر چکا ہوں پھر آپ کو ڈنڈا چلانے کی کیا ضرورت ہے۔“

وہ بولے ”میں بیٹھی لگان کی ضرورت ہے“

میں نے بیچ کر آپ کو بیٹھی لگان دے دوں گا۔“

کارندے کے چہرے پر حیرت کے آثار نمایاں ہو گئے، ایک کا ٹھکانا اس طرح برابر سے ٹٹکتا کرتے ہوئے وہ پہلی بار سن رہا تھا، یکا یک اس کا پارہ چڑھ گیا اور بولا۔

”بس خاموش رہ حرام زادے نہیں تو اسی ڈنڈے سے تیری بڑی بولی ایک کر دوں گا، یہ فصل اسی وقت لے گی، ہم پیچیں گے اور خود اس کی قیمت لیں گے تو جو کچھ کر سکتا ہے کر لے۔“

میں نے کہا ”ٹھاکر صاحب تو پھر آج سے میرے وار روٹنا میں بتا کر حملہ کرتا ہوں۔“

اور وہ اس کو دہلی سے خرید کر لایا تھا، موٹھ گئی اور ٹھکر کامیاب پلٹا اور اپنی بھینٹ لے کر چلا گیا میں نے پچھلی سے صبح کا انتظار کرتا رہا صبح ہوتے ہی گھوڑے کی ڈھکی ہو کر مر جانے کی خبر گاؤں میں پھیل گئی، میں نے بھی سن لیا اور مجھے بے حد سرت ہوئی اس گھوڑے پر کارندے کو ناز تھا۔

اب میں نے ہر رات موٹھ بھینچنا شروع کی ایک دن کارندے کی کوئی گائے اور دوسرے دن کوئی بیل، زمیندار لالہ کشی چند کا کوئی جانور مرنے لگا ان مسلسل حملوں نے زمیندار اور اس کے کارندے کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا، دونوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، آخر کار کارندہ سمجھ گیا اس کو میرے کہے ہوئے الفاظ یاد آ گئے۔ وہ سیدھا زمیندار کے پاس گیا اور اپنے شے کا اظہار کیا، مجھے وہاں کے ایک کارندے سے کہا کہ اگر یہ اس کی کارروائی ہے تو مجھے اور تم کو اپنی جان کی فکر کرنی چاہئے ابھی تک تو جانوروں پر بیت رہی ہے اب میری اور تمہاری باری آئے گی لہذا اس کو نہ چھیڑو اس اثناء میں کانپور میں ایک آدمی بھیج کر ایک پنڈت بلوایا گیا جس دن پنڈت آیا ہے اس دن بھی زمیندار کا بیل میری موٹھ کی نذر ہو گیا، پنڈت نے بیل کی لاش دیکھ کر زمیندار سے کہا۔

”اس کا کوئی اپائے میرے پاس تو ہے نہیں اس کے لئے آپ بنارس جا کر رکشی جاگتی تھہرے نہیں وہی کوئی اپائے بتائیں گے لیکن میں ایک بات بتا دوں دیوالی تک تو آپ کے جانور مریں گے اور دیوالی کے تین دنوں میں آپ یا جس کو وہ چاہے نہیں بچے گا۔“

زمیندار نے گھبرا کر پوچھا ”پھر میں کیا کروں؟“

وہ بولے ”آپ فوراً کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں دریا بیچ میں پڑتا ہو موٹھ دو یا پانچ نہیں کرے گی، آپ دیوالی گزرنے کے بعد واپس آئیے۔“

پنڈت کے اس مشورے کو فوراً قبول کر لیا گیا اور اسی رات زمیندار اور اس کا کارندہ سیدھے بنارس روانہ ہو گئے، میرے متعلق احکامات جاری ہوئے کہ زمین سے بے دخل نہ کیا جائے اور اس فصل کا تمام روپیہ مجھے

دے دیا جائے، اس کے جانے کے بعد میرا جذبہ انتقام اور بھی بڑھا، میں نے جس غرض کے پیش نظر اپنا ایمان مذہب اور سب کچھ ترک کر دیا تھا وہ پوری نہیں ہو رہی تھی میں نے دس روز ٹھکر زمیندار کے سارے جانوروں پر موٹھ بھینچی۔ جب سب کے سب ختم ہو گئے اور ساتھ ہی زمیندار کشی چند اور اس کے کارندے کے بنارس چلے جانے کی خبر نے مجھے دیوانہ وار کر دیا، میرا دل ارمان دل ہی دل میں رہ گیا، میں نے فوراً لکھنؤ جانے کی ٹھانی اپنے گرو پنڈت رام رشاد سے مجھے پھر سبق لینے کی ضرورت محسوس ہوئی لیکن میرے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا میں سوچتا رہا، آخری میری سمجھ میں ایک ترکیب آگئی میں سیدھا زمیندار کے مکان پہنچا زمیندار کا ملازم مجھ سے بولا۔

”بھیا جی تو کاشی چلے گئے، کس کے پاس آئے ہو؟“

میں نے کہا ”میں ان کی پتی سے ملنا چاہتا ہوں۔“

وہ بولا ”کیوں.....؟“

میرے تہہ چڑھ گئے اور میں نے کہا۔

”ان سے کہہ دینا کہ جس نے ان کے سارے جانور موٹھ بھیج کر ختم کیے ہیں، وہ آیا ہے۔“

تو کر ڈر گیا اور اندر چلا گیا، زمیندار کی بیوی خود زمیندار سے بھی زیادہ ظالم تھی، اس کی بد مزاجی مشہور تھی، وہ غصے میں باہر نکلتی اور بولی۔

”کیا ہے رے؟ کیوں آیا ہے پانی؟“

میں نے کہا ”زبان سنبھال کر بولو، پانی تم اور تمہارا پتی ہے، مجھے پانچ سو روپے کی فوراً ضرورت ہے اگر تم نہیں دیتی تو آج رات ہی کو تم دیکھ لینا تمہارا بالک ایڑیاں رگڑنے لگے گا۔“

وہ بولی ”ایسی دھونس، میں نہیں آنے کی، جا جو کرنا ہو کر لے۔“

میں واپس آ گیا اور آتے ہی میں نے بوتنا چماری کے لئے جاپ شروع کر دی کوئی آدھ گھنٹے کی محنت کے بعد بوتنا چماری آئی۔ سیاہ قام بالکل برہنہ، آنکھیں نکلی



ہوئی اور بولی۔

”کیا کام ہے لہرام؟“

میں نے کہا ”زمیندار کے لڑکے کو بیمار ڈالنا ہے۔“

وہ بولی ”اچھا میری بھینٹ کا کیا ہوگا؟“

میں نے کہا ”تمہیں بھی اور شراب کی بوتل مل جائے گی۔“

شام ہوتے ہی زمیندار کے گھر سے رونے پٹنے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں، زمیندار کا ایک ہی لڑکا تھا شام ہوتے ہی اس کے پیٹ میں درد شروع ہوا اور اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ وہ ایڑیاں رگڑنے لگا زمیندار کے گھر سے موٹر فوراً کانپور گئی اور سول سرجن کو لے آئی، میں مل جانے اور آنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا ہوگا، سول سرجن نے کئی آنکشن لگائے، لیکن درد میں کمی نہ ہوئی، ڈاکٹر کی گھنٹے گھنٹہ طرح طرح کے علاج کرتا رہا لیکن بجائے اس کے درد میں زیادتی ہی ہوتی رہی، تقریباً آدھی رات کو ڈاکٹر سونے کا آنکشن لگا کر گیا لیکن لڑکے کو نیند نہ آئی، نہ آئی، زمیندار کی جتنی آخر کار میرے پاس روتی ہوئی آئی اور بولی۔

”یہ پانچ سو روپے موجود ہیں میرے بچے کو ٹھیک کر دو میں تم سے ہار گئی۔“

میں نے وہ نوٹ لے لئے اور زمیندار کی کے جاتے ہی چاب شروع کر دی، ہونا چھاری آئی، میں نے دوہری بھینٹ دے کر اس کو راضی کر لیا پھر ٹھیک ہو گیا۔

میں صبح ہوتے ہی پہلی لاری سے کانپور گیا اور وہاں سے سیدھا کھوجو صوبہ میں لکھنؤ پہنچا تقریباً دس بجے تھے، میں پیدل ہی لال کنویں پہنچا، آج خلاف معمول پنڈت رام پرشاد کے گھر پر بالکل سناٹا تھا ایک بھی گڈے تو ہیڈ والا آدمی نظر نہیں آ رہا تھا، مجھے بے حد حیرت ہوئی میں نے دروازے پر دستک دی، پنڈت جی کانوکر باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”پنڈت جی بیمار ہیں، ان کی حالت بچنے کی نہیں ہے، تمہیں برابر پوچھ رہے ہیں، تم خوب آگے

لہرام۔“ میں اس آدمی کے ساتھ اندر گیا، دالان میں ایک چارباٹی پر پنڈت جی آنکھیں بند کئے پڑے تھے میں نے ان کی منہ دیکھی بے حد تیز چل رہی تھی، ان کو شدید بخار تھا، میرے منہ پر ہاتھ رکھنے سے انہوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر کہا۔

”لہرام خوب آئے، میں تمہارے ہی انتظار میں تھا، میں اب بچوں کا نہیں۔“

میں نے کہا ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ بولے ”لہرام، تم یقین نہیں کرو گے، میں نے جتنے پاپ کئے ہیں جتنے لوگوں کو جان سے مارا ہے، جتنوں کو لکھنؤ پہنچا نہیں سب کی سب میرے سامنے آ رہی ہیں۔“

میں نے کہا ”آپ کو دہم ہو رہا ہے۔“ وہ بولے ”میں کالے پلیم کا جانے والا مرتے وقت بربادی ہوتا ہے، اس لئے کسوئے پاپ کے اس سے پن ہوتا ہی نہیں ہے، اس کی جگہ سوائے نکمہ کے کچھ نہیں ہوتی، مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے پیسے اور طاقت کے لئے دہم چھوڑ دیا۔“

میں نے کہا ”کیا آپ ہندو دہم میں نہیں ہیں؟“

وہ بولے۔ ”کوئی دہم بھی کسی انسان کی تباہی، بربادی یا موت کے مہیا پاپ کو برداشت نہیں کرتا میں اب نہیں بچوں گا۔ تم کیسے آئے؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی میں تو آپ سے موٹھ کی طاقت بڑھانے کے لئے چاب پوچھنے آیا تھا۔“

وہ بولے ”لہرام، تم اس چندے سے نکل جاؤ اور اب بھی سیدی زندگی اختیار کر لو۔“

میں نے کہا ”پنڈت جی، آپ کا مقصد کیا ہے؟“ وہ بولے ”بھیا میرا آخری وقت ہے میں جی بات بتاتا ہوں، دہم کی زندگی میں جو بات ہے وہ اس زندگی میں نہیں ہے، آخرت خراب ضرور ہوتی ہے، جیسے میری ہو رہی ہے۔“

خوفناک کہانیاں [222] مئی 2018ء

میں نے کہا ”مہاراج المیور کے لئے صاف صاف بتائیے آپ کیا چاہنا چاہتے ہیں؟“

وہ بولے ”تم نے المیور کا نام کیوں لیا، کالا پلیم اس کی اجازت نہیں دیتا، میرا مقصد یہ ہی کہ تم پھر اپنے دہم میں چلے جاؤ تو اچھے رہو گے۔“

میں نے کہا ”تو کیا پھر مسلمان ہو جاؤں۔“ وہ بولے ”ہاں اگر جی بات پوچھتے ہو تو جو کچھ تم مجھ سے سیکھنے آئے ہو میں نہ سکھا سکوں گا۔ میرا وقت پورا ہو چکا ہے تم سیدھے نکلے جاؤ جہاں کالی مائی کا اصلی مندر ہے ہیرن روڈ پر پل کے قوسوں کی دور بعد ایک کچی مڑتی ہے اس میں مندر ہے وہاں تم کو یہ سبق مل جائے گا۔“

میں نے کہا ”تو پھر میں نکلے جا رہا ہوں، آپ مجھے کیا دے رہے ہیں؟“

وہ بولے ”میرے پاس آؤ اور میری زبان چوسنا شروع کرو، دوسرا کالا پلیم اسی میں ہے وہ میں تم کو دے کر اپنے پاؤں کا بھونکنے کے لئے چلا جاؤں گا۔“

اللہ مجھے معاف فرمائے میں اندھا تھا میں نے پنڈت کی زبان چوسنا شروع کر دی آپ یقین مانیں گے ایک بدبودار کڑواہٹ تھی کہ میں حیرت میں ہوں کہ میں نے یہ گھناؤنا کام کیونکر کیا، میں زبان چوں ہی رہا تھا کہ پنڈت رام پرشاد کی آنکھیں پلٹ گئیں اور وہ متحیر ہو گئے میں نے اپنے میں کچھ ایسی توانائی محسوس کی جو اب تک مجھے محسوس نہیں ہوئی تھی۔

میں نے پنڈت جی کے ملازم کو بلا کر لاش اس کے حوالے کر دی اور سیدھا انکیشن آیا، نکلنے کی گاڑی غالباً میل ٹرین تھی مجھے چار بجے ملے کوئی میں اس میں بیٹھ گیا۔ میری حالت عجیب و غریب تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈبے میں بیٹھنے ہوئے مسافر مجھے دیکھ کر خوف کھانے لگے تھے، دو آدمیوں نے پوری بیچ میرے لئے خالی کر دی اور خود کھڑے ہو گئے میں غالباً مدھوش تھا یہ گھبراہٹ نہیں خبر کہ سفر کیونکر پورا ہوا، میں دوسرے دن اس وقت چونکا جب گاڑی ہاؤس انکیشن پہنچ چکی تھی میں باہر نکلا، مجھے

بھوک سی محسوس ہو رہی تھی میں انکیشن کے بائیں جانب ایک ہندو ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا سامنے ہی آئینہ لگا ہوا تھا آپ یقین مانیں میرا چہرہ اتنا بڑھتا تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ میری آنکھیں سرخ سرخ باہر کو ابھری ہوئی تھیں، میری داڑھی اور مونچھوں کے بال سب کھڑے ہوئے تھے اور چہرے پر سیاہ دھبے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے، ہوٹل میں بیٹھنے ہوئے لوگ بھی مجھے دیکھ کر گھبرانے لگے میں نے پوریاں کھائیں اور ہوٹل والے سے کالی مائی کے مندر کا پیٹ پوچھ کر ایک رکشہ پر بیٹھ گیا، جو ایک آدمی چلا رہا تھا پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد میں ہیرن روڈ سے اس کچی میں مڑا، جس میں کالی مائی کا مندر ہے کالی مائی کے مندر کے باہر بھکاریوں کا جھوم تھا، میں ان کی بھیڑ سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا اس مندر میں کالی مائی کی مورتی انسانی قد سے چوکی تھیں بچہ بنی ہوئی تھی جس کی زبان نکلی ہوئی تھی، اس کی باپھوں سے خون، بہتا نظر آ رہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ایک انسانی سر تھا۔ ...

پجاری گھنٹیاں، بجایا کر مقرر بڑھ رہے تھے اور ایک جگہ ہوا چراغ مورتی کے چاروں طرف گھما رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر پجاری بھی حیران رہ گئے ان کا گرو جو ایک بوڑھا آدمی تھا میری طرف بڑھا اور بولا۔

”آؤ مہاراج، دیوی کو تمہارا انتظار تھا۔“ میں نے اس بوڑھے سے گھٹنا لے کر خوب بجا نا شروع کیا اور وہ چاب کرنے لگا جس کی تعلیم مجھے پنڈت رام پرشاد نے دی تھی وہ ان لوگوں کے منتروں سے الگ تھا سارا مجمع میری چاب کون کر خاموش ہو گیا سب پجاری میری طرف دیکھنے لگے مجھے خبر نہیں کہ میں کتنی دیر چاب کرتا رہا یہاں تک کہ بڑے پجاری نے مجھے روک کر کہا۔

”رات کے بارہ بج چکے ہیں، مہاراج مندر بند کیا جا رہا ہے یہاں کوئی آدمی نہیں ٹھہرتا آپ بھی اب آرام کر لیں۔“

میں نے کہا ”مندر بند کر دو اور مجھے یہیں مورتی کے پاس رہنے دو۔“

خوفناک کہانیاں [223] مئی 2018ء



بڑا پجاری کچھ کہنا چاہتا تھا میری آنکھیں دیکھ کر رک گیا اور بولا "آپ کی مرضی، لیکن نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "ہشت"

وہ خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا اور مندر کو قفل لگنے کی آواز میں نے سنی۔ آپ ہی آپ میرے منہ سے نیا چاپ لکنا شروع ہوا۔ یہ منتر مجھے معلوم نہیں تھا میں پڑھتا رہا یہاں تک کہ میں نے اپنے بانیں ہاتھ کی تمام انگلیاں چاقو سے زخمی کر لیں اور ان کا خون مورتی کے منہ پر ڈکنا شروع کیا مجھے زخم کی کچھ تکلیف تھی اور نہ کچھ ہوش تھا مٹھی باندھ کر مین نے خون کے قطرے ٹپکائے، یکا یک میں نے محسوس کیا کہ مورتی میں جان پڑ گئی ہے اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئی اور بولی۔

"دھنیہ ہو بلرام کیا چاہتے ہو؟"

"اپنے دشمنوں کی تباہی، میری موٹھ میں اتنی ہشتی پیدا ہو جائے کہ وہ ہر وقت ہر مقام پر دشمن کا کام تمام کر دے۔"

کالی مائی کی مورتی نے کہا "بلرام جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ جتنے بھی بیر ہیں آج سے سب تمہارے حکم پر چلیں گے اگر کوئی بڑی مشکل آ پڑی تو میں خود تمہارے لئے کام کروں گی، میرا سب سے بڑا پجاری رام پرشاد مرچکا ہے اس کی جگہ تم مقرر کئے جاتے ہو۔"

میں نے کہا "دیوی میں تم پر اپنی جان بھجوا کر سنے سے گریز نہیں کروں گا۔"

وہ بولی "سیدھے بنارس جاؤ، تمہارے دشمن وہاں گیان باسی کی برابر والے مندر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

رات ہو چکی تھی میں ایک جانب بیٹھ گیا اور کیرتن سننے لگا، یکا یک گیان باسی کی مسجد سے اذان بلند ہوئی یہ آواز میری کانوں سے میرے سینے میں اترنے لگی اور میں نے دیکھا کہ میری بے خودی دروازے کی آواز مجھے یاد ہے کہ میں نے بچپن میں کی بائیس مہرے گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد میں وہاں سے پڑاؤ بلند ہوا کرتی تھی نہ میرے باپ نے کبھی نماز پڑھی تھی اور نہ میں نے پھر بھی اس آواز کی طرف دل مائل ہونے لگا مندر کے گھٹنے اذان کی آواز کو دبانے کے لئے پوری قوت سے جہاں شروع ہو گئے مجھے یہ بات ناگوار ہوئی جب اذان ختم ہوئی تو میں نے ایک آدی سے پوچھا۔

"کیا یہاں مسلمانوں کی مسجد بھی ہے؟"

وہ بولا "ہاں عالمگیر نے یہاں کے سب سے بڑے مندر کو توڑ کر مسجد میں بدل دیا تھا اب بھی مسجد کے پیچھے بت نظر آتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور دیوی یونہی کھڑی نہ کر سکے؟"

وہ بولا "کچھ کر سکتے تو آج یہاں یہ مسجد کیوں ہوتی؟"

میں نے بات کاٹ کر پوچھا کیا یہاں کانپور کے دوا دی ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

وہ بولا "ہاں مندر کے سب سے بڑے پجاری گنیش مہاراج کے یہاں مہمان ہیں۔"

میں نے پوچھا "اس کا مکان کہاں ہے؟"

وہ بولا "مسجد کے دروازے سے بائیں طرف ان کا مکان ہے"

کے بعد مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں سیدھا لنگا کے گھاٹ پر چلا گیا جب میں اشان کر کے واپس آیا تو مندر میں ہر شخص پریشان اور حیران تھا ایک موٹا سا بیڈت جس کے گلے میں ٹھوس سونے کی مالا پڑی ہوئی تھی چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے موٹھ اس مندر سے روانہ کی گئی ہے اور میرے مہمان کو مارا گیا ہے اس موٹھ کو بھیجنے والے کو خبردار کئے دیتا ہوں کہ میں ران چندر بھگت ہنومان کا پجاری ہوں میں اس پر وار کرنے والا ہوں وہ جہاں کہیں بھی ہوگا میرا وار اس پر ضرور پڑے گا وہ یہ یاد رکھے کہ میرا نام گنیش مہاراج ہے گنیش مہاراج۔"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا، شام تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہ ہوا شام کو میں کوٹھری میں چلا گیا میں نے ایک کنڈل کیچھا اور اس میں بیٹھ کر کالی مائی کے جاپ میں مشغول ہو گیا مجھے بھی اشتیاق تھا کہ میں گنیش مہاراج کے وار دیکھ سکوں۔ مجھے اس کی بڑی خوشی تھی کہ کارندے کی موت ہوئی اور اب میرے زمیندار کو اپنی موت نظر آ رہی ہوگی رات کو 9 بجے کچھ کے میں نے ایک سیاہ سایہ کوٹھری میں آتے دیکھا۔ یہ ساہ کنڈل کے پاؤں آ کر رک گیا اب مجھے اس کے نقوش صاف نظر آنے لگی یہ ایک سیاہ فام انسان نظر آ رہا تھا جس کا منہ بندر جیسا تھا اس کے تمام جسم پر سیاہ بال تھے اس کے لمبے لمبے دو دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے تھے، اس کی آنکھیں بے حد دراؤنی تھیں وہ میری طرف بڑھا لیکن کنڈل اس کی راہ میں حائل تھا اور وہ تہہ مار کر ہٹا اور بولا۔

"میں ہنومان ہوں، گنیش مہاراج میری پوجا کرتا ہے تمہارا یہ کنڈل مجھے نہیں روک سکتا ہے میں آ رہا ہوں اور دیکھو کہ میں مجھ سے کون بجاتا ہے۔"

مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن مجھے کچھ پریشانی ضرور ہوئی یکا یک اس کی برابر ہی کالی مائی ایک دم سے زمین سے برآمد ہوئی اور اس سے بولی

"ہنومان، بلرام میرا پجاری ہے خبردار اس پر ہاتھ نہ اٹھانا۔"

ہنومان نے کالی مائی کو دیکھ کر کہا "تم اس کو نہیں بچا سکتی ہو، آج مجھے اپنی تمہاری ہشتی کا امتحان کرنا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا کالی مائی کی تلوار اٹھی اور اس کے ہاتھ پر پڑی ہنومان کا ہاتھ بالکل جدا تو نہیں ہوا لیکن زخمی ضرور ہو گیا وہ دباڑا اور اس نے کالی مائی کی طرف دوسرا ہاتھ بڑھایا کالی مائی نے اس کے دوسرے ہاتھ پر بھی وار کیا وہ بھی زخمی ہو گیا زخمی ہوتے ہی ہنومان نے ایک چیخ ماری آپ یقین نہ لگائے مجھے چار جانب بندر ہی بندر نظر آنے لگے جو کالی مائی کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے کالی مائی کی تلوار برابر چلنا شروع ہوئی اور بندر مر مر کر گرنا شروع ہو گئے میں اس جنگ کو دیکھ رہا تھا یکا یک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتے ہی میں نے دیکھا ہنومان کا جسم بھی کاٹنے لگا اور کالی مائی کا بھی یہاں تک کہ دونوں ایک دم غائب ہو گئے مجھ پر اذان کی عظمت عجیب طریقے سے نمایاں ہوئی یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے اپنے چھوڑے ہوئے مذہب کا احساس ہوا۔ صبح ہوتے ہی میں لنگا اشان کرنے چلا گیا اشان کے بعد مندر واپس تو آ گیا لیکن میرے دماغ میں اسلام کی بڑائی کے خیالات بے ارادہ آنا شروع ہو گئے۔

یکایک میں نے طے کیا کہ زمیندار پر موٹھ بھیجنے سے پہلے گنیش مہاراج کی خبر لینا چاہئے جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا لیکن میں مقدر سے فحش گیا میں نے دوپہر کے وقت موٹھ تیار کی اور گنیش مہاراج کے اوپر بیج دی موٹھ بھیجنے کے ساتھ ہی میں بھی گنیش مہاراج کے مکان پر روانہ ہو گیا تا کہ میں خود اپنی آنکھوں سے گنیش مہاراج کا حشر دیکھ لوں مندر سے نکلے ہوئے مسجد پڑتی تھی جس کے دوسری طرف محوم کر مسجد کے دروازے کے باہر ہی گنیش مہاراج کا مکان تھا میں جب وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مکان کے باہر چوڑے پر گنیش مہاراج اور میرے زمیندار لالہ لکشمی چندر کیسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک مسلمان فقیر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان



مسلمان فقیر کا لباس گیر داتا اور سر پر ایک گول ٹوپی تھی ان کے ہاتھ میں ایک بیج بھی تھی جس کے دانے برابر بل رہے تھے، گیش مہاراج ان مسلمان فقیر کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے میں یہ منظر حیرت سے دیکھا کیا ان مسلمان فقیر کے چہرے پر ایسی نورانیت ایسا بھولا پن اور ایسی کشش تھی کہ میرا دل بے اختیار ان کی طرف جھکنے لگا

یہ ایک آسان پر ایک آواز ہوئی میری بیجی ہوئی موٹھ چاروں طرف رخص کرتی گیش مہاراج کے مکان کی طرف آنا شروع ہوئی اس موٹھ کی رفتار میں نے پہلی بار دیکھی وہ آہستہ آہستہ اڑ رہی تھی میں نے دیکھا کہ یہاں تک کہ موٹھ جب اس چوترے کے قریب آئی تو اس مسلمان فقیر نے نظر اٹھا کر اس موٹھ کو دیکھا، موٹھ اب نیچی ہو چکی تھی اس نے اٹکی سے اشارہ کیا میں حیران رہ گیا موٹھ اسی مقام پر ٹھہر گئی اس کی گردش ایک دم سے بند ہو گئی اس فقیر نے پھر اٹکی سے اشارہ کیا وہ موٹھ قریب ہی لگے ہوئے بجلی کے کعبے سے ٹکرائی اور چکنا چور ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کے اندر رکے ہوئے تمام لوہے کے تیر اور ٹکیں زمین میں ادھر ادھر بکھر گئیں میں یہ منظر دیکھ کر تیزی سے بھاگا اور مندر میں اپنی کٹھری میں بیج کر فشر کا منظر دیکھ کر آٹا لیکن وہ زخموں سے چور چور تھا۔ یہ حد بیمار نظر آ رہا تھا اس نے اپنا منہ کھولا میں نے سوچے ہوئے دل کا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا دل کا یہ ٹکڑا کھا کر اس میں توانائی آئی اور وہ بولا ”بلرام تم مجھے سوچ سمجھ کر بیجا کرو مسلمان فقیروں سے مجھے ڈر لگتا ہے تم نے دیکھ لیا کہ میں کتنا بے بس تھا ان کے ایک اشارہ کرتے ہی پچاسوں موکل بچہ پلوٹ پڑے۔“

میں نے کہا ”میں نے تو نہیں گیش مہاراج کے لئے بھیجا تھا“

وہ بولا ”اب گیش مہاراج اور وہ زمیندار دونوں پر میں کام نہ کر سکوں گا ان دونوں کے پاس فقیر کا دیا ہوا تعویذ موجود ہے۔“

مجھے اس ناکامی پر بے حد غصہ آیا اور میں بولا شکر جاؤ میں آج سے تم سے کوئی کام لوں گا ہی نہیں کیا تم

میں نے کہا ”مائی مجھے اب مسلمان فقیر سے بدلہ لینا ہے جس نے میری موٹھ کو ضائع کر دیا ہے۔“

وہ بولی ”اچھی بات ہے میں آج رات کو حملہ کروں گی، تم بھی میرے اس حملے کو دیکھنے کے لئے اس جگہ موجود رہنا۔“

میں خاموش ہو گیا اس کے چلے جانے کے بعد میں سو گیا، میری آنکھ تقریباً تیس گھنٹے تک کھلی رہی اس شان کے بعد میں گیش مہاراج کے مکان کی طرف گیا میں نے دیکھا کہ اس کے چوترے پر پرش پڑھا ہوا ہے وہ مسلمان فقیر ایک جانب بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے گیش مہاراج اور لالہ کشمی اور بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے میں بھی ایک جانب جا کر بیٹھ گیا گیش مہاراج کہہ رہے تھے۔

”بابا صاحب جب سے آپ کا تعویذ پہنا ہے وہ گھبراہٹ اور پریشانی محسوس نہیں ہوئی اور طبیعت بہت ٹھہری ہوئی محسوس ہوتی ہے، میرے مہمان لالہ کشمی چند کا بھی یہی حال ہے۔“

وہ بولے ”مہاراج اللہ کے نام میں بڑی قوتیں اور برکتیں ہیں“

اتنے میں مغرب کی اذان گیان باسی کی مسجد میں ہوئی وہ فقیر اٹھ کر نماز کے لئے چلے گئے اور لوگ چونکہ ہندو تھے بیٹھے رہے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ میاں صاحب آئے اور ایک طرف بیٹھ گئے اور بیٹھے ہی میری طرف مخاطب ہوئے اور بولے۔

”میاں تمہارا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو؟“ میں نے کہا ”میاں صاحب پہلے تو میں مسلمان تھا میرا نام نور تھا لیکن ہندو ہونے کے بعد میرا نام بلرام رکھا گیا۔“

”تم مسلمان سے ہندو ہو گئے۔“ میں نے کہا ”انتقام“ وہ بولے ”انتقام اچھی چیز نہیں ہے اس سے بہتر معاف کر دینا ہے۔“

میری گفتگو کے دوران زمیندار کشمی چند موجود نہیں تھے باہر گئے ہوئے تھے جوں ہی آئے اور مجھ پر نظر پڑی تو ٹھہرا گئے اور جج کر مہاراج سے بولے۔ ”میاں جج یہی وہ شخص ہے جس کے ڈر کے مارے میں بتائیں آ گیا ہوں، اس نے موٹھ بھیج بھیج کر میرے سارے موٹھی ہلاک کر دیئے اور آخر کار میرے کارندے کی جان بھی لی تھی۔“

میاں صاحب نے کہا ”جادو سحر اور ستر اسی لئے حرام ہیں کہ ان سے آدمی ہلاکت، تباہی اور بربادی کا کام لیتا ہے اللہ اس کو معاف کرے اور سیدھے راستے پر لے آئے۔“

میں نے کہا ”میاں صاحب آپ کے سامنے جو شخص میری شکایت کر رہا ہے اس نے میرے باپ کی جان لی اس نے نہ جانے کتنے غریب کا شکار کیا کو تباہ و برباد کر دیا، یہ خود اپنے مظالم بھول رہا ہے۔“

میں صاحب نے کہا ”اس کی سزا میں اسے اپنا جینا حرام معلوم ہو رہا ہے، اللہ کسی ظالم کو پسند نہیں کرتا ہے۔“ گفتگو ہو رہی تھی کہ میری بیجی ہوئی موٹھ گردش کرتی ہوئی آئی میاں صاحب نے نظر اٹھا کر اس طرف دیکھا اور کہا۔

”بلرام، اس موٹھ کا حشر بھی دیکھ لو، اللہ کا نام لینے والے ان بیجیوں اور بھوتوں کو کھائیں سمجھے“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی اٹکی سے بیج کی طرف اشارہ کیا اور اڑتی ہوئی موٹھ ایک دم سے زمین پر گر پڑی میاں صاحب نے اٹکی سے برابر دائیں بائیں بچے اور اوپر اشارے

کرنے شروع کر دیئے اور مجھ سے بولے۔ ”بلرام جاؤ اپنی کالی مائی کا حشر دیکھ لو کیا ہوا ہے؟“

میں سیدھا اٹھ کر مندر کی کٹھری میں پہنچا تو وہی دیر کے بعد مجھ سے کالی مائی نظر آئی جو زخموں سے چور تھی اس کی تھابت کا یہ عالم تھا کہ گری پڑ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”مجھے انسانی خون پلاؤ ورنہ میں گر پڑوں گی“

میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے شانے پر چاقو کا وار کیا اور خون اس کے منہ میں ٹپکا نا شروع کر دیا کچھ دیر میں وہ توانا ہو گئی اور مجھ سے بولی۔

”بلرام مسلمان فقیروں کے آگے میں بے بس ہوں، تم نے دیکھا کہ میرا کیا حال ہو گیا ہے اور کوئی کام ہو تو مجھے ہلاکتے ہو؟“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی میں نے باہر نکل کر اس زخم میں کندے کی راکھ بھری، اور سوچنا شروع کیا میری زندگی کا ایک ایک واقعہ میرے سامنے آنا شروع ہو گیا میں نے جس کام کے لئے اس مذہب کو چھوڑا وہی مقصود مجھے حاصل نہ ہوا..... تباہی و بربادی، ہلاکت مجھے بھی پسند نہیں تھی اور اس کالے بلیک میں سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں میرے کانوں میں اپنے گرو پنڈت رام پرشاد کے الفاظ گونجنے لگے۔

”مکتی صرف دھرم میں ہے، تم اس دھرم میں واپس چلے جاؤ تو اچھا ہے میرا حشر دیکھ رہے ہو“ میں ساری رات ان ہی خیالات میں کھویا رہا۔ صبح ہوتے ہی میں نے پھر طے کر لیا کہ مجھے پھر مسلمان ہونا چاہیے اور اس شب بلیک میں سے توبہ کر لینا چاہیے، یہ سوچ کر میں اٹھا اور سیدھا گیش مہاراج کے مکان پر پہنچا فجر کی اذان مسجد گیان باسی سے بلند ہو رہی تھی میاں صاحب اس چوترے پر تنہا بیٹھے ہوئے کچھ پڑھ رہے تھے میرے سامنے وہ اٹھے اور نماز کے لئے مسجد چلے گئے، میں وہیں بیٹھ گیا جب وہ مسجد سے برآمد ہوئے تو میں نے کہا۔

”میاں صاحب..... کیا میں دوبارہ مسلمان



## نیم پاگل



آج بھی عشرہ کے پاس بے شمار دولت ہے مگر کوئی بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں وہ کل کی طرح  
آج بھی اکیلے ہے اور کسی بھی قیمتی چلائی رہتی ہے اس نے جو یو یا تھا آج وہی کاٹ رہی ہے۔

انکاروں کی مانند دک رہی تھیں وہ بیڑ پر آڑی ترچھی  
لیٹی ہوئی تھی دو پٹے بچے پڑا تھا اور اس کے بال کھڑے  
ہوئے تھے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے  
اور اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے جیسے وہ لرز رہی ہو  
سانے والے موبے پر، میراب بیٹھی ہوئی تھی  
اور گریٹ بی بی کی دکان کی بوتل ابھی ختم ہی کی تھی  
کہ سگریٹ سلگالی وہ عشرہ کود کھ رہی تھی مگر ابھی تک وہ  
اسے دلا سے کی موڈ میں نہیں تھی عشرہ ہولے ہولے  
سک رہی تھی میراب لڑکھرائی ہوئی اٹھی ٹیڑھے  
قدم اٹھاتی ہوئی بیڈ تک چلی گئی صاف لگ رہا تھا کہ  
اس نے شراب پی ہے وہ غمار آلود لہجے میں بولی۔

دولت ہی عورت کا گہرا جاذبہ ہے۔  
اور محبت تو واقعی اندھی ہوتی ہے جو لوگ دوسروں  
کو دھوکہ دیتے ہیں وہ خود بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں  
شیطانی دماغ، اور خطرناک ارادوں سے پر اثر،  
لوگوں کی کمائی جو دولت کے لئے کچھ بھی کر سکتے  
ہیں۔ انکاروں، کو چھل بھجھ کر ہاتھوں میں کھینچنے والے  
لوگ ہمیشہ گھانے میں رہتے ہیں۔ جو آگ سے کھیلنے  
ہیں وہ خود بھی جل جاتے ہیں۔  
”عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو شیطان  
بھی اس سے پناہ مانگتا ہے اور اب میں اپنا انتقام لوں  
گی۔“ عشرہ تیز آواز میں بولی۔ اس کی آنکھیں سرخ

کے نقوش اب اپنے اصلی عالم میں تھے میں نے کہا۔  
”اب مجھے کیا حکم ہوتا ہے؟“

وہ بولے ”یاد رکھو، اصل مذہب پانچ وقت کی  
نماز، تیس دن کے روزے، حج اور زکوٰۃ ہیں، اس سے  
غافل نہ ہونا، حج اور زکوٰۃ ہم پر واجب نہیں ہے نماز روزہ  
کسی عالم میں معاف نہیں ہے اللہ کا دستور رکھو وہ اپنے  
بندوں کو ہمیشہ نوازتا ہے۔“

اصل ایمان حضور ﷺ کی محبت ہے۔“  
میں نے کہا ”میاں صاحب آپ یقیناً مائیں  
میں اپنی زندگی میں ایک عجیب انقلاب دیکھ رہا ہوں کہ  
مجھے اپنا جسم ہلکا نظر آ رہا ہے اور طبیعت بے حد ہشاش  
میں انشاء اللہ نماز، روزہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ بولے ”تم سیدھے اپنے وطن جاؤ، تمہاری ماں  
کا انتقال ہو چکا ہے تم اپنی زمینیں زمیندار کشمی چند کے  
ہاتھ بیچ دو میں کہے دیتا ہوں وہ تم کو معقول معاوضہ دے  
دے گا اور تم سیدھے پاکستان جاؤ، وہاں جا کر کوئی  
روزگار کرو، اللہ تم کو نوازے گا۔“

میں نے کہا ”بہت اچھا۔“

وہ بولے ”اور ہاں یہ یاد رکھو تم میرے مرید نہیں  
ہو، تمہیں پاکستان میں ایک بزرگ خود ملیں گے تم ان  
کے مرید ہو جانا اور ان سے ارادت کے بعد تمہاری  
ساری قوتیں بے حد بلند ہو جائیں گی۔“

میاں صاحب نے اسی دن لالہ کشمی چند سے  
مجھے زمینوں کی اچھی قیمت دلوادی میں سیدھا وطن آیا،  
واقعی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ وطن سے سیدھا کھوکھرا پار  
ہوتا ہوا میں پاکستان آ گیا ہوں، بھائی اللہ کا احسان ہے  
میری ایک پرچون کی دکان ہے آمدنی اچھی اور معقول  
ہے، مین نے شادی نہیں کی ہے میں محلے میں نیک اور  
پرہیزگار مشہور ہوں، نماز مجھ سے کسی وقت کی قضا نہیں  
ہوتی، رمضان میں روزہ کوئی نہیں چھوٹا، لیکن اب تک  
کسی ایسے بزرگ سے ملاقات نہیں ہوئی ہے جو میرے  
پاس خود شریف لاتے ہیں انہیں کا منظر ہوں۔

☆

ہو سکتا ہوں۔“ وہ بولے ”کیوں نہیں، اسلام نام ہے اللہ  
کو دل سے مان لینے اور حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان  
لے آئے کا۔“

میں نے کہا ”اور جو یہ گناہ مجھ سے سرزد ہوئے  
ہیں۔“

وہ بولے ”توبہ کر لینے اور اسلام قبول کر لینے کے  
بعد یہ سب معاف ہو جائیں گے۔“

میں نے کہا ”تو میں ابھی جا کر غسل کرتا ہوں اور  
نئے کپڑے پہن کر آپ کے پاس آتا ہوں آپ مجھے  
مذہب اسلام میں قبول کر لیں۔“

وہ بولے ”اچھی بات ہے تم مسجد میں آ جانا۔“

میں سیدھا بازار گیا میں نے ریڈی میٹ کپڑے  
پہنے، مسلمانوں جیسا خط بنوایا اور گنگا میں جا کر غسل  
کرنے کے بعد انہیں نئے کپڑوں میں سیدھا مسجد  
پہنچا، میاں صاحب اور تین چار نمازی مسجد میں بیٹھے  
ہوئے تھے۔ میں نے کہا ”میاں صاحب، میں حاضر  
ہو گیا ہوں، مجھے مسلمان کر لیجئے۔“

وہ بولے ”پہلے آئینے میں اپنی شکل دیکھ لو، میں  
نے آئینہ منگا رکھا ہے۔“

میں نے آئینہ لے کر صورت دیکھی، آپ یقیناً  
مانجے چہرے پر جو خفا تھی وہ دیکھ کر حیران رہ گیا، میں  
اچھے نقوش کا مالک تھا، لیکن میرے تمام نقوش بھدے  
نظر آ رہے تھے، چہرے پر جا بجا سیاہ رنگ کے داغ تھے  
جو چمک رہے تھے۔

میں نے کہا ”میں نے صورت دیکھ لی ہے اب  
آپ مجھے دوبارہ دائرہ اسلام میں واپس لے آئیں۔“

انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کمر پڑھا،  
کالے ہلیم سے توبہ کرائی اور تمام گناہوں سے توبہ کرانے  
کے بعد مجھے اپنا بھونٹا پیٹنے کو دیا میں نے اختیار ہی کیا،  
اس کے بعد انہوں نے مجھے آئینہ دیا اور کہا ”دیکھو“

آپ یقیناً مانے میں حیران رہ گیا وہ سیاہ دھبے  
ایک دم سے غائب ہو گئے میرے چہرے پر بجائے  
خفا کے ایک بھولا پن نمایاں ہو گیا میرے چہرے



”عشرہ ایہ کیا پاگل ہیں ہے بے بی خود کو سنبھالو اس طرح بچوں کی ری ایکٹ مت کرو یہ زندگی ہے اونچ نیچ تو کی رہتی ہے۔“ عشرہ نے اس کو دیکھا اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”میرا اب تم نہیں سمجھ سکتی کہ میں کس کرب میں مبتلا ہوں اور میری ساری پلاننگ چوہٹ ہو گئی ہے دراب کے لئے، میں نے وہاب کو زندہ درگور کر دیا اور اب، اب میں.....“ وہ سکی۔

”ہاں یو! بتاؤ تا کیوں خاموش ہو گئی ہو۔“

”میرا اب، اب، میں دراب کو نہیں چھوڑوں گی میں اپنی ذات کا بدلہ لوں گی اس سے۔“ وہ ایک لمحے کے لئے کھوی گئی میرا بے سگریٹ کا ایک لمبا کش اس کے چہرے پر چھوڑ دیا۔

”بے بی! اس طرح تم نے وہاب کے ساتھ کیا دراب نے تو اس کے بدلے تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اس نے تو اپنے لئے خطرہ مول لیا ہے تمہیں زندہ سلامت چھوڑ کر۔“

”میرا اب میں کیا کروں؟ مجھے تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے کہ میں کس کے پاس جاؤں۔ کس سے مدد مانگوں۔“

”عشو! اتم یہاں میرے فلیٹ پر محفوظ ہو اور میرے تعلقات بھی خاصے مضبوط ہیں تم شروع سے بتاؤ کہ دو، مردوں کے بیچ تم کس طرح چبھتی کہ صحیح فیصلہ نہ کرائی۔“

میرا اب نے سوالیہ نظروں کو دیکھ کر عشرہ ماضی میں پلٹ گئی۔

”میرا اب تمہیں تو پتہ ہے کہ حسن، باکر دار، مرد کو بھی کھنے پینے پر مجبور کر سکتے ہیں اور میں بلا کی حسین ہوں۔“

ان دنوں میں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی میں اکناس آرٹ کی طالبہ تھی مگر میں پڑھائی پر توجہ تو نہیں دیتی تھی صرف موج مستی اور وقت گزاری کے لئے یونیورسٹی جاتی تھی ہمیشہ بڑی عمارتیں خوب

صورت گاہیں اور خوب صورت لوگ میری کنزروی تھے ایک امیر دیکھ کر ماں باپ کا بیٹا وہاب مجھ پر حرمنا تھا مگر اس کی ایک خاموشی تھی مجھے اس سے نفرت پر مجبور کر دیتی تھی اس کے پاس کروڑوں، عربوں روپے تھے وہ روز خوب صورت بنے بنے سوٹوں میں ملبوس ہو کر یونیورسٹی آتا تھا وہ اگر کالانہ ہوتا تو میرے دل کا شہزادہ ہوتا اس کا پورا نام وہاب اگر وال تھا کئی ملز کا اکلوتا مالک، بلڑکیاں اس پر مرنی تھیں اور میں اپنی غریب زندگی سے تنگ آ چکی تھی ایک دن اس نے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا میں تو حیرت کا بت بن گئی اور منہ چڑھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

تنگ و تاریک راہ داری کی مانند گندی گلیوں میں سے گزر کر میں گھریک پہنچی تو امی میرے لئے بہت پریشان تھیں مگر میں، میں نے جلدی جلدی روٹی کھائی اور ادھر چھت پر چلی گئی میں بے مبری سے چکر کاٹ رہی تھی کہ اچانک ہمارے سامنے والے ملحقہ چھت پر قدموں کی آواز ابھری میری نظر سامنے والے چھت پر ٹھہر گئی اور پھر میرے دل کا شہزادہ دراب چھت پر نمودار ہوا وہ بلا کا حسین تھا میری طرح غربت کا مارا تھا میں اسے پسند کرتی تھی اور چھت پر گھنٹوں اس سے باتیں کرتی تھی۔

”کیسے دراب؟ ارے تم تو پریشان دکھائی دے رہی ہو۔“

”ہاں دراب بات پریشانی کی ہی تو ہے کسی نے مجھے پر پوزل دے دیا ہے۔“ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ گئی۔

”کون ہے وہ کمینہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ارے تم تو جذباتی ہو گئے ہو وہ کوئی عام انسان نہیں ہے شہر کے سب سے بڑے صنعت کار شازل اگر وال کا اکلوتا بیٹا وہاب اگر وال ہے۔“ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

”ناممکن۔“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔

”دراب، وہاب اگر وال نے مجھے یونیورسٹی کی تقریب میں دیکھا تھا اور مجھ پر اپنا دل ہار گیا۔ اگر تم اب شادی میں دیر کر رہے ہو تو میں اس کا پر پوزل قبول کر لوں گی۔“ وہ جواب دینے بغیر نیچے چلا گیا۔

کل صبح پھر مجھے وہاب اگر وال یونیورسٹی میں ملا مجھ سے وہی سوال کا جواب مانگا میں نے دودن کا وقت مانگا وہاب اب تم مجھے دودن بعد ملنا اور ہاں اگر میں شادی سے انکار کر دوں تو تمہیں میرا ہر فیصلہ ماننا پڑے گا وہاب نے میری طرف دیکھا ٹھیک ہے عشرہ جو تمہارا فیصلہ ہوگا وہی میرا فیصلہ ہوگا مگر سوچ سمجھ کر تم صحیح فیصلہ کرنا ٹھیک ہے وہاب اب تم جاؤ میں دودن کے بعد تمہیں ملوں گی وہ وہاں سے چلا گیا۔

وہاب اگر وال رنگ سے کالا تھا اس لئے کبھی بھی میرے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا تھا مگر اس کا ایشیئس میری زندگی کا سہانا پنا تھا دوسری طرف میرا پیار دراب تھا جو نام صرف خوب صورت تھا بلکہ کنگا بھی تھا اور میں تو خود اپنی زندگی سے پریشان تھی سو میں نے اگلے دن فیصلہ کر لیا۔

دراب سے مجھے آج ہر حال میں ملنا ہے اسے اپنے دل سے فوج کر چھینک دوں گی اور وہاب سے شادی کر کے اپنے سپنوں کی منزل پالوں گی یہ سوچ کر میں چھت پر چلی گئی ابھی آدھا گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ دراب اپنی چھت پر سے نمودار ہو گیا میں بے چین ہو کر اس کی سمت چلنے لگی۔

”عشو! کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“ اس کے لہجے میں بے زاری تھی اور میرے چہرے پر گہرے غلے تھے۔

”دراب تم نے کیا فیصلہ کیا ہے پہلے تم بتاؤ۔“

”عشرہ، ڈارلنگ اگر تم میرے فیصلے پر عمل کروں تو ہم دونوں فائدہ میں رہ سکتے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ چند لمحوں کے بعد مجھے دیکھتا رہا اس کے بعد گویا ہوا۔

”تمہیں میرا فیصلہ قبول کرنا ہوگا اور میں جو تمہیں کہوں گا تم وہی کروں گی۔“

”کیا کروں گی، دراب میں کچھ بھی نہیں۔“

”عشرہ تم میری بات غور سے سننا تم وہاب سے شادی کر لو! اس کی بات میں دم تھا میں مسکرا کر رہ گئی مسکراؤں مت، میری پوری بات غور سے سنو شادی سے پہلے تم نے وہاب اگر وال کو اپنی کچھ شرائط پیش کرنی ہوگی۔“

”دراب کیسی شرائط؟“ میں بے چین ہو کر بولی۔

”بتا تا ہوں سب سے پہلے تم ہوگی کہ تمہیں تحفظ کے طور پر وہ بنگلہ تمہارے نام کر دے اگر کل کوڑائی وغیرہ ہوگی تو تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی دوسری شرط یہ رکھ دینا کہ تمہارے نام سے بینک میں ایک الگ اکاؤنٹ بنائے جس میں کم از کم ایک کروڑ روپیہ ہونا چاہئے۔“

”اور تیسری شرط۔“ میں بے چینی سے بولی دراب کچھ دیر خاموش کھڑا باہر بولا۔

”تیسری شرط یہی کہ تم اکیلے رہوگی اگر تمہارے کوئی رشتہ دار آئے بھی تو تم اسے اکیلے میں اچھی طرح ہینڈل کر لوں گی یعنی کہ میں تم سے آسانی سے مل لیا کروں گا اور یوں اس کی غیر موجودگی میں ہم تم مل سکیں گے۔“

”ٹھیک ہے دراب میں کل ہی وہاب سے بات کرتی ہوں اور اگر وہ نہ مانا تو؟“

”ارے تم پر حرمنا ہے وہ ہر شرط مانے گا اور تم اپنی سست کے ذریعہ بنوا سکتی ہو۔“

”اچھا دراب اب تم جاؤ کافی دیر ہو گئی ہے شادی کے بعد ملیں گے۔“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

☆.....☆.....☆

”خیلو وہاب میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی شکر ہے کہ تم مل ہی گئے۔“



”عشرہ تم تو ابھی یونیورسٹی آئی ہو میں پچھلے ایک گھنٹے سے یونیورسٹی کے گیٹ پر کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اور یہ دودن میں نے کس کرب میں گزارے ہیں یہ تو یا میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔“

”وہاب تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو تمہاری بے چینی سے ظاہر ہو رہا ہے مگر وہاب شادی سے پہلے میری کچھ شرائط ہیں۔“

”عشرہ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے کیا شرائط ہے پولو۔“

”میں نے تینوں شرائط اسے بتادی۔“

”ارے وہ مسکرایا۔“ بس یہ معمولی شرائط چلو آج تم جس چیز پر ہاتھ رکھو گی تمہاری۔“

”میں اس کی بے وقوفی پر کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔“

اگلے چار دنوں میں مجھے وہ سب کچھ مل چکا تھا جس کی میں اور وہاب تمنا کی تھی کتبہ خوب صورت سیل فون خوب صورت گلفس اور ڈائمنڈز کے کئی رنگز میں نے اس میں سے بیشتر کا حصہ وہاب کو دے دیا اس کے پاس ایک بھی سیل فون نہیں تھا میں نے اسے دودے دیے اب میرا اس کے ساتھ رابطہ آسانی سے ہو رہا تھا اور میں محل کراس کے اشاروں پر تاج رہی تھی وہاب دریادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ہماری شادی کی کورنچ ہر میگزین میں شائع ہو گئی تھی میں تو جیسے سونے میں نہائی ہوئی تھی اور وہاب بھی خوب صورت دکھائی دے رہا تھا وہ اگر رنگ کا کالا نہ ہوتا تو وہ غضب ناک حد تک قیامت خیز حسین کا مالک ہوتا میرے دل میں اس کے لئے کوئی محبت موجود نہ تھی۔

ہم چند دنوں کے بعد ڈینی مون پر پیرس چلے گئے وہاں ایک ہفتے تک رہے اور پھر واپس آ گئے ان دنوں میں نے وہاب کو بہت زیادہ مس کیا تھا وہ میری حواسوں پر بری طرح سوار تھا اور میں وہاب سے صحیح طور پر بات بھی نہیں کر رہی تھی وہ بے وقوف

میری بدلتی طبیعت کو حسن والوں کی ادا میں سمجھ رہا تھا اور میرے بلے سے خود کو باندھ رہا تھا اس کے خاندان میں دولت شہرت کی خردانی تو تھی مگر کبھی حسن کی بھی میں نہ تھا اس کی ماں باپ سارے خاندان کے افراد کا بے رنگ کے تھے۔

اس کی ماں نہیں اگر وال ایک ابن بی اور چلائی تھی باپ بزنس میں الجھا ہوا تھا سب سے برحرف آزادی تھی میں الگ بنگلے میں رہتی تھی اور وہاب بھی بزنس سنبھالنے لگا میرے گھر میں تین نوکر تھے ایک چوکیدار دوسرا وہاب کا ڈرائیور اور تیسرا مالی جبکہ ایک عدد ماسی بھی تھی جو سارے گھر کا کام کرتی تھی میرا رابطہ وہاب سے فون پر تھا مگر ایک مہینے تک اس سے فون نہیں تھی میں روز پارٹیوں میں وہاب کے ساتھ جاتی تھی اور وہاب ضرور سے لوگوں کو بتاتا تھا کہ شراز مائی دانف عشرہ اگر وال لوگ جو مجھے پہلی بار مل رہے ہوتے تھے دانتوں میں انگلیاں رکھ کر پیرا اور اس کا موازنہ کرتے۔

☆.....☆.....☆

”ہیلو کیسی ہو؟“ وہاب کی غماز آلود آواز میرے ساعتوں میں گونجی۔

”ٹھیک ہوں۔ حیرے میں ہوں۔ وہاب گھر آؤ میں بہت بور ہو رہی ہوں میں تو آ جاؤں گا مگر کہیں وہ تمہارا مجازی خدا ناراض نہ ہو جائے۔“

”بارودہ کارٹون گھر نہیں ہے اور اگر آئے بھی جائے تو میں تمہیں اپنا کزن بنادوں گی اور تمہیں وہاب بھائی بھائی کہوں گی ارے تم مسکرا کیوں رہے ہو۔“

”تم بھی ناہوی چالاک ہو گئی ہو۔ اچھا میں آ رہا ہو۔ مگر یا تم سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ۔“ اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

”بی بی جی باہر کوئی وہاب صاحب آئے

ہیں۔“ چوکیدار الاؤنج میں داخل ہو کر بولا۔

”ارے اسے اندر لے آؤ میں اسی کا تو انتظار کر رہی ہوں۔“

وہاب کچھ دیر کے بعد میرے سامنے تھا میں کسی ملکہ کی طرح صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس وقت خود کو کوچ وچ کر تیار کیا تھا۔

”تم ایک گھنٹے میں پہنچے ہو۔“ میں نے شکوہ کیا۔

”یارے میرے پاس اپنی گاڑی کہاں ہے اور تمہارا گھر شہر کے دوسرے کونے پر واقع ہے دھکے کھا کھا کر آیا ہو۔“

”آ جاؤ کمرے میں چلتے ہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”تمہارا گھر تو محل ہے اور تم اس کی ملکہ ہو ایسا گھر کسی کو بھی میسر نہیں ہوگا۔“ وہ بالکل میرے سامنے بیٹھ گیا۔

”یار مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔“ وہاب نے کہا۔

”کتنے پیسوں کی؟“ میں ہنسی ہوئی بولی۔

”بس بائیک خرید سکوں کہ آسانی سے آ جا سکوں۔“

”ہوں واقعی میں میرا الگ اکاؤنٹ ہے آؤ میں تمہیں پیسے دے دوں۔“ میں مسکراتی ہوئی بولی۔

”وہاب تمہیں پتہ ہے میں نے ڈرائیونگ بھی سیکھ لی ہے میرے پاس نیو ماڈل کار بھی ہے۔“

”آؤ بیٹک پٹیں۔“ کچھ دیر کے بعد ہم بینک میں تھے اسے بڑی خطرہ رقم دی ہوئی میں کھانا کھلایا اور اسے گھر تک چھوڑ آئی وہ اس دن بہت خوش لگ رہا تھا۔

پھر اچانک وہاب نے ایک منصوبہ بنایا اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔

ان دنوں وہاب کچھ زمین خرید رہا تھا تاکہ

گھوڑوں کے لئے شاندار اصطبل بنایا جاسکے زمین کا سودا طے ہو گیا تھا اور وہاب نے پورے 5 کروڑ روپے بینک سے نکالے اور گھر کے سیف میں رکھ دیے میں نے وہاب کو ان 5 کروڑ روپوں کی روداد پہلے سے سنائی تھی اور وہاب کو یہ سب پہلے سے معلوم تھا منصوبہ اتنا تھا۔

جس دن وہاب پیسے لے کر گھر آئے گا میں وہاب کو بتا دوں گی اور پھر یہی طے ہوا تھا ہمارے درمیان کہ اسی رات وہاب چور بن کر گھر میں داخل ہوگا 5 کروڑ روپے بھی لے لے گا اور وہاب کو موت کے کھٹات بھی اتار دے گا پھر صبح میں چیخوں کی چلاؤں گی روؤں گی گڑگڑاؤں گی اور بے ہوشی کا ڈرامہ کروں گی سب مجھ سے ہمدردی کریں گے اور ترجم خیز لگا ہوں سے مجھے دیکھیں گے اور پھر ہمارا منصوبہ کامیاب ہو گیا۔

اسی دن میں نے چوکیدار کو کچھ پیسے دیے تھے مالی اور ماسی کے کھانے میں نشہ آور دوا ملا دی رات کو گیٹ کھلا چھوڑا وہاب کو ڈھیر سارا پیار کیا کیونکہ میرا دل بار بار اس کی اچانک موت پر خوش ہو رہا تھا۔

پھر اچانک ہمارے کمرے میں وہاب چور کا بہروپ بن کر آیا۔ اس نے وہاب کو جگایا اور اس پر تشدد کرنے لگا میرا دل بڑا پرسکون تھا۔ اس کے منہ میں اس نے بڑا گند کی صاف کرنے والا کپڑا اٹھوٹس دیا تھا میں ایک کونے میں پرسکون کھڑی تھی اور پھر وہاب کو اس نے رسیوں سے باندھ دیا وہ درد کی شدت سے بللا رہا تھا میں نے جلدی سے سیف کھولا اور اپنے تمام لاپرواہی نقدی وہاب کے حوالے کر دی وہاب میں بھی بھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا وہاب نے جانے لگا تب کچھ لے کر وہ راہ داری میں ہی تھا کہ میں دوڑ کر اس کے پیچھے آ گئی وہاب تم کچھ بھول رہے ہو میں نے سپاٹ لچے میں وہاب سے کہا۔

”عشرہ کیا بھول رہا ہو؟“ اس نے آنکھیں



پھیلا کر کہا۔

”تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم اسے مار دو گے۔“ میرا لہجہ پہلے سے بھی سیٹ تھا۔

”سوری ڈارلنگ میں قتل نہیں کر سکتا میں نے

اس پر تشدد کیا جب مارنے کا ارادہ کیا تو میرے

ہاتھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔“ جب میں نے دراب

کے ہاتھوں سے پستول لے لیا اور کمرے میں آگئی

وہاب کی کھوپڑی میں چھ کے چھ فائر داغ دیے

دراب نے جب یہ دیکھا تو وہاں سے بھاگ گیا

میں نے پستول پر انگلیوں کے نشان صاف کئے۔

وہاب مرچکا تھا خون فرش کو رنگ کر رہا تھا

اور میں رونے کے بجائے مسکرا رہی تھی۔

صبح سب چوروں کو برا بھلا کہہ رہے تھے میں

نے یہ بات کہہ دی کہ وہاب نے چوروں کے ساتھ

مزاحمت کی جس کے نتیجے میں چوروں نے اس

کو مار دیا بار بار چیخ پڑتی میرے نزدیک یہ معمولی رقم

تھی جو چور گھر سے لے گئے تھے اسے کچھ سمجھ میں نہ

آ رہا تھا مگر میں نے اپنی اداکاری سے اس کی غلط فہمی

دور کر دی کہ اس نے معمولی مزاحمت کی تو ایک چور

نے اشتعال میں آ کر اس کو گولیاں مار دیں پولیس

نے میرا بیان ریکارڈ کر دئے گھر کے نوکر واقعہ سے

بے خبر تھے سواگلے تین دن تک سوگ رہا۔ میں نے

تین دنوں میں یہ وقت کس کرب میں گزارا تھا۔

میں نے دراب کے لئے شہر سے تھوڑی دوری

پر ایک کوارٹر خریدا تھا جس میں زندگی کی ہر آسائش

موجود تھی تیسرے دن جب شام ہوئی تو مجھ سے صبر نہ

ہو سکا اور گاڑی نکالی میں دراب کو کال کرنا چاہتی

تھی کہ اس کا موبائل بند چل رہا تھا میرا رخ کوارٹر کی

طرف تھا شہری حدود سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئی

اور اس کے بعد میں کوارٹر میں پہنچ گئی کوارٹر دو کمروں

پر مشتمل تھا میں نے گاڑی لاگ کی اور مین گیٹ کھلا

ہوا دیکھ کر اندر داخل ہو گئی شام کا وقت تھا آسمان پر

چند ستارے نمودار ہوئے تھے میں دراب کو سر پرانز

دینا چاہتی تھی میرے دل میں کتنی انگلیں تھیں آنکھوں

میں بے تھوڑے دل بے تاب تھا اور میں اضطراب میں

جتلا رہی تھی میں نے قدموں کمرے تک پہنچ گئی میں جوں

ہی کمرے کا ہینڈ گھمانا چاہتی تھی کہ ایک قہقہہ نے

میرے قدم ساکت و جامد کر دیے۔

کوئی لڑکی تھی جو دراب کے ساتھ اونچے لہجے

میں بات کر رہی تھی۔

”دراب چھوڑ دو وہ اپنی عدت کے دن گن

رہی ہوگی اور تم نے واقعی ملال کر دکھایا تم

تو ہوز بردست کہ تمہارے ہاتھوں وہ بے وفائی

چلی گئی باہا۔“ اس لڑکی کے رکتے ہی دراب کا

قہقہہ بلند ہو گیا۔

”ماہو میری جان شادی سے پہلے میں اس سے

پیار کر رہا تھا مگر جب وہاب سے اس کی شادی ہو گئی

تو تمہاری ساری باتیں درست ثابت ہوئیں وہ کھلے

ہاتھوں سے وہاب کی دوست مجھ پر لٹانے لگی اور وہ

میرے لئے ٹرمپ کارڈ بن گئی میں جو جو کہتا گیا وہ

بول کی جن کی طرح وہ سب کرتی تھی البتہ میرا ارادہ

اس کے شوہر کو مارنے کا نہ تھا۔ مگر اس ناگن نے خود

اسے ڈس لیمیرا ارادہ تو تھا کہ مزید دلائل اس سے

نکل سکتے ہیں۔“ اس کے بعد دونوں میں خاموشی

چھا گئی۔

دراب، تم اس کا کیا کرو گے؟“ ماہو کی آواز

میں تشویش تھی۔

”میں اس کو مار دوں گا جو اپنے شوہر کی نہ بن

سکی وہ میری کیا خاک بن سکے گی۔“ دراب کے

لہجے میں گہرا طنز تھا۔

”اب یہ سب مشورے میں نے تمہیں دیے

تھے اسی لئے تم سرخرو ہوئے۔“

”ہاں مانتا ہوں تم بہت تیز ہو۔“ دراب باہر

چلتے ہیں کسی ایسے سے ہوٹل میں ڈنر کرتے ہیں

اور وقت بھی اچھا گزار لے گا۔“

”ٹھیک ماہو۔ میں فریش ہو کے نکلتا

ہوں۔“ اس نے ہاتھ روم جاتے وقت ماہو کے کان

میں کچھ کہا ہوگا کہ ماہو کے قہقہے چھوٹ گئے۔

میں نے تو کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ دراب اتنا

بڑا گیم میرے ساتھ کھیل رہا ہے میں وہاں سے واپس

جانے ہی والی تھی کہ بے ساختہ میرے ہاتھ نے

دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ بغیر آواز کے کھل گیا

ایک دم ٹی وی کی والیم فل ہو گیا میں نے ہیل والی

جوتی اتاری اور دبے پاؤں کمرے میں گھس گئی

سانے ٹی وی تھا اور صوفے پر ماہو بیٹھی ہوئی تھی مگر

اس کی پشت میری جانب تھی میں نے اپنا دوپٹہ تیزی

سے اس کے گلے میں ڈال دیا مجھ پر خون سوار

ہو چکا تھا اس سے پہلے کہ وہ چیخ پڑتی میں نے دوپٹہ

مضبوط کر کے اس کو بے بس کر دیا چیخ اس کے گلے

میں گھٹ کر رہ گئی اور تب تک اس کے گلے

پر دباؤ ڈالتی رہی جب تک اس کے جسم سے روح جدا

نہ ہو گئی جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی تو میں ہاتھ

روم کی جانب چلی گئی اس کو باہر سے لاگ کر دیا اس

کے بعد آرام سے سارے گھر کی تلاشی لینے لگی حیرت

انگیز طور پر میرا داغ کام کر رہا تھا کمرے میں مجھے

کچھ خاص چیز دستی تو ہیں نے دوسرے کمرے کا رخ

کر دیا اس میں سیف موجود تھا ایک عدد چابیوں کا کچھا

میرے پاس بھی تھا میں نے سیف کھول دیا تو اس

میں مجھے پیسے میرے زیورات سب کچھ لگے میں

نے وہ سب سوٹ کیس میں ڈالا دیئے اور اس کے

بعد میں جوں ہی کمرے سے نکلی دراب کی آواز

میرے سامعوں میں گونجی۔

”ماہو میری جان دروازہ کھولو یہ کیا مذاق ہے

جلدی کرو ہری اپ۔“ ہاتھ روم میں روشن دان

موجود تھا مگر اس میں زیر و ساز کا

انگیز و پھسکا ہوا تھا سوسائٹ سے مشکل سے ہی وہ نکل

سکتا تھا میں نے دونوں کمرے بھی لاگ کئے گھر یعنی

کوارٹر کا باہر والا دروازہ بھی لاگ کر کے وہاں سے

نکل کر سیدھی گھر آگئی اور سامان کو دیکھ کر

کر تہا رہے پاس آگئی۔“

میرا ب نے سرخ خمار آلود نظروں سے اسے

گھورا۔

”تم نے اتنا سب کچھ اکیلے کیا

امپاسیبل؟ عشق تم نے تو دراب کو بھی بے بس کر دیا

ایک دن سے وہ اسی کوارٹر میں ہاتھ روم میں قید

ہے۔“ عشرہ نے میرا ب کی بات سچ میں کاٹ کر کہا۔

”میرا ب میرا انتقام ادھورا ہے میرا دل تو چاہ

رہا تھا کہ دراب کو زندہ جلادوں اس کوارٹر میں آگ

لگوادوں مگر میں یہ نہ کر سکی اور تم سے مشورہ لینے آگئی

ہوں کہ میں کیا کروں۔“ میرا ب کچھ دیر خاموش

کھڑی رہی پھر بولی۔

”کیا تم ماہو کو جانتی ہو کہ وہ کون تھی؟ جو دراب

کو اپنے اشاروں پر نچوڑ رہی تھی۔“

”ہاں، وہ میری سہیلی تھی خوب صورت، حسین

و جمیل میری طرح غریبی کی ترسی ہوئی اس کا نام ماہ

پارہ تھا اور پیار سے اسے ہم ماہو کہتے تھے دراب سے

اسے میں نے ہی ملوایا تھا مگر یہ تو میں نے بھی خواب

میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کہ مجھ سے دراب کو بدظن

کر دے گی اسے تو میں نے سزا دے دی

مگر دراب؟“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”کول ڈاؤن عشرہ وہ وہاں پر قید ہو کر رہ گیا

ہے بھوک سے اس کا برا حال ہوگا ہاتھ روم میں وہ

قید بنا ہوگا۔“ میرا ب مسکرائی۔

”ہاں یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر میرا ب تم ایک

ناٹک کلب چلاتی ہو جس میں لڑکیاں ڈانس کرتی ہیں

اور انٹرٹینر دن ملک تک چلی جاتی ہیں کئی نوجوان

لڑکے اور لڑکیاں وہاں پر ڈانس اور موج مستیاں

کرتی ہیں میں نے اتنے خواب دیکھے تھے کہ وہاب

کے جانے کے بعد میں اور دراب اسی کلب میں آیا

کریں گے، میرا ب میں نے تو زندگی کو حسین

ترتیب سے کی خواہش ظاہر کی تھی میں نے دو خون کئے

ایک وہاب کا اور دوسرا اس ناگن کا عشرہ کے آنسو



رخساروں پر سے بہتے ہوئے فچے مگر نے لگے۔  
میراب نے آگے بڑھ کر اس کے آسپوچھ ڈالے۔

”میری طرح خود کو سخت بناؤ اس طرح مت ڈروں بلکہ دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچوڑ تم حسین ہو خوب صورت ہو دولت مند ہو اور میں نے بھی اس کے بارے میں سوچ لیا ہے۔“

”کس کے بارے میں؟“ عشرہ حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”درباب کے بارے میں۔“ میراب نچلے ہونٹوں کو کاٹ کر بولی۔

”کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟“ عشرہ حیران ہو گئی۔

”عشرہ، تم اٹھو میرے ساتھ چلو ہمیں کوارٹر تک جانا ہے۔“

”مگر کیوں؟“ عشرہ منمنائی۔

”اس لئے کہ درباب کو سزا دینے کا وقت آ پہنچا ہے۔“

”چلو۔“ میراب نے عشرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

اور پھر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھی ہوئی کوارٹر کی جانب چل دیں۔

”لو پہنچ گئے۔“ کوارٹر کے سامنے گاڑی کے ٹائر چرچائے۔

”اندر چلیں۔“ میراب نے کہا۔

”میراب، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کہیں وہ زخمی، شیر نہ بن گیا ہو۔“

”دیکھو کچھ بھی نہیں ہوگا۔“

”میرے پاس پستول ہے اور دیکھو کوئی بھی یہاں نہیں ہے یہ جگہ ہائی وے سے دور بھی واقع ہے اور یہاں کوئی قریبی نزدیکی گھر کوارٹر وغیرہ بھی نہیں ہے جس نے درباب کی مدد کی ہو وہ چپنا ہوگا چلا یا ہوگا مگر کسی نے بھی اس کی مدد تو کیا آواز بھی نہیں سنی ہوگی عشرہ نے لاک کھول دیا۔ اور کوارٹر کے اندر وہ

دونوں چلی گئیں۔

پھر گلے کر کے لاک بھی اسی طرح بند تھا وہ بھی کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

”ارے باپ رے یہ لاش تو اسی طرح پڑی ہے اور لاش پر چہرہ نشان رک رہی تھیں، ماہو کا سارا چہرہ چھوٹیوں سے بھرا تھا ایک دن میں اس کا اتنا برا حال ہو گیا ہے میراب نے لاش کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں کی نظریں ہاتھ روم کے دروازے پر پڑ گئیں اسے کوئی شوکرے مارا تھا۔ ذم کی آواز پر دونوں ہاتھ رو کی طرف متوجہ ہو گئی یہ تو واقعی طرح بند ہے میراب نے سرگوشی کی۔

”ہاں دیکھو اگر ہاتھ روم کا دروازہ نازک ہوتا تو کب کا ٹوٹ چکا ہوتا مگر شاید وہ ہاتھ روم میں اکیلا ہے اس کے پاس کوئی اور اور غیرہ نہیں ہے بھی تو ہاتھ روم کا دروازہ صحیح حالت میں ہے۔“ عشرہ بھی سرگوشیوں میں کہنے لگی تب ایک ایک روشن دان میں سے دوسرے آنکھیں انہیں دیکھائی دیں وہ درباب تھا اس نے دونوں کو دیکھ لیا۔

”عشرہ شکر ہے کہ تم آ گئی ہاتھ روم کا دروازہ کھول دو۔“ درباب کھاتے ہوئے بولا۔

عشرہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور درباب لڑکھاتا ہوا ہا ہر کر گیا۔

”یہ کیا ہے درباب؟“ عشرہ پریشانی سے بولی۔

درباب نے ساری رات اور دن کے وقت دروازے پر زور آزمائی کی تھی جس کی وجہ سے وہ بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا اب بھی شام کا وقت تھا۔

”پتہ نہیں عشو ڈارلنگ کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔“ وہ ہلکے پر لٹ کر بولا۔

”اچھا تم آرام کرو یہ میری سہیلی میراب ہے اور یہ لڑکی کون ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ عشرہ اداکاری کر رہی تھی درباب

نے اپنے حواس قابو میں کر رکھے تھے مگر وہ بری طرح کچھ غلط ہونے کا احساس محسوس کر رہا تھا کیونکہ اسے احساس تھا کہ ماہ پارہ کو عشرہ اچھی طرح سے جانتی ہے اسے یہ کہنا چاہئے تھا کہ ماہ پارہ یہاں کیا کر رہی تھی جواب مردہ حالت میں ملی ہے اور تم ہاتھ روم میں قید کیسے ہوئے؟

درباب نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر جب اس نے محسوس کیا تو وہ بری طرح پھنس چکا تھا میراب اور عشرہ نے اس کے ہاتھ پیر باند دیئے تھے۔

”عشرہ تم یہ کیا کر رہی ہو؟“ درباب اچھلا مگر وہ اپنی جگہ سے کس سے کس نہ ہوا۔

”ڈارلنگ تم کیا سمجھتے ہو بے وقوف سمجھ رکھا ہے مجھے۔ میں نے وہاب کو مار دیا اور اب تمہاری باری ہے میرے نزدیک بے وفائی کی سزا موت ہے ماہ پارہ کو بھی میں نے مارا تھا۔“ وہ غضب ناک ہو کر چیخ اٹھی۔

”میں نے ہی تمہیں یہاں پر قید کر دیا تھا کیونکہ مجھے تمہاری اسلیت معلوم ہو گئی تھی اور اب میراب کے مشورے کے مطابق میں تمہیں سخت سے سخت سزا دوں گی۔“ میراب نے سکرٹ سلگائی اور دھواں درباب کے قوف زدہ چہرے پر چھوڑ دیا۔ اور اپنے بیک سے دو عدد باریک ٹیلیں نکال لیں، میراب نے وہ دونوں ٹیلیں درباب کے چہرے میں ٹھونک دی تو دی اس کی ایک بھیا تک جھنجھک گئی۔

آں آں آں..... اس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا میراب وہ ٹیلیں نکالتی اور جگہ جگہ اس کے خوب صورت چہرے میں سوراخ کرتی ہر بار درباب کا چہرہ بگڑ جاتا اور بھیا تک جھنجھک اس کے منہ سے نکلتی عشرہ نے بے رحمی سے درباب کی زبان باہر کھینچ دی اور تیز دھار ہلیڈ سے اس پر کٹ لگادی خون سے اس کی زبان بھر گئی زبان کا سر اعشرہ کے ہاتھ میں رہ گیا۔

”میراب اب کیا کریں“

”اب اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دو تاکہ یہ پھر ایسی کوئی حرکت نہ کر سکے اور اب یہ ساری عمر کسی فٹ پاتھ پر پڑا رہ کر بھیگ مانگے گا۔“

تین دن بعد وہ دونوں راستے سے گزر رہی تھیں درباب فٹ پاتھ پر پڑا کر رہا تھا اسی جگہ ان دونوں نے اسے پہچان لیا تھا۔ سو، سو کے دو عدد ٹوٹ دونوں نے اس کے بائیں ہاتھ پر رکھ دیئے وہ ان دونوں کو پھنسی پھنسی آنکھوں سے دیکھنے لگا اس کا دایاں ہاتھ بھی میراب نے مفلوج کر دیا تھا۔

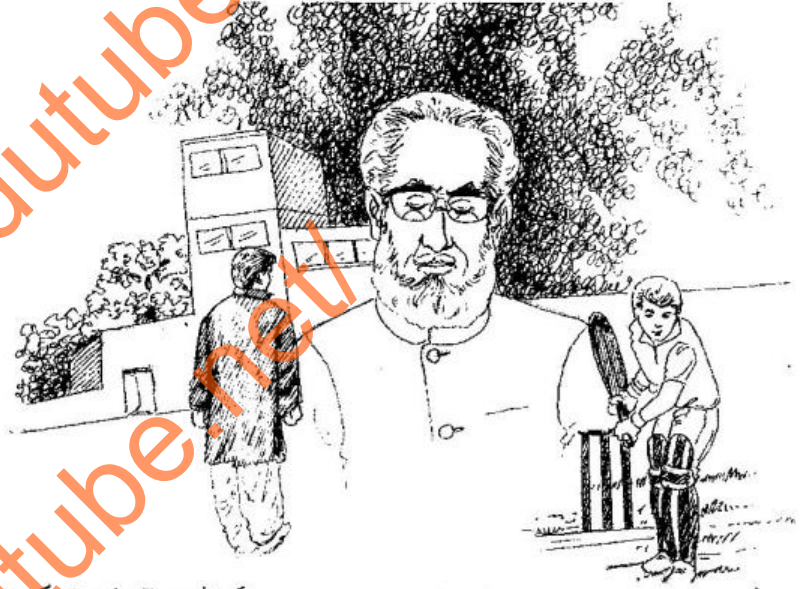
میراب ایک سفاک حسینہ تھی جو دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہوتی تھی اور اب ایک اور خونی قتل کا اضافہ اس کے گروپ میں ہو گیا تھا میراب خود کو خونی قتل کہا کرتی تھی زندگی نے عشرہ کی طرح اس کے ساتھ بھی کافی برا سلوک کیا تھا وہ مردوں سے سخت نفرت کرتی تھی اور اب میراب کے ساتھ ساتھ عشرہ بھی اس نائنٹ کلب کا ناٹھی بن گئی عشرہ کی زندگی میں کئی مرد آئے اور چلے گئے مگر وہ کسی سے بھی وفانہ کر سکی وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔

عشرہ دس سال پیچھے دیکھتی ہے تو اسے ندامت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا وہ رفتہ رفتہ اپنا ذہنی توازن کھو رہی ہے مگر اسے اپنے کئے پر کوئی ندامت نہیں۔ میراب کو کسی نے بہت ہی بے دردی سے قتل کیا تھا دس دن تک تو اپنے قلیٹ میں پڑی رہی جب اس کی لاش کی بدبو باہر پھیلی تو لوگوں نے پولیس کو اطلاع کر دی اس کی لاش پھول کر غبارہ بن چکی تھی کئی دن اس میں بیٹھ رہے تھے۔

عشرہ نے ہی میراب کو مارا تھا کیونکہ اسے ذہنی سکون نہیں بھی نہیں ملا تھا بلکہ وہ نیم پاگل ہو چکی تھی۔ آج بھی عشرہ کے پاس بے شمار دولت تھی مگر کوئی بھی اسے اپنانے کو تیار نہیں تھا وہ کل کی طرح آج بھی اکیلی ہے اور کبھی بھی چٹنی چلاتی رہتی ہے اس نے جو بویا تھا آج وہی کاٹ رہی ہے۔

☆





اور تب اس نے خود سمجھ لیا کہ جب دو حساب دان سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وقت کا بے اندازہ استعمال اور اس کے اپنے لئے طویل اور بولجھات۔

میں ہمیشہ اپنی آزمودہ شرطیں ہی سامنے ڈالتا ہے۔  
”ٹھیک ہے۔“ شیطان نے آخر کی قدر رکھت  
خوردہ انداز میں کہا۔  
”اس میں کوئی حرج نہیں چلو تم ہی اپنی تہادیز  
پیش کرو۔“  
”میں تمہارے سامنے ایک سوال رکھوں  
گا۔“ سائن نے کہنا شروع کیا۔ شیطان کے چہرے  
پر یکایک بے ہوشی آئی۔  
”اور میرے سوال کا جواب بہر حال چوٹیں کھٹنے  
کے اندر دینا ہوگا اگر تمہارا جواب غلط نکلا تو تم جواب نہ  
دے سکتے تو تمہیں مجھے ایک لاکھ ڈالر فوراً ادا کرنے ہوں

**مہینوں** کی سخت محنت اور بہت سی نایاب  
اور بوسیدہ کتابوں کے مطالعے کے بعد آخر کار حساب  
والا پروفیسر سائن فلیک شیطان کو بلانے میں کامیاب  
ہو ہی گیا۔ اس سلسلے میں اسے اپنی بیوی سے بہت مدد ملی  
تھی، وہ قدیم زبانوں کی طالب علم تھی اور چونکہ سائن  
محض ایک حساب دان تھا ایرانی کتابوں کی رقیق  
اصطلاحیں اس کی سمجھ میں شاید بالکل ہی نہ آتیں اگر اس  
کی بیوی زبانوں کی ماہر نہ ہوتی ابتدائی گفتگو کے  
بعد سائن اور شیطان کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوا  
ابتداء میں ہی سائن نے شیطان کی کئی پیشکشوں  
کو مسترد کر دیا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ شیطان ابتدا

گے دیکھو میری پیشکش مناسب ترین ہے کیونکہ اس سے  
قبل لوگ تم سے عجیب و غریب چیزیں مانگتے رہیں ہیں  
اور میں سمجھتا ہوں کہ رقم کا مطالبہ تمہارے لئے آسان  
ترین کہا جاسکتا ہے۔“  
”درست۔“ شیطان نے کہا اور اگر میں کامیاب  
ہوا تو تم کیا چیز لگاتے ہو داد پر۔“  
”میں ہار گیا تو تمہارا غلام بن کر رہوں گا جتنے  
عرصے تک تم چاہو۔۔۔۔۔۔ لیکن سنو میں نہ تو روح اپنی تمہیں  
دول گا اور نہ کسی قسم کی اذیت برداشت کروں گا میں  
اپنے عزیزوں اور دوستوں کو بھی کوئی نقصان نہیں  
پہنچاؤں گا صرف ایک لاکھ ڈالر کے لئے یہ سب باتیں  
بہت ہیں۔“

رک کر اس نے کہا۔ ”ہاں بعض حالات میں  
رعایت ضرور دے سکتا ہوں۔“ شیطان کے چہرے پر  
جھنجھلاہٹ ابھر آئی اس نے غصے سے اپنی دم زور سے  
مرڈی پھر بولا۔

”مجھے افسوس ہے میرے پاس غلاموں کی کمی  
نہیں ہے پھر ویسے بھی تمہارے جیسے بہت سے انسان  
صفت ہی جویری اتنی خدمت کرتے رہتے ہیں کہ سن  
کر تم حیران رہ سکتے ہو پھر بھی میں اس حد تک مان  
سکتا ہوں کہ اگر میں تمہارے سوال کا جواب نہ دے سکا  
تو تمہیں ایک لاکھ ڈالر تو نہیں ایک نظر رقم ضرور پیش کر  
سکتا ہوں۔ ساتھ ساتھ میں تمہیں تاحیات اچھی صحت  
اور خوشیاں بھی فراہم کروں گا لیکن اگر میں جیتا تو تمہیں  
نتائج کا بھی خوب علم ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رک گیا اور اس  
نے ایک جلتا ہوا سگار منہ سے برآمد کیا اور پینے لگا  
سائن کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں اس نے خلاؤں  
میں نظریں مرکوز کر دیں اس نے سوچا اچھی بات ہے  
میں اس سے وہ سوال کروں گا جس کا جواب وہ بہر حال  
چوٹیں کھٹنے میں دینا نا ممکن ہوگا بھلا اس کے لئے مجھے  
اپنی روح کا سودا بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

”ٹھیک ہے لیکن تم صحت اور خوشیوں میں میری  
بیوی کو بھی شریک کرو، پھر یہ معاہدہ پایا ہو سکتا ہے۔“

”بہتر ہے۔“ شیطان نے کہا اس نے اپنے لمبے  
ناخنوں کے درمیان سگار کو کٹی بارگھمایا اور بولا۔  
”یہ سن لو کہ تمہارے سوال کا بہر حال جواب  
ہونا چاہئے ورنہ یہ معاہدہ منسوخ ہوگا قدیم زمانے  
میں اکثر لوگ مجھ سے پہیلیاں بھجوا کرتے تھے۔  
مثلاً ایک بار مجھ سے پوچھا گیا تھا ایک گاؤں میں  
ایک جام رہتا ہے جو ان تمام لوگوں کی شیو بناتا ہے جو خود  
اپنا شیو نہیں بناتے بتاؤ جام کا شیو کون بناتا ہے۔ دیکھو  
ناں اب اس قسم کے سوالوں کا جواب بھی نہیں ہوتا لہذا  
تمہارے سوال باقتی ہونا چاہئے ہل نہیں۔“  
”میرا سوال مکمل نہیں باقتی ہے اور اس کا جواب  
موجود ہے۔“ سائن نے کہا۔

”پھر ٹھیک ہے۔“ شیطان نے ہوا سے ایک کاغذ  
نمائش برآمد کی اور سائن کے سامنے رکھ دیا سائن نے  
لے کر اسے پڑھا سب ٹھیک تھا اس نے جب سے قلم  
نکالا اور دستخط کر دیے پھر اس کے نیچے شیطان نے بھی  
اپنے دستخط کر دیے اور بولا۔

”ہاں تو کرو اپنا سوال اور زرا جلدی کرو مجھے کسی  
اور سے بھی ملنے جانا ہے۔“

”میرا سوال فورے سنو۔“ سائن نے کہا۔  
”سوال یہ ہے کہ جیومتری کے ماہر فریٹ کی  
آخری تصیوم درست ہے یا نہیں؟“ شیطان کے چہرے  
پر ہوائیاں اڑ گئیں پہلی بار اس کا اعتماد ٹوٹل ہو گیا۔  
”کیا کہا۔ آخر میں تم میں نے کیا کہا تھا؟“ اس  
نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے فارمیٹ کی آخری تصیوم کے بارے  
میں پوچھا ہے۔“ فارمیٹ سترہویں صدی کا ایک مشہور  
فرانسیسی ماہر حساب تھا میں نے اس کے آخری حسابی  
پے کے بارے میں پوچھا ہے جس کے بارے میں اس  
نے ثبوت فراہم کرتے ہوئے اسے درست قرار دیا  
مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے ثبوت کبھی نہ لکھے جاسکے  
اور تب سے آج تک کسی کو بھی نہیں معلوم کہ آیا اس کی  
آخری تصیوم شکل بندی واقعی صحیح ہے یا نہیں۔“ رک



کر سائن نے پھر کہا۔

”اب تم شروع ہو جاؤ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔“

”علم ریاضی۔“ شیطان گھبراتے ہوئے لہجے میں بڑبڑایا۔

”کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے پاس اس قدر وقت ہے کہ میں اسے حساب پڑھنے میں ضائع کرتا ویسے میں نے مساوات گونی اور مساوات مربع پڑھا ہے لیکن جہاں تک الجبرے کا معاملہ ہے لعنت ہو اس پر۔“ وہ زور سے بڑبڑایا۔

سائن نے اپنے چہرے پر رکھائی برقرار رکھی البتہ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

”تم اس کے علاوہ کوئی دوسرا سوال نہیں کر سکتے۔“ شیطان نے پوچھا۔

”نہیں۔“ سائن نے سکون سے کہا۔

”مجھے معلوم ہے کہ زمان و مکان کی قید تمہارے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔“

”تم سینکڑوں میں لاکھوں میں دوڑ سکتے ہو لیکن میرا سوال یہی ہے بہتر ہے کہ تم اسی پر ہی وقت صرف کرو یہ سوال سادہ سا ہے صرف ایک مثبت عدد صحیح کا سوال۔“

”یہ مثبت صحیح عدد کیا بنا ہے؟“ شیطان نے تقریباً ہلہلا کر پوچھا۔

”میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ فارمیٹ تعمیر میں کہا گیا ہے کہ یہ کوئی چیز فاضل نہیں ہے سارہ مساوات یعنی (یعنی ایکویشن)  $X + Y$  برابر ہے  $Z$  کے کیونکہ  $Z$  ایک مثبت عدد ہے اور یہ دو سے بڑا ہے۔“

”کیا، کیا۔“ شیطان نے ناک سیکڑتے ہوئے کہا اور اسے گھورا۔

”اس کا جواب تو تمہیں دینا ہے۔“

”اور۔۔۔ اور جواب کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟“ شیطان نے ایک پتہ پھینکا۔

”کیا اس کا فیصلہ تم کرو گے؟“

”نہیں میں اتنا اہل نہیں۔“ سائن نے کہا۔

”جب تم جواب دے دو گے تو ہم اسے کسی حسابی رسالے میں شائع کرائیں گے اور وہاں ان کے لائق ترین ماہرین اس کا فیصلہ کریں گے کہ کیا یہ صحیح ہے دیکھو تم پھاگ نہیں سکتے یہ پرائمرس کی جاسکتی ہے یا تو یہ تصور صحیح ہے یا غلط۔ اس میں کوئی شکات کا دخل نہیں بس تمہیں صرف یہ طے کرنا ہے کہ کیا صحیح ہے اور وہ بھی چوبیس گھنٹے کے اندر کیونکہ تم الزام تمہارے جیسے انسان۔۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔ یعنی اس لائق تو ضرور ہیں کہ وہ اتنے عرصے میں اس قدر حساب سمجھ سکے۔“

”تم کو نہیں معلوم۔“ اچانک شیطان کا لہجہ خاصا ٹھنک کر رہ گیا۔

”میں جب کیمبرج میں پڑھ رہا تھا تو پوکلیڈ کو پڑھنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔۔۔۔۔۔ میرے شاہد متعلقہ غلط تھے ویسے وہ بظاہر صحیح ہوتے تھے تم چاہو اشتعال تیار کر کے خود دیکھ سکتے ہو۔“ رک رک کر اس نے اپنے دانت کلک کلکائے اور بولا۔

”لیکن میں یہ کام کر سکتا ہوں میں نے پہلے ہی اس سے مشکل کام کئے ہیں مثلاً ایک بار صرف مجھے سکند میں ایک سیارے سے دوسرے سیارے میں ہارک نیوٹرانیم کا ایک۔۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں مجھے پتہ ہے۔“ بے صبری سے بات کاٹتے ہوئے سائن نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ ہنسا کر شیطان نے کہا۔ تم پر وہ نہ کرو، میں کسی اچھی لائبریری میں جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں اگلے دن وقت کے اندر اسی جگہ موجود ہوں گا۔ شیطان نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آنکھوں کے لئے پرتو لگا۔

”کیا خیال ہے کیا تم کچھ چنا پسند نہیں کرو گے۔ میں تمہیں اپنی بیوی سے بھی ملواؤں گا۔“ سائن کی بیوی داخل ہوئی۔

”خوب تو تم ہر سے سن رہی تھیں۔“

”ہاں۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”یہ بتاؤ تمہارا سوال واقعی مشکل ہے مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم ہار نہ جاؤ میں اپنے اندر سے لرز رہی ہوں۔“ تم مطمئن رہو میرا سوال واقعی مشکل ہے بظاہر یہ آسان ضرور لگتا ہے۔“ وہ اچانک حسابی اصطلاحوں میں گم ہو گیا۔

”کوئی بھی شخص دو ایسے مکمل اعداد دریافت کر سکتا ہے جن کا جز ایک ہو مثلاً  $3 + 4$  برابر ہے  $5$  کے دوسرے لفظوں میں  $16 + 9$  برابر ہے۔  $25$  کے کچھ سمجھیں۔“

”ہاں ہاں۔“ اس کی بیوی نے آگے بڑھ کر پیار سے شوہر کی ٹانگی درست کی لیکن تم اگر دو ایسی کمبیوں کو ڈھونڈنا چاہو جس کا مجموعہ ایک کاب ہو تو تمہارے لئے بہت مشکل پیش آئے گی تمہیں ملے گا ہی نہیں۔“ رک کر اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

”آج تک کوئی بھی یہ ثابت نہیں کر سکا۔ کہ ایسا کوئی عدد موجود بھی ہے یا نہیں سمجھیں۔“

”بالکل۔“ اس کی بیوی نے حساب کے مارے مسئلے اسی طرح فوراً سمجھنے کی عادی ہوئی کیونکہ دوسری صورت میں اسے شوہر کی لمبی چوڑی اور عجیب و غریب تشریحات ضرور سننی پڑتی تھیں۔

”میں تمہارے لئے کافی لاتی ہوں۔“ اس نے جلدی سے رخصت ہونے کی تزیین سوچی اور ملے۔

”لی۔“

چار گھنٹے بعد جس وقت وہ دونوں میاں بیوی بیٹھے ریٹ پوسن رہے تھے اچانک شیطان واپس آ گیا آتے ہی اس نے کہا۔

”میں نے اس عرصے میں الجبرے کی ابتدائی معلومات حاصل کر لی ہیں میں نے ٹرگنومیٹری اور ٹریگنومیٹری میں بھی کی ہے۔“ اس کا لہجہ فاقنا تھا۔

”خوب۔“ سائن نے داد دی۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے جلدی کر دی۔“

تکلی اور تو صحتی جیومیٹری دیکھ لو گے۔

”کیا۔“ شیطان نے ہنسی بھرا ہوا جواب دیا۔

خونناک کہانیاں | 241 | مئی 2018ء

دیکھا۔

”کیا ابھی اور بھی چیزیں ابھی باقی ہیں۔“

”ہاں۔“ مگر بہت تھوڑی سی۔“ سائن نے قدر مزاح سے کہا۔

”میرا خیال ہے تمہیں نان پوکلیڈین جیومیٹری میں کافی لطف آئے گا وہاں تمہیں بہر حال اشکال پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مگر تمہیں تو کا۔“

”دھت تیرے کی۔“ شیطان نے جھلا کر کہا اور غائب ہو گیا۔

”بے چارے کو تارے نظر آرہے ہیں۔“ پنہا۔

کر سائن نے بیوی سے کہا۔

”ہاں واقعی اور تم نے اسے خوب پھنسا یا ہے۔“

”بیوی نے تبصرہ کیا۔“

”چھ گھنٹے بعد اچانک شیطان بھراس کے سامنے حاضر ہو گیا۔ سائن نے نوٹ کیا کہ اس کا چہرہ سا ہوا ہے اور آنکھوں کے گرد جلتے بن رہے ہیں۔

”میں نے تمام کی تمام جیومیٹری سیکھ لی ہے۔“

”کڑے لہجے میں اس نے کہا۔“

”اب میں کافی حد تک تمہارے سوال پر توجہ دینے کے قابل ہو گیا ہوں۔“

”گتا ہے تم کافی محنت کر رہے ہو۔“ سائن نے اس کا دل بڑھایا۔

”لیکن ایسا تو نہیں کہ جلدی میں تم نے بنیادی مفہم پر توجہ ہی نہ دی ہو۔ مثلاً گیلیلیو کس مساوات تقریبی اور تقریبی یعنی وغیرہ اس کے علاوہ۔“

”غیر۔“ شیطان نے بے صبری سے کہا۔

”کیا اس کی بھی ضرورت ہوگی۔“ اس کی آواز نے الجھن لگائی تھی۔

”میں پوچھ نہیں سکتا۔“ سائن نے کہا۔

”یہ بات ضرور ہے کہ اب تک دنیا نے بہت سی باتوں نے اس پر الجھن ہو کر ہی حسابی مفہم حاصل کیا ہے لیکن یہ قیود ہر ذہن میں ہونی چاہئے نہ ہی انہی انہی



تم بھی۔“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شیطان کر سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر شیطان نے لمبی سانس لی غائب ہو چکا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ خاصا تھک چکا ہے۔“ بیوی نے سائمن سے کہا۔

”بے چارہ۔“ اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔  
”میں بھی اب تھک گیا ہوں۔ چلو اب سوتے ہیں۔“ سائمن نے کہا۔

”شیطان کو تو آج کم از کم غنیمت نصیب نہیں ہوگی۔“

آئندہ سہ پہر کو گھڑی دیکھتے ہوئے سائمن نے کہا۔

”اگر اگلے دس منٹ میں شیطان نمودار نہ ہوا تو سمجھو میں نے بازی جیت لی ویسے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ ایک دن میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ضرور لے سکتا ہے وہ بھی اعزاز سمیت لیکن۔“ اچانک کمرے میں سلفر کی بو پھیل گئی سائمن نے شیطان کو سامنے کھڑا دیکھا اس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کا ناخن دار ہاتھوں میں بہت سے کاغذات کا ایک گلدایا ہوا تھا وہ کھڑا ہونے میں بھی کیکپار ہاتھ بڑی خاموشی نے اس نے اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے کاغذات کو فرش پر پھینک دیا پھر ایک سکین مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے اس نے سائمن سے کہا۔

”تم جیت گئے۔“ سائمن نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھوں میں سائمن کے لئے خاصی عزت ہو۔  
”میری ہار کا یہ سبب نہیں ہے کہ میں اتنے کم عرصے میں اتنا بہت سا حساب نہیں سیکھ پایا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں میں اس کی تہہ میں اترتا چلا گیا یہ معاملہ اور الجھتا چلا گیا میں نے دوسرے سیاروں کے عظیم ترین ماہرین سے بھی رابطہ قائم کیا تھا لیکن وہ بھی کچھ نہ کر سکے حتیٰ کہ سیارے دھل کے عظیم ماہر حساب کو بھی حساب میں ناکامی ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زبانی طور پر مساوات تفریق کے سوال

”تم نے بھی اس پر مسلسل بھی استعمال کی تھی مجھے یقین ہے کہ فارمیٹ نے یہ طریقہ ضرور استعمال کیا ہوگا۔“ رک کر اس نے مسز سائمن سے کہا۔

”محترمہ ہمیں چند لمحوں کی تنہائی چاہیے۔“ پھر وہ سائمن کی کرسی پر جم گیا اس نے سنبھل کر اپنی دم ایک طرف رکھ دی اور کاغذات کے ڈیجر کو میز پر بکھیرنے لگا جس پر لاتعداد اشکال اور بے شمار ہندسے بنے ہوئے تھے مسز سائمن نے ایک لمبی سانس لی اس طرح اسے شیطان بھی جانی پہچانی شخصیت محسوس ہونے لگا ایسی شخصیت جو کسی بھی طرح اس کے شوہر حساب دانی سائمن سے مختلف نہ تھی۔

اور تب اس نے خود سمجھ لیا کہ جب دو حساب دان سر جوڑ کر پراکٹم بیٹھتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وقت کا بے اندازہ استعمال اور اس کے اپنے لئے طویل اور پورلحات، آخر قحطی نہ وہ ایک پروفیسر کی بیوی۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆